UNIVERSITY LIBRARY
MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH

سلسلۂ آصفیہ

موازنۂ انیس و دبیر

یعنی

میر انیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو اور میر انیس و مرزا دبیر کا موازنہ

مؤلفہ
مولانا شبلی نعمانی

ناشر
لالہ رام نرائن لعل صاحب بک سیلر
الہ آباد
بار اوّل　　۱۹۳۶ء　　قیمت عہ

فہرست مضامین

(ب)

M.A.LIBRARY, A.M.U.

U32776

CHECKED-2002
۲۷۷۶
ALIGARH
SEP 1963

شمع ہا بردہ ام از صدق بہ خاکِ شہدا — تا دل و دیدہ خوں نابہ فشانم دادند

فلسفہ اور شاعری برابر درجہ کی چیزیں ہیں، لیکن قوم کی بد مذاقی سے جس قسم کی شاعری نے ملک میں قبولِ عام حاصل کرلیا ہے، اُس نے لوگوں کو یقین دلا دیا ہے کہ اُردو شاعری میں زلف و خال و خط، یا جھوٹی خوشامد اور مدّاحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، میر تقی کی تغزلیت، درد کا تصوّف، غالب کا فلسفہ شاعری کی جان ہیں، لیکن اِن بیش بہا خزانوں میں سے بھی، عام لوگوں کی نگاہ صرف خزف ریزوں پر پڑتی ہے، میر انیس کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے، لیکن اُن کی قدردانی کا طغرائے امتیاز صرف اس قدر ہے کہ "کلام فصیح ہوتا ہے، اور بَین اچھا لکھتے ہیں" بد مذاقی کی نوبت یہاں تک پہنچی

کہ وہ، اور مرزا دبیر حریف مقابل قرار دئے گئے، اور مدت ہائے دراز کی غور و فکر، کدو کاوش، بحث و تکرار کے بعد بھی فیصلہ نہ ہو سکا کہ ترجیح کا مسند نشین کس کو کیا جائے۔

اس بنا پر مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھی جائے، جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری، باوجود کم مایگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے، اس غرض کے لئے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ اُن کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں، اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے، شکر ہے کہ آج اُس ارادہ کے پورے ہونے کی نوبت آئی، اور یہ کتاب ناظرین کی خدمت میں پیشکش ہے، اس کتاب میں میر انیس کا موازنہ بھی مرزا دبیر سے کیا گیا ہے اور اس مناسبت سے اس کا نام موازنہ ہے۔

شاعری کیا چیز ہے؟ یہ ایک نہایت مفصل اور دقیق بحث ہے۔ ارسطو نے اس پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ عربی زبان میں ابن رشد نے کیا اور اس کا بڑا حصہ چھپ کر شائع بھی ہو چکا ہے۔ ابن رشیق قیروانی اور ابن خلدون نے بھی اس پر بحث کی ہے۔ انگریزی زبان میں نہایت اعلیٰ درجہ کی کتابیں، اس مسئلہ پر لکھی گئی ہیں جن میں سے بعض میری نظر سے بھی گذری ہیں، گو میں اُن سے اچھی طرح مستفید نہیں ہو سکا، شعر العجم میں میں اس مضمون کو انشاء اللہ

نہایت تفصیل سے لکھوں گا، یہاں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ
شاعری کے دو جز ہیں، مادّہ و صورت۔ یعنی کیا کہنا چاہیئے اور کیونکر
کہنا چاہیئے؟ انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے، سننے یا کسی
حالت، یا واقعہ کے پیش آنے سے، جوش و مسرت، عشق و محبت،
درد و رنج، فخر و ناز، حیرت و استعجاب، طیش و غضب وغیرہ وغیرہ
کی جو حالت پیدا ہوتی ہے اس کو جذبات سے تعبیر کرتے ہیں،
ان جذبات کا ادا کرنا شاعری کا اصلی ہیولی ہے۔ انکے سوا عالم قدرت
کے مناظر مثلاً گرمی و سردی، صبح و شام، بہار و خزاں، باغ و بہار،
دشت و صحرا، کوہ و بیاباں، کی تصویر کھینچنا، یا عام واقعات اور حالات
کا بیان کرنا بھی اسی میں داخل ہے۔

لیکن یہ شرط ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس انداز سے کہا جائے
کہ جو اثر شاعر کے دل میں ہے وہی سننے والوں پر بھی چھا جائے، یہ
شاعری کا دوسرا جز یعنی اس کی صورت ہے، اور انہی دونوں جزوں
کے مجموعہ کا نام شاعری ہے۔ باقی خیال بندی، مضمون آفرینی،
دقت پسندی، مبالغہ، صنائع و بدائع، شاعری کی حقیقت میں داخل
نہیں، اگرچہ بعض جگہ یہ چیزیں نقش و نگار اور ترتیب و زینت کا کام
دیتی ہیں۔

میر انیس کی شاعری کو اسی معیار سے جانچنا چاہیئے جسکا مختصراً
بیان ہوا، جس شخص کو یہ معیار تسلیم نہ ہو، اس کے سامنے میر انیس

کی نسبت کمال شاعری کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

میر انیس اور تمام مرثیہ گویوں کے کلام میں جن لوگوں کا ذکر اکثر آتا ہے اور جو مرثیہ کے ہیرو ہیں، اُن کا نام، اور اُن کی خصوصیات ذیل میں اس غرض سے لکھی جاتی ہیں کہ واقعہ اور روایت کے سمجھنے میں مدد ملے اور محاسن شعری اور اسالیب بلاغت کے نکات سمجھ میں آئیں۔

حضرت عباسؑ	حضرت امام حسین علیہ السلام کے بھائی ہیں، اور گو حقیقی بھائی نہیں لیکن حقیقی بھائیوں سے زیادہ مخلص اور جاں نثار ہیں، اس خصوصیت کو ہر جگہ دکھایا ہے۔ اس کے ساتھ اُن کی شجاعت و بہادری اور جوانانہ جوش کو ہر موقع پر نمایاں کیا ہے۔
حضرت زینبؑ	حضرت امام حسین علیہ السلام کی بہن، جو سب سے زیادہ امام علیہ السلام سے محبت رکھتی تھیں، اُنکے دو صاحبزادے تھے، عونؑ و محمدؑ دونوں کو انھوں نے امام پر نثار کر دیا۔
عونؑ و محمدؑ	حضرت زینبؑ کے صاحبزادے۔
حضرت صغریٰ	امام حسین علیہ السلام کی چھوٹی صاحبزادی،

جن کو امام علیہ السّلام مدینہ میں چھوڑ آئے
اُن کی جدائی اور رخصت کو، تمام مرثیہ گویوں
نے بڑے درد اور اثر کے ساتھ لکھا ہے۔

حضرت سکینہؑ
امام علیہ السّلام کی سب سے چھوٹی صاحبزادی
جو قید خانہ کی تکلیفوں سے انتقال کر گئیں
(حسب خیال مرثیہ گویانِ اُردو)

حضرت علی اکبر
امام علیہ السّلام کے بڑے صاحبزادے
اُن کو حضرت زینبؑ نے پالا تھا، اور اپنے
بیٹوں سے زیادہ اُن کو عزیز رکھتی تھیں،
اِس بنا پر وہ حضرت زینبؑ ہی کو اپنا مالک
و مختار سمجھتے تھے، اور ماں سے زیادہ اُن کا
ادب کرتے تھے۔

علی اصغرؑ
امام علیہ السّلام کے شش ماہہ صاحبزادے
جن کو دشمنوں نے امام علیہ السّلام کی گود
میں شہید کیا۔

حضرت سجّادؑ
امام زین العابدینؑ، جو بیماری کی وجہ سے شریک
جنگ نہ ہو سکے تھے اور دشمن اُنکو بیڑیاں
پہنا کر شام تک پیادہ پا لے گئے تھے۔

حضرت شہربانوؑ
امام علیہ السّلام کی حرم محترم جو نوشیرواں

کی پوتی تھیں،

حُر یزید کے رسالہ کا سپہ سالار تھا، لیکن خدا نے ہدایت کی اور امام علیہ السلام کی فوج میں آکر شامل ہو گیا۔
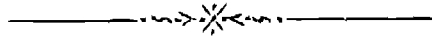
مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ

عرب میں جو فارسی اور اردو شاعری کا سرچشمہ ہے، شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی، اور یہی ہونا چاہیئے تھا، عرب میں شاعری کی ابتدا بالکل فطرت کے اصول پر ہوئی، یعنی جو جذبات دلوں میں پیدا ہوتے تھے، وہی اشعار میں ادا کر دئے جاتے تھے، جذبات میں درد و غم کا جذبہ اور جذبات سے قوی تر ہے، اور جس جوش سے یہ ظاہر ہوتا ہے اور جذبات ظاہر نہیں ہو سکتے، فرض کرو، ایک شخص کے گھر میں بہت تمناؤں کے بعد بیٹا پیدا ہوا، تو اُس کو گو بہت کچھ خوشی ہوگی، لیکن وہ اُس خوشی کو کسی مجمع عام میں اشعار یا خطبہ کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کرے گا، اور کرے بھی تو کلام میں کوئی غیر معمولی تاثیر نہ ہوگی، لیکن اگر یہی لڑکا مر جائے تو اُس کی کیا حالت ہوگی؟ وہ سر تا پا جوش بن جائے گا، اُس کی آہ و زاری لوگوں کو تڑپا دیگی، اور اگر وہ شاعر ہے، تو اُس کے مرثیے دلوں پر نشتر کا کام دیں گے۔

بہر حال عرب میں چونکہ شاعری کی ابتدا اظہار جذبات سے ہوئی تھی، اس لئے سب سے پہلے شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی، جو سب سے قوی تر

جذبہ کا اثر ہے۔

مرثیے عین اُس حالت میں کہے جاتے تھے، جبکہ شاعر کا دل درد و غم سے لبریز ہوتا تھا، اس کا شاعری پر ایک خاص اثر یہ ہوا کہ قصائد کی ابتدا جو عام طور پر تشبیب اور غزل سے کی جاتی تھی، مرثیہ کے قصائد میں یہ طرز متروک ہوگیا، کیونکہ رنج و غم کی حالت میں عشق و محبت کے خیالات کا کیا موقع تھا، عرب میں اس کی مخالف، صرف ایک مثال موجود ہے، یعنی دریدبن الصمہ ایک شاعر نے اپنے بھائی کا مرثیہ جو لکھا اُس کی ابتدا غزل سے کی تھی، جس کا مطلع یہ تھا،

آرَثَّ جدیدُ الحبلِ مِن امِ معبد لعاقبۃٍ او اخلفت کُلَّ موعد

لیکن اس کی وجہ ابن رشیق نے کتاب العمدہ میں یہ لکھی ہے کہ یہ مرثیہ، واقعہ کے پورے ایک برس کے بعد لکھا گیا تھا۔

اگرچہ جاہلیت ہی کے زمانہ میں مرثیہ گوئی کو بہت ترقی ہوچکی تھی، اور بہت سے شعرا نے بڑے بڑے پُراثر مرثیے لکھے تھے لیکن دو شخص اس زمانہ میں بہت نامور ہوئے، خنسا، اور متمم بن نویرہ۔

خنسا، ایک عورت تھی جس کو اپنے بھائی صخر سے بے انتہا محبت تھی، صخر ایک لڑائی میں مارا گیا، خنسا، پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ اُس کے حواس جاتے رہے، اس نے صخر کی پھٹی پرانی جوتیوں کا ہار بنا کر گلے میں ڈالا اور دیوانہ وار پھرنے لگی، اسی حالت میں صخر کے مرثیے کہنے شروع کیے، ان مرثیوں کو پڑھتی تھی، اور نوحہ کرتی تھی، ایک

دفعہ اسی حالت میں حج کو گئی، یہ حضرت عمر فاروق کا زمانہ تھا، وہ حرم کا طواف کرتی، اور سینہ پر دوہتڑ مارتی جاتی تھی، حضرت عمر نے دیکھا تو ڈانٹا اُس نے اپنی داستان بیان کی، حضرت عمر نے کہا ہاں! لیکن ماتم کے اس طریقے کو اسلام نے مٹا دیا، وہ اور بیتاب ہو گئی، اور اُس وقت بے اختیار اُس کی زبان سے چند شعر نکلے، جن کا مطلع یہ ہے۔

هریقی من دموعك واستفیقی وصبرا ان اطقت الو تطیقی

(اپنے نفس سے مخاطب ہو کر) آنسو بہا اور اُس سے تسلی حاصل کر + اور صبر کر اگر تجھ سے کیا جائے، لیکن تو کر نہیں سکنے کی،

متمم بن نویرہ بھی اسی زمانہ میں تھا اور وہ بھی اپنے بھائی کا شیفتہ اور عاشق تھا، ایک لڑائی میں خالد بن الولید نے اس کے بھائی کو مار ڈالا۔ اس پر متمم کی یہ حالت ہوئی کہ گھر بار چھوڑ کر نکلا اور قبائل عرب میں پھرنا شروع کیا، جہاں پہونچتا تھا تمام زن و مرد اُس کے گرد جمع ہو جاتے تھے، وہ دردانگیز لہجہ میں مرثیہ پڑھتا، اور ہر طرف سے گریہ و زاری کی آواز بلند ہوتی، اُس کی یہ حالت دیکھ کر لوگوں نے سمجھایا، کہ تم جلد ہلاک ہو جاؤ گے، اور تمہارے خاندان کی کوئی یادگار باقی نہ رہے گی، اس لئے تم شادی کر لو کہ اولاد کے ذریعہ سے خاندان کا نام رہ جائے،، لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر اُس نے شادی کی، لیکن بیوی کی طرف التفات نہ کر سکا، آخر طلاق دینی پڑی، اسی حالت میں حضرت عمر کے پاس آیا، وہ اُس وقت مسجد نبوی میں

تشریف رکھتے تھے" متمم نے مرثیہ کے اشعار پڑھنے شروع کیے، حضرت عمر اگرچہ نہایت مضبوط دل کے آدمی تھے، لیکن ضبط نہ کر سکے" بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، متمم مرثیہ پڑھ چکا تو حضرت عمر نے کہا (الیٰ ما بلغ بك الحال) یعنی تیرے غم کی حالت کس حد تک پہونچی ہے؟ اُس نے کہا امیر المومنین! بچپن میں مجھ کو ایک عارضہ ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے میری بائیں آنکھ کی رطوبت جاتی رہی تھی، میں کبھی روتا تھا تو اُس آنکھ سے آنسو نہیں نکلتے تھے" بھائی کے مرنے کے بعد جو اس آنکھ سے آنسو جاری ہوئے تو اب تک نہیں تھمے۔

حضرت عمر نے اس سے فرمائش کی کہ آن کے بھائی زید کا مرثیہ لکھے، اُس نے فرمائش پوری کی، لیکن جب دوسرے دن جا کر حضرت عمر کو سنایا، تو حضرت عمر نے کہا کہ اس میں تو وہ درد نہیں ہے، اُس نے کہا امیر المومنین! زید آپ کے بھائی تھے میرے بھائی نہ تھے۔

اس زمانہ تک مرثیہ صرف وہ لوگ کہتے تھے جن پر کوئی غیر معمولی حالت طاری ہوتی تھی، اس کے بعد جب شاعری اصلی حالت سے بدل کر کسب معاش کا ذریعہ بنی تو مرثیہ گوئی کو خود بخود زوال ہوا، کیونکہ مدحیہ قصائد کی طرح اس سے کچھ صلہ نہیں مل سکتا تھا، تاہم چونکہ عرب میں ابھی تک قدیم اوصاف کچھ کچھ باقی تھے، اس لئے بعض مرثیے اس زمانہ کے بھی ایسے ملتے ہیں جن میں اثر اور جوش پایا جاتا ہے۔

اسی زمانہ میں کربلا کا قیامت انگیز واقعہ پیش آیا۔ یہ ایک ایسا

واقعہ تھا کہ اگر عرب کے اصلی جذبات موجود ہوتے تو اس زور کے مرثیے لکھے جاتے کہ تمام دنیا میں آگ لگ جاتی۔ لیکن اُدھر تو عرب کے پُرزور جذبات میں انحطاط آچکا تھا، اِدھر بنو اُمیّہ کی ظالمانہ سطوت اور جبّاری نے تمام شعرا کی زبانیں بند کر دی تھیں۔ فرزدق بنو اُمیّہ کے پائے تخت کا شاعر تھا، لیکن جب اس نے ایک موقع پر فوری جوش سے حضرت امام زین العابدینؑ کی مدح میں فی البدیہہ چند شعر کہے تو عبدالملک بن مروان نے اُس کو جیل خانہ بھیج دیا۔

بنو اُمیّہ کے بعد دولت عبّاسیہ کا دَور آیا، اس عہد میں شاعری کو بہت ترقی ہوئی لیکن اُنہی اصناف کو ترقی ہوئی جن کو صلہ اور انعام سے تعلق تھا، اس لئے مرثیہ گوئی اب بھی اُسی حالت میں رہی۔

البتہ معن اور جعفر برمکی کی فیاضیوں نے ایک عالم کو ممنون احسان بنا رکھا تھا، اس لئے اُن کے مرنے پر جو مرثیے لکھے گئے، اُن میں سے اکثر پُراثر اور درد انگیز تھے[1]۔

فارسی مرثیے

فارسی شاعری کی بنیاد تکلّف، آورد، اور مدّاحی پر قائم ہوئی تھی اس لئے شاعری کے وہ انواع جن کو جذبات سے لازمی تعلّق تھا وفعتہً

---

[1] عرب کی مرثیہ گوئی کا مضمون ایک نہایت وسیع مضمون ہے لیکن ہمکو اقتضائے مقام سے نہایت اختصار کرنا پڑا، کتاب العمدہ ابن رشیق نے باب المراثی میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

پستی کی حالت میں آ گئے، تاہم چونکہ آغاز میں ہر چیز میں فطرت کا اثر پایا جاتا ہے اس لئے فردوسی اور فرخی وغیرہ کی شاعری میں جا بجا جذبات کا اظہار بہت خوبی کے ساتھ نظر آتا ہے۔

فردوسی نے سہراب کا مرثیہ جو اُس کی ماں کی زبان سے لکھا ہے اُس کے اشعار سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

بمادر خبر شد کہ سہراب گرد
ز تیغ پدر خستہ گشت و بمرد

خروشید و جوشید و جامہ درید
بزاری، بران کودک نارسید

بزد چنگ و بدرید پیراہنش
درخشاں شد آں لعل زیبا تنش

برآورد بانگ و غریو و خروش
زماں تا زماں زو ہمی رفت ہوش

فرو برد ناخن دو دیدہ بکند
برآورد بالا در آتش فگند

مر آں زلف چوں تاب دادہ کمند
بہ انگشت پیچید و از بن بکند

رواں گشت از روے او جوے خوں
زماں تا زماں اندر آمد نگوں

ہمہ خاک تیرہ بسر بر فگند
بدنداں ز بازوے خود گوشت کند

بسر بر فگند آتش و برفروخت
ہمہ موے مشکیں بآتش بسوخت

ہمی گفت کاے جان مادر کنوں
کجائی سرشتہ بخاک و بخوں ؟

دو چشم بر رہ بود گفتم مگر
ز سہراب و رستم بیابم خبر

گمانم چناں بود گفتم کنوں
بگشتی بگرد جہاں اندروں

پدر را ہمی جستی و یافتی
کنوں آمدن نیز بشتافتی

چہ دانستم اے پور کاید خبر
کہ رستم بخنجر دریدت جگر

دریغش نیاید ازاں روے تو — وزاں برز و بالاے و بازوے تو

بپرورده بودم تنش را بناز — بزخشنده روز و شبان دراز

کنوں آں بخوں اندروں غرقہ گشت — کفن بر تن پاک او خرقہ گشت

کنوں من کرا گیرم اندر کنار — کہ خواہد بدن مر مرا غمگسار

کرا گویم ایں درد و تیمار خویش — کرا خوانم اکنوں بجاے تو پیش

پدر جستی اے گرد لشکر پناہ — بجاے پدر گورت آمد براہ

ازامید نا امید گشتی تو زار — بخفتی بخاک اندروں زار و خوار

ازاں پیش کو دشنہ را برکشید — جگرگاہ سیمین تو بردرید

چرا آں نشانے کہ مادرت داد — ندادی بدو بر نکردیش یاد

نشاں دادہ بد از پدر مادرت — زبہر چہ نامد ہمے باورت

کنوں مادرت ماندہ بے تو اسیر — پر از درد و تیمار و رنج و زحیر

چرا نامدم با تو اندر سفر — کہ گشتی بگرداں گیتی سمر

مرا رستم از دور بشناختے — ترا با من اے پور بنواختے

بینداختے تیغ آں سرفراز — نکردی جگرگاہت اے پور باز

ہمی گفت و می خست و میکند موے — ہمی زد کف دست بر خوبروے

ہمی گفت مادرت بیچارہ گشت — بہ خنجر جگرگاہ تو پارہ گشت

اسی زمانہ کے قریب سلطان محمود کی وفات پر فرخی نے مرثیہ لکھا جو نہایت مؤثر اور درد انگیز ہے ؎

شہر غزنین نہ ہمان است کہ من دیدم پار — چہ فتاد ست کہ امسال دگرگوں شد کار

گو بہا بینم، پُر شورش و سر تا سر کوے ۔۔۔ ہمہ پُر جوشن و جوشن در و پُر خیل و سوار

مملکت امسال دگر باز نیابد ز غزا ۔۔۔ دشمنے روے نہاد دست درین شہر و دیار

آہ و دردا کہ بیکبارہ تہی بینم از و ۔۔۔ کاخ محمودی و آں خانۂ پُر نقش و نگار

سیری خوردہ مگر دی، و نخفتہ است امروز ۔۔۔ دیر تر خاست، مگر رنج رسیدش ز خمار

خیز شاہا کہ رسولانِ شہان آمدہ اند ۔۔۔ ہدیہا دارند آوردہ فراوان و نثار

کہ توانند؟ کہ برانگیزد ازین خواب ترا ۔۔۔ خفتنی خفتی، کز خواب نگردی بیدار

خفتنِ بسیار، اے خسرو، خوے تو نبود ۔۔۔ ہیچ کس خفتہ ندید است ترا زیں کردار

یک دمکے بارے ورخانہ بیا بیست نشست ۔۔۔ تا بدیدندے روے تو عزیزان و تبار

بہ حصار از فزع و بیم تو رفتند شہاں ۔۔۔ تو شہا از فزع و بیم کہ رفتی بکنار؟

شعرا را تو بہ بازار برافروختہ بود ۔۔۔ رفتی و با تو بیکبارہ برفت آں بازار

اس دور کے بعد مرثیے بہت کم لکھے گئے اور جو لکھے گئے وہ صرف رسمی مرثیے تھے، جن سے شاعری کے تمام اقسام پر قادر ہونے کا اظہار مقصود تھا، البتہ شیخ سعدی اور امیر خسرو کے دو مرثیے، بہت مشہور رہیں، اور چونکہ دل سے نکلے ہیں، حسرت خیز اور درد انگیز ہیں لیکن چونکہ اس زمانہ کی عیش و طرب کی مجلسیں غزل کے ترانوں سے گونج رہی تھیں، اس لئے ان کا اثر عام نہیں ہوا، جب صفویہ اور تیموریہ کا دور آیا تو شاعری نے ایک دوسرا قالب اختیار کیا، اور سنائی، نظیری، عرفی کی زور آوریوں نے پرانی بنیادیں مٹا کر نئی عمارتیں قائم کیں، اس زمانہ میں محتشم کاشی نے عام دستور کے موافق شاہ طہماسپ صفوی کی مدح

میں ایک قصیدہ لکھا طہماسپ کو خاندانِ رسالت سے عشقیہ نیازمندی تھی، اس بنا پر اُس نے کہا کہ میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ میری مدح میں قصائد لکھے جائیں، شعرا کو ائمہ اہل بیت کی شان میں طبع آزمائی کرنی چاہیئے، جس کا اصلی صلہ خدا کے دربار سے ملیگا اور دنیوی تمتعات دربار شاہی سے حاصل ہوں گے، محتشم نے اس خواہش کے موافق آٹھ دس بندوں کا ایک مرثیہ لکھا جو دردوغم کی مجسم تصویر ہے، اور جس کا جواب آج تک نہ ہوسکا اس مرثیہ کے چند بند یہ ہیں

مرثیہ محتشم کاشی

چوں خون زحلق تشنۂ او برزمیں رسید — جوش از زمیں بہ ذروۂ عرش بریں رسید
نخلِ بلند او چو خساں برزمیں زدند — طوفاں بر آسمان زغبار زمین رسید
باد آں غبار چوں بمزار نبی رساند — گرد از مدینہ بر فلکِ ہفتمیں رسید
گرد ایں خیال وہم غلط کار کاں غبار — تا دامن جلال جہاں آفریں رسید

ہست از ملال گرچہ بری ذات ذوالجلال
او در دل است و ہیچ دلے نیست بے ملال

ترسم جزائے قاتلِ او چوں رقم زنند — یکبار بر جریدۂ رحمت قلم زنند
ترسم کزیں گناہ شفیعان روز حشر — دارند شرم کز گنہ خلق دم زنند
دستِ عتاب حق بدر آید ز آستیں — چوں اہل بیت دست بر اہل ستم زنند
آہ از دمے کہ با کفن خوں چکاں زخاک — آل علی چو شعلۂ آتش علم زنند

فریاد ازاں زماں کہ جوانانِ اہلِ بیت — گلگوں قدم بہ عرصۂ محشر قدم زنند

از صاحبِ حرم چہ توقع کنند باز — آں ناکساں کہ تیغ بصیدِ حرم زنند

بس بر سناں کنند سرے راکہ جبرئیل

شوید غبارِ گیسویش از آبِ سلسبیل

[۱] بر حربگاہ چوں رہ آں کارواں فتاد — شور و نشور واہمہ را در گماں فتاد

ہم بانگِ نوحہ غلغلہ در شش جہت فگند — ہم گریہ بر ملائکِ ہفت آسماں فتاد

چنداں کہ بر تنِ شہدا چشم کار کرد — بر زخم ہائے کاریِ تیغ و سناں فتاد

ناگاہ چشمِ دخترِ زہرا دراں میاں — بر پیکرِ شریفِ امامِ زماں فتاد

بے اختیار نعرۂ ھذا حسین ازو — سر زد چنانکہ آتش ازو در جہاں فتاد

پس با زباں پر گلہ آں بضعۃ البتول

رو در مدینہ کرد کہ یا ایہا الرسول

ایں کشتۂ فتادہ بہ ہاموں حسین تست — ویں صیدِ دست و پا زدہ در خوں حسین تست

ایں غرقۂ محیطِ شہادت کہ روئے دشت — از موجِ خونِ او شدہ گلگوں حسین تست

ایں خشک لب فتادۂ ممنوع از فرات — کز خونِ او زمیں شدہ جیحوں حسین تست

ایں شاہِ کم سپاہ کہ با خیلِ اشک و آہ — خرگاہ ازیں جہاں زدہ بیروں حسین تست

ایں قالبِ طپاں کہ چنیں ماندہ بر زمیں — شاہِ شہید ناشدہ مدفوں حسین تست

---

[۱] ایک بند اس سے پہلے کا چھوڑ دیا گیا ہے، جس میں یہ بیان ہے کہ واقعۂ کربلا کے بعد مخالفین اہلِ حرم کو بے عماری کے اونٹوں پر سوار کر کے شہدا کی لاشوں کے سامنے سے لے گئے۔

پس روے در بقیع بہ زہرا خطاب کرد
وحش زمین و مرغ ہوا را کباب کرد

کاے مونس شکستہ دلان حال ما ببین — ما را غریب و بیکس و بے آشنا ببین
تنہائے کشتگان ہمہ در خاک و خون نگر — سرہائے سروران ہمہ بر نیزہ ہا ببین
آں سر کہ بود بر سر دوش نبی مدام — یک نیزہ اش ز دوش مخالف جدا ببین
واں تن کہ بود پرورشش در کنار تو — غلطاں بہ خاک معرکۂ کربلا ببین
در خلد بر حجاب دو کون آستیں فشاں — واندر جہاں مصیبت ما بر ملا ببین
نے نے درا چو ابر خروشاں بہ کربلا — طغیان سیل فتنہ و موج بلا ببین

یا بضعۃ البتول ز ابن زیاد داد
کو خاک اہل بیت رسالت بباد داد

محتشم کے مرثیہ کو اگرچہ حد سے بڑھ کر حسن قبول حاصل ہوا، اور دربار شاہی سے صلہ اور انعام بھی ملا، لیکن تمام ملک میں قصیدہ اور مدح کا رنگ اس قدر چھایا ہوا تھا، کہ عام شعرا پر اس کا چنداں اثر نہیں پڑا، طالب آملی غزالی۔ سیلی۔ سلیم۔ کلیم وغیرہ شعرائے متاخرین کے کلام میں اور سب اصناف سخن پائے جاتے ہیں۔ لیکن مرثیہ کا بہت کم پتہ چلتا ہے۔ حاجی محمد جان قدسی نے اپنے بیٹے کا جو نوجوان مر گیا تھا، نہایت پر درد مرثیہ لکھا، لیکن تو بادۂ رسالت کے غم میں دو شعر بھی نہ لکھے، ظہوری نے البتہ بہت سے مرثیے لکھے، لیکن وہ اپنا دلی جوش نہ تھا، بلکہ ابراہیم عادل شاہ کی خوشامد تھی، چنانچہ اکثر مرثیوں کے خاتمہ میں ابراہیم عادل شاہ

کا نام اس طرح آتا ہے جس طرح قصائد میں تشبیب کے بعد گریز۔
ایک بند کے خاتمہ کا شعر ہے ؎

سرکن ز روے صدق ظہوری رہِ دعا   از گفتگو دعائے شہنشاہ مدعا است

خود کہتا ہے کہ مرثیہ سے صرف بادشاہ کی دعا مقصود ہے۔
ایک اور مرثیہ کا خاتمہ ہے ؎

ایام ازاں بہ کام حسینؑ و حسنؑ نبود   کاں روز شہریار سریر دکن نبود

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں ؎

روزے کہ سرور شہدا بے سپاہ بود   ہنگام کارزار براہیم شاہ بود

اس خوشامد کا کیا ٹھکانا ہے کہ حسین علیہ السلام کی ناکامیابی کی یہ وجہ تھی کہ اس زمانہ میں بادشاہ دکن موجود نہ تھا۔

محتشم کے بعد مقبل نے مرثیہ گوئی کی طرف خاص توجہ کی، اس نے مرثیہ ہی کو شاعری کا موضوع قرار دیا، نہایت کثرت سے مرثیے لکھے، اور بڑا کام یہ کیا کہ کربلا کے تمام واقعات، ابتدائے سفر سے لے کر اہل حرم کے قید ہونے، اور رہائی پا کر مدینہ میں آنے تک، سادہ طریقہ پر لیکن تفصیل کے ساتھ، ان مرثیوں میں ادا کر دیے، اس کے مرثیوں کو مرثیہ کی بہ نسبت تاریخ کہنا زیادہ موزوں ہے، اس غرض کے لئے اس نے ترکیب بند وغیرہ چھوڑ کر مثنوی کا طریقہ اختیار کیا، اور مثنوی میں بھی قدیم معمولی بحریں اختیار نہیں کیں، بلکہ قصائد کی بحر انتخاب کی، تاکہ ہر قسم کے مطالب بھی تفصیل کے ساتھ بیان ہو سکیں، اور سوزخوانی کے کام بھی

آئیں، کیونکہ مثنوی کی مروّجہ بحروں میں سوز خوانی کے آثار چڑھاؤ کی کھپت نہیں ہو سکتی تھی۔

مقبلؔ کے مرثیوں میں اگرچہ وہ زور اور بندش کی چستی نہیں ہے، جو اس دور کا خاصہ ہے، لیکن درد اور تاثیر سے خالی نہیں، نمونہ کے لئے ہم صرف چند شعر لکھتے ہیں ؎

مخدّرات بہ عباسؑ در سخن بودند — برائے رفتن او در گریستن بودند
کہ از درونِ سراپردہ با فغان و خروش — سکینہ آمد و یک مشک خالی بر دوش
دوان بخدمتِ عمِّ بزرگوار آورد — چناں کہ اہلِ حرم را بزار زار آورد
بگریہ گفت کہ اے عمِّ خوش قرینۂ من — رسید جاں بلب از تشنگی ز سینۂ من
چہ واقع است کہ رحمے بخلق دوراں نیست — چہ شد کہ جرعۂ آبے دریں بیاباں نیست
چو دید حضرت عباسؑ بے قراریِ او — گسیخت بندِ دلش از فغان و زاریِ او

مقبلؔ کے بعد ایران میں مرثیہ گویوں کا ایک خاص گروہ پیدا ہو گیا، اور مرثیہ کے اور بہت سے اقسام پیدا ہو گئے،، مثلاً نوحہ، پیش خوانی وغیرہ۔،،

ہندوستان میں مرثیہ گوئی کی ابتداء

ہندوستان میں شاعری کی ابتدا ولیؔ سے ہوئی، ولیؔ نے اگرچہ کربلا کے حالات میں ایک خاص مثنوی لکھی لیکن اس کے کلام میں مرثیہ کا پتہ نہیں لگتا، یہ معلوم نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا کس نے کی، لیکن اس قدر یقینی ہے کہ سوداؔ اور میرؔ سے پہلے مرثیہ کا رواج ہو چکا تھا۔ سوداؔ نے اپنے شہر آشوب میں میاں مسکینؔ مرثیہ گو کا ذکر کیا

ہے ؎

استقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

میر تقی صاحب کے دیوان میں اگرچہ کوئی مرثیہ نہیں، لیکن مرثیہ انھوں نے بھی کہا ہے، اُن کے ایک مرثیہ کا ردّ مرزا سودا نے لکھا ہے جس کے چند شعر یہ ہیں، ؎

دلوں پر محبوں کے حالت عجیب ہے مصیبت ہی ماتم ہی غم ہی تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے حسین علی کی شہادت کی شب ہے
کوئی دل نہیں جس کو ماتم نہ ہوگا وہ دل دیر ہے جس میں یہ غم نہ ہوگا
یہ دن کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہوگا قیامت میں یہ کچھ نہ ہوگا جواب ہے
بجا ہے کہ لوہو کے دریا بہائے یہ کشتی فلک کی لہو میں ڈبائے
شہِ تشنہ لب کا کسے غم سنائے یہ کس منہ سے کہیے کہ وہ تشنہ لب ہے

اُس وقت تک مرثیے عموماً چو مصرع ہوتے تھے، غالباً سب سے پہلے سودا نے مسدس لکھا جو اُن کے دیوان میں موجود ہے، اُردو میں مرثیہ کی وسعت اور ترقی کا یہ پہلا قدم تھا کیونکہ چو مصرع میں اوّل سے آخر تک ایک خاص قافیہ کی پابندی کی وجہ سے ہر قسم کے مطالب نہیں ادا کئے جاسکتے تھے،

میر انیس کے اس مصرع سے ؏

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں،

ثابت ہوتا ہے کہ میر ضاحک صاحب نے جو میر انیس کے پردادا

اور سودا کے معاصر تھے، اور میر حسن ان کے بیٹے نے بھی مرثیہ لکھا ہے، لیکن ضاحک کا کلام تو سرے سے مفقود ہے میر حسن کا دیوان مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا، یاد نہیں آتا کہ اس میں مرثیہ بھی ہے یا نہیں یہ امر تعجب سے خالی نہیں کہ میر تقی، اور مرزا سودا جیسے نادر الکلام نے بھی مرثیہ کو چنداں ترقی نہیں دی، اور میر ضمیر تک یہ فن گویا ابتدائی ہی حالت میں رہا، چنانچہ سودا کے مسدس کا ایک بند ہم نقل کرتے ہیں جس سے اس زمانہ کی مرثیہ گوئی کا اندازہ ہوگا ۔

کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی
جو ہے دنیا میں سو کہتا ہے مجھے ایذا دی
ہاتھ سے کون نہیں آج ترے فریادی
یاں تلک پہونچی ہے ملعون تری بیدادی
کون فرزند علی پر یہ ستم کرتا ہے
کیوں مکافات سے اسکے تو نہیں ڈرتا ہے

خویش و فرزند و عزیز اس کے تھے جتنے پیارے
دشنہ و تیغ سے ان ظالموں کے سب مارے
اہل بیت اس کے جو باقی ہیں سو ہیں آوارے
قید میں کوفیوں کے جاتے ہیں وہ بیچارے
نہ انھیں چین ہے دن کو نہ انھیں رات آرام
اس مصیبت میں چلے جاتے ہیں کربل سے شام

شاید یہ خیال ہو کہ اُس وقت تک شعرا مرثیہ کو محض ایک مذہبی فرض سمجھتے تھے اور اس وجہ سے شاعرانہ طباعی اور زور آوری سے اجتناب کرتے تھے، اُن کا مقصد صرف رونا رُلانا ہوتا تھا، جس کو شاعری سے تعلق نہیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، مرزا سودا، میر تقی کے مرثیہ کی ردکی تمہید میں لکھتے ہیں۔

"لیکن مشکل ترینِ وقائق، طریقہ مرثیہ کا معلوم کیا، کہ مضمون واحد کو ہزار رنگ میں ربطِ معنی دیا، اس کام میں محتشم سا کسو نے عزقبول نہیں پایا، پس لازم ہے کہ مرتبہ در نظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریہ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے"۔

اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ مرزا مرثیہ کو مشکل ترین فنون سمجھتے تھے، اور اس کا مقصد محض گریہ عوام نہیں قرار دیتے تھے۔

غرض اس زمانہ میں جو کچھ ترقی ہوئی وہ صرف اس قدر تھی کہ مرثیے چو مصرع سے مسدس ہو گئے تھے، سب سے پہلے جس شخص نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا، وہ میر ضمیر، مرزا دبیر کے اُستاد ہیں، میر ضمیر کے مرثیے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں، انھوں نے مرثیہ میں جو جدتیں پیدا کیں، حسب ذیل ہیں۔

میر ضمیر

۱۔ رزمیہ لکھا،

۲۔ سراپا ایجاد کیا،

۳۔ گھوڑے۔ تلوار اور اسلحۂ جنگ کے الگ الگ اوصاف لکھے، اور

یہی مضامین آج موجودہ مرثیوں کے مہمات موضوع ہیں۔

۴۔ واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی، چنانچہ ایک ایک جزئی واقعہ کو تفصیل کے ساتھ لکھا۔

۵۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کلام میں زور اور بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی، غلط الفاظ جو مرثیوں کے لئے گویا جائز مان لیے گئے تھے اکثر ترک کر دیے۔ اُن کے عمدہ کلام کا اگر انتخاب کیا جائے، تو میر انیس کا کلام معلوم ہوگا۔

اب سے پہلے مرثیے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے اب تحت لفظ کا بھی رواج ہوا اور غالباً پہلا شخص جس نے ممبر پر بیٹھکر تحت لفظ پڑھا میر ضمیر صاحب تھے، نئی تشبیہات۔ لطیف استعارے۔ مبالغہ۔ واقعہ نگاری۔ مناظر قدرت کی تصویر۔ غرض میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام کے جس قدر محاسن ہیں، ضمیر کے ہاں سب پائے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ میر ضمیر کے ہاں ان کا رنگ ہلکا تھا، اِن دونوں صاحبوں نے شوخ کر دیا۔ میر ضمیر کے ہر نمونہ کے چند اشعار ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

جا کے میدان میں کس طرح یہ محبوب لڑے — یہ کہو کہیئے کہ غلام آپ کے کچھ خوب لڑے
چاہتا تھا کہ کروں ضبط پہ چُپ رہتا تھا — پوچھو اکبر سے میں ہر ہاتھ پہ کیا کہتا تھا
چیر کر فوج کو اس پار سے اُس پار گئے — میں نے خود دیکھا کہ دریا پہ کئی بار گئے
پانی تو پی نہیں حیدر کے نواسے آئے — بولے عباس کہ پیاسے گئے پیاسے آئے

قریب جاتے ہی ہندہ نے اُنکا تھاما ہات ۔ کہا سلام علیک اے ضعیفۂ نیک صفات
وہاں سے لائے اُٹھا کر تو پھر کہی یہ بات ۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتے ہیں آپکے حالات

وہ روشنی میں بغور اُنکے مُنہ کو تکتی تھی
اگرچہ قصد تھا۔ پر کچھ وہ کہہ نہ سکتی تھی

کہا یہ ہندہ نے کچھ میں نے تم کو پہچانا ۔ کہیں ہے شہر مدینہ میں ظاہرا دیکھا
محلہ ہے وہاں مشہور آلِ ہاشم کا ۔ ہمیشہ آمد و شد تھی غرض مری اُس جا

ضرور دیکھا ہے آلِ عقیل و جعفر میں
دیا جناب رسالتمآبؐ کے گھر میں

سو اس کلام سے مطلب ہی یہ خدا ہی گواہ ۔ جناب فاطمہؑ کے گھر میں تھی نہیں کچھ راہ
خصوص زینبؑ و کلثومؑ سے بھی ہوا آگاہ ۔ ہیں دونوں بی بیاں شہزادیاں مری واللہ

وہ سب تو ایک طرف پر امام اچھے ہیں
کہو حسین علیہ السلام اچھے ہیں

پنہاں زرہ میں ہوتی تھی اسطرح سے سناں ۔ بجلی چمک کے ہوتی ہے جوں ابر میں نہاں
اس نیزۂ سیاہ سے تھا سب کو یہ گماں ۔ تھا اژدہائے موسیٰ عمران کی وہ زباں

نیزہ کی یہی تشبیہ ہے جس کو میر انیس صاحب نے زیادہ لطیف اور صاف کر دیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ع گویا زباں نکالے ہوئے اژدہا چلا' میر انیس نے اِسی سے دو نیزوں کے باہم ٹکرانے کا مضمون پیدا کیا اور اس لطف کو دوبالا کر دیا۔ ع دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے'

تھا دیدۂ حیران ہر اک زخم بدن میں ۔ انگشتِ تاسف تھی زباں سب کے دہن میں
(میر ضمیر)

گھوڑا وہ تیز رو ہے کہ ناگاہ ایک بار | اتنا کہا تھا ہم نے کہ ہاں چل تو ایک بار
دونوں نے ہم عنانی و سرعت کی اختیار | آخر کہاں وہ اور کہاں وہ ہم ہرزہ کار

کچھ کچھ تو ساتھ ساتھ وہ مقدور بھر گیا
پھر یہ خبر نہیں کہ کہاں تھا کدھر گیا

اسی زمانہ میں میر خلیق صاحب نے مرثیہ کے فن کو بہت ترقی دی، میر انیس صاحب اُن کے بیٹے جا بجا اپنے مرثیوں میں اُن کی فصاحت اور روزمرہ کا ذکر کرتے ہیں، ایک بند میں اپنے روزمرہ پر ناز کرتے ہیں، اور کہتے ہیں۔ ؎

حقا کہ یہ خلیق کی ہے سربسر زبان، میر خلیق کے ایک سلام کا مطلع و مقطع مشہور ہے ؎

مجرائی طبع کند ہے لطف بیاں گیا | دنداں گئے کہ جوہر تیغ زباں گیا
گذری بہار عمر خلیق اب کہیں گے سب | باغ جہاں سے بلبل ہندوستاں گیا

اِن اشعار سے قیاس ہوتا ہے کہ میر خلیق نے میر ضمیر سے کچھ کم اِس فن پر احسان نہیں کیا ہوگا، لیکن افسوس ہے کہ اُن کا کلام نہیں ملتا، میر نواب صاحب نامی ایک بزرگ نے جو میر خلیق کے بہ یک واسطہ شاگرد تھے، ۱۲۹۷ھ میں بمقام گلبرگہ، حیدر آباد دکن، ایک مجموعہ چھاپا تھا، جس میں میر خلیق، مونس، اور انیس کے چند مرثیے جمع کیے تھے، اس میں میر خلیق کے متعدد مرثیے ہیں۔ لیکن اکثر وہ ہیں، جو آج میر انیس کے نام سے مشہور ہیں اور جو میر انیس کے چھپے ہوئے مرثیوں میں شامل ہیں، بعض ایسے ہیں جو مطبوعہ مرثیوں میں شامل نہیں، لیکن زبان، اور طرز ادا

سے قیاس ہوتا ہے کہ میر انیس ہی کے نتائج فکر ہیں، اور اگر وہ واقعی میر خلیق کا کلام ہے، تو بیٹے کو باپ پر ترجیح کی کوئی وجہ نہیں۔

چند نمونے ملاحظہ ہوں ؎

مرتا ہے باپ، اے علی اکبر! ابھی نہ جا دل مانتا نہیں مرے دلبر ابھی نہ جا
اے لال! سوئے نیزہ و خنجر ابھی نہ جا ہے ہے نہ جا شبیہ پیمبر ابھی نہ جا
مضطر ہوں چین آنے پہ آتا نہیں مجھے
رونے میں منہ ترا نظر آتا نہیں مجھے

ماتھے کو چومتے تھے کبھی اور دہن کبھی تکتے تھے سوئے زلفِ شکن در شکن کبھی
روتے تھے لیکے بوسۂ سیب ذقن کبھی یوسف کا اپنے سونگھتے تھے پیرہن کبھی
ملتے تھے خشک ہونٹھ لب گلعذار سے
سینہ پہ رکھتے تھے کبھی منہ اپنا پیار سے

([illegible])

پیاسے پہ مثل ابر امنڈ آئے دل کے دل شعلے صفت چمکنے لگے برچھیوں کے پھل
پھلوں میں تیر رکھکے بڑھے روم و شام کے پل تیغیں اٹھی ہوئیں جو چمکیں ہٹ گئی اجل
دن کو سیاہی شبِ ظلمات ہو گئی
کھولے نشان شامیوں نے رات ہو گئی

تلوار

موجیں زرہ حباب ہیں سر اسکے سامنے شق ہیں بہادروں کے جگر اسکے سامنے
رکھتی ہے کیا بساط سپر اُس کے سامنے تنکے ہیں جبرئیل کے پر اُس کے سامنے
ماریں کمر کا ہاتھ اگر پاؤں گاڑ کے
دو ٹکڑے آسیا کی طرح ہوں پہاڑ کے

حیران تھے کب حسام سے کاٹھی جدا ہوئی ترکش میں ڈھونڈھتے تھے کہ تلوار کیا ہوئی

میر انیس تقریباً ۱۲۱۸ھ میں پیدا ہوئے، انھوں نے مرثیہ کو جو ترقی دی، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ یہاں جو باتیں کہنے کے قابل ہیں یہ ہیں۔

ا۔ میر انیس کا خاندان دلی کا خاندان تھا۔ اگرچہ اُن کے پر دادا میر ضاحک دلی سے چلے آئے تھے اور فیض آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی، تاہم دہلی کی جو خصوصیات تھیں وہ اخیر تک اس خاندان میں قائم رہیں، میر انیس، اکثر موقعوں پر ناز کے لہجہ میں کہتے تھے، "صاحبو" ارباب لکھنؤ اس طرح نہیں بولتے، یہ میرے گھر کی زبان ہے" اسی بنا پر جا بجا جگہ کو "جاگہ" لکھا ہے، اور یہ صرف تحریری زبان نہیں، وہ یوں ہی بولتے بھی تھے، میں نے اپنے معزز دوستوں سے، جو میر صاحب کی صحبتوں میں اکثر شریک رہا کئے ہیں، سنا ہے کہ جب کبھی اُن کی مجلس میں لوگ صف نعال میں آ کر بیٹھ جاتے تھے، تو فرماتے تھے، "صاحبو! جاگہ ادھر ہے" افعال کو فاعل کی مطابقت سے جمع لکھنا بھی دہلی ہی کا اثر ہے مثلاً ع

جلدی میں گو جوانوں نے چوٹیں بچائیاں

۲۔ میر صاحب نے شاعری میراث میں پائی تھی، اُن کے مرثیے جو خاص جوہر ہیں وہ میراث ہی کی یادگار ہیں، اُن کے دادا میر حسن گو غزل بھی کہتے تھے لیکن جس چیز نے اُن کو عام شہرت کا تاجدار بنایا، وہ اُن کی مثنوی "بدر منیر" ہے" اس مثنوی کا خاص وصف، واقعات، اور کیفیات کا سین دکھانا ہے۔ وہ جس واقعہ یا حالت کو لکھتے ہیں، اس کا سماں

باندھ دیتے ہیں۔

میر انیس کے مرثیوں میں واقعات اور کیفیات کی تصویر کھینچ دینے کی جو خصوصیت ہے، دادا کی میراث ہے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ میر حسن، واقعہ نگاری کی وسعت میں ابتذال، اور عامیانہ بول چال کی پروا نہیں کرتے۔ میر انیس نے واقعہ نگاری اور تصویر کے ساتھ، بندش کی چستی، اور خواص کی طرز گفتگو کی خصوصیت بھی قائم رکھی، اور یہ قادر الکلامی کی انتہا ہے۔

۳۔ میر حسن صاحب غزل گوئی میں اگرچہ سودا اور میر درد کے شاگرد تھے، لیکن سودا کا پرتو ان پر نہیں پڑا صرف میر درد کا رنگ ہے، یعنی روزمرہ، صفائی، گھلاوٹ، اور درد، یہی باتیں میر انیس صاحب کے ہاں بھی ہیں، جو لوگ کہتے ہیں، کہ میر انیس صرف بین لکھنا جانتے ہیں اس جھوٹ میں سچ بھی ہے یعنی بین، رزم سے بہتر لکھتے ہیں، یہ وہی خصوصیت ہے جو دادا سے ترکہ میں ملی ہے۔

۴۔ میر انیس کی شاعری کے متعلق یہ مسئلہ نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے کہ مرزا دبیر کی رقابت، اور مقابلے نے ان کے کلام پر کیا اثر پیدا کیے، اگر یہ پتہ لگ سکتا کہ دونوں حریفوں میں سے، اول کس نے میدان شاعری میں قدم رکھا اور خاص خاص مرثیے، بلکہ خاص خاص بند جو دونوں کے ہاں قریب المعنی پائے جاتے ہیں، اول کس نے کہے، تو شاعری کی تاریخ کے بہت سے دقیق نکتے حل ہو جاتے، لیکن افسوس

ہے کہ باوجود بہت سی جدوجہد کے اس بارہ میں مجھکو کامیابی
نہیں ہوئی۔

دونوں حریفوں کے مرثیوں کو دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک
نے دوسرے کے کلام کو سامنے رکھ کر لکھا ہے، لیکن زمانہ کے
تقدیم و تاخیر کے نہ معلوم ہونے سے یہ نہیں متعین ہوتا کہ ایجاد کا فخر
کس کو ہے، اور کس نے کس سے کیا اثر لیا ہے، میر انیس جابجا اپنے
شعروں میں اس بات کا اشارہ کرتے ہیں، کہ ان کے حریف ان کے
کلام سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مثلاً ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار — خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
نواسنجیوں نے تری اے انیس — ہر اک زاغ کو خوش بیان کر دیا
ملتی نہیں دزدان معانی سے نجات — سچ ہے کہ کس سے کیا شکستگی ہے

ان چوٹوں کو سنکر مرزا دبیر صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے،
یعنی یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں، میرا حریف سرقہ کرتا ہے، بلکہ صرف بری
کرتے ہیں کہ میں اس جرم کا مرتکب نہیں، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں — ہر مرثیہ میں موجد طرز جدید ہوں
ہے استفادہ مجھ کو احادیث و سیر سے — یعنی بری ہوں سرقہ مضمون غیر سے

اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے، میر انیس، مرزا صاحب کے
مقابلہ کا قصد نہیں کرتے تھے، اور ان کے مرثیوں کا جواب لکھنا نہیں
چاہتے تھے ورنہ میرزا صاحب ضرور اس کا اشارہ کرتے اس کے ساتھ

جب بعض مرثیوں سے صاف ثابت ہے، کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلہ پر لکھے گئے ہیں، تو خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہے کہ مقابلہ اور ہم طرحی و مسابقت کی کوشش، میرزا صاحب ہی کی طرف سے ہوتی تھی، میر انیس نے اِسی کی طرف ایک موقع پر اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل   اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

جن مرثیوں یا اشعار یا مضامین میں تقابل یا توارد ہے اُن کی تفصیل آگے آئیگی، اور وہاں اس تمہیدی بحث کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

۵۔ میر انیس کا جو کلام موجود ہے، ۵ جلدوں میں شائع ہوا ہے، لیکن میر صاحب کے متوسلین کا خاص دعویٰ ہے، کہ اِن مرثیوں میں بہت کچھ تحریف، اور خلط ہوا ہے۔ مولوی عبدالغفور نساخ نے ایک رسالہ مرزا دبیر، اور میر انیس کے اغلاط کے متعلق لکھا تھا اس کا جواب میرزا محمد رضا متخلص بہ معجز، شاگرد ناسخ نے لکھا جس کا نام تطہیر الاوساخ ہے، اور جو ۱۲۹۶ھ میں شعلۂ طور کانپور میں چھپا تھا، اس کے دیباچہ میں میرزا رضا صاحب لکھتے ہیں۔

"ثانیاً یہ بات بھی کالنار علی العلم ہے کہ اکثر تلامذۂ میر صاحب و مرزا دبیر صاحب نے بہ لحاظ اپنے پڑھنے کے اکثر تصرفات بہ تغیر و تبدل الفاظ و مصرعہ و بند کے کئے ہیں، بہ نظر اختصار کسی مرثیہ کے کچھ بند نکال ڈالے، اور کہیں درمیان مرثیہ میں کوئی مطلع یا بند ایجاد کر کے الحاق

کیا تاکہ وہیں سے پڑھنا شروع کریں، کہیں بغرض بکا و ابکا، مضامین جیبکیہ موزوں کرکے شامل مرثیہ کئے، کہیں الفاظ میں موافق اپنے فہم و سلیقہ کے کمی و بیشی کی، یا مشتاقین نے جو مرثیہ جدید زبان سے ان مصاحبوں کی مجلس میں سنا خفیہ تحریر کیا، اور جو الفاظ یا مصرع بسبب عجلت تحریر یا عدم سماعت کے رہ گئے، اُس کی تکمیل بطور خود کی، اس باعث سے کہ نقل مرثیۂ جدید و تو تصنیف کا دستیاب ہونا شائقین سے غیر ممکن تھا، پس جو کچھ کہ مرثیہ اُن کے تلامذہ کے پاس ہیں، اُن میں اکثر کا اصل نہیں ہے تغیر و تبدّل۔ اضافہ و نقصان اُن میں بہت ہے، اور انہیں مرثیوں کی نقل وہ مرثیے ہیں، جو مطبوع ہوئے ہیں، پس مراثی مطبوعہ من قبیل بناء الفاسد علی الفاسد ہیں۔"

اس بنا پر میرزا صاحب نے میر نفیس صاحب سے جو میر انیس کے فرزند رشید تھے مطبوعہ مرثیوں کی تصحیح کی جس کا نتیجہ حسب ذیل ہے۔

یہ مرثیہ ع اے تیغ زباں جوہر تقریر دکھا دے، اس مصرعہ تک ملنے لگے آنکھیں قدم سرور دیں پر، میر صاحب کا کلام ہے، باقی ۱۴۵ سے لیکر ۱۵۵ تک، اور مقطع کے دو اوّل مصرعے سب الحاقی ہیں۔

یہ مرثیہ ع دشت وغا میں نور خدا کا ظہور ہے، نشتر بند تک یعنی اس ٹیپ تک مصرع چھاتی کے پار نیزہ کی نوکیں نکل گئیں میر صاحب کا کلام ہے، باقی الحاقی ہے، یہ شعر

"لپٹوں گلے سے ہیں پدرِ ناتوان کے
سینہ سے تو سرک تو میرے بابا جان کے"

الحاقی ہے،

میرزا رضا صاحب نے اور بہت سے اعتراضات کے جواب میں جو خاص خاص الفاظ یا تراکیب پر تھے۔ اُن الفاظ اور تراکیب سے انکار کیا ہے، اور کہا ہے کہ اصل مرثیہ میں یوں نہیں یوں ہے چونکہ اس قسم کے الفاظ نہایت کثرت سے تھے، اس لیے ہم اُن کو قلم انداز کرتے ہیں۔ ناظرین چاہیں تو اصل رسالہ کو ملاحظہ فرمائیں۔

ہم کو اس سے انکار نہیں کہ مطبوعہ مرثیے نہایت غلط چھپے ہیں، لیکن میرزا رضا صاحب نے تو یہ غضب کیا ہے کہ جہاں کوئی لفظ محاورۂ حال کے خلاف نظر آیا، اس کے وجود سے انکار کر دیا، حالانکہ یہ تفہیم صحیح نہیں۔ میر انیس نے بہتر برس کی عمر پائی، اُن کی ابتدائی مشق میں قدیم محاورے اور غلط الفاظ نہایت کثرت سے متداول تھے، اور شعرا بے تکلف اُن کو استعمال کرتے تھے، شیخ ناسخ نے البتہ اس قسم کے تمام الفاظ کو ترک کر دیا تھا، لیکن جو لوگ اپنے تئیں، دلی کی طرف منسوب کرتے تھے، وہ اُن الفاظ اور محاورات کو وطن کی یادگار سمجھتے تھے، چنانچہ غالب و ذوق جو خاتم الشعرا ہیں، اُن کے یہاں وہ الفاظ بے تکلف ملتے ہیں، جن کو شیخ ناسخ مدتوں سے چھوڑ چکے تھے، مثلاً میرزا غالب فرماتے ہیں۔

ع کشمکش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں۔

حالانکہ اس قسم کی جمع، ایک مدت سے متروک ہے، اس قسم کے الفاظ میر انیس کے ہاں بھی ہیں، اور کثرت سے ہیں، لیکن وہ ابتدائی مشق کے ہیں، ورنہ شیخ ناسخ کے اثر، یا خود مذاق کے بدلنے سے، جس قدر زمانہ گذرتا گیا، میر صاحب، قدیم مخصوص الفاظ اور ترکیب چھوڑتے گئے۔

میر انیس کی شاعری کی خصوصیات

اب ہم تفصیل کے ساتھ میر صاحب کی شاعری کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔

فصاحت۔ علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ لفظ میں جو حروف آئیں، اُن میں تنافر نہ ہو، الفاظ نامانوس نہ ہوں، قواعد صرفی کے خلاف نہ ہو۔ نصاد

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ درحقیقت ایک قسم کی آواز ہے، اور چونکہ آوازیں بعض شیریں، دلآویز، اور لطیف ہوتی ہیں، مثلاً طوطے و بلبل کی آواز، اور بعض مکروہ و ناگوار مثلاً کوے اور گدھے کی آواز، اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں بعض شستہ، شگفتہ، شیریں اور بعض ثقیل، بھدے، ناگوار، پہلی قسم کے الفاظ کو فصیح کہتے ہیں، اور دوسرے کو غیر فصیح، بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ فی نفسہٖ ثقیل اور مکروہ نہیں ہوتے لیکن تحریر و تقریر میں اُن کا استعمال نہیں ہوا ہے یا بہت کم ہوا ہے، اس قسم کے الفاظ بھی جب ابتداً استعمال کئے جاتے ہیں تو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں، اُن کو فن بلاغت کی اصطلاح میں غریب کہتے ہیں، اور اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت میں خلل انداز خیال کئے جاتے ہیں۔

میر انیس کے کمال شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ انھوں نے اردو شعرا میں سے سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے اور سیکڑوں مختلف واقعات بیان کرنے کی وجہ سے، ہر قسم اور ہر درجہ کے الفاظ اُن کو استعمال کرنے پڑے، تاہم اُن کے تمام کلام میں غیر فصیح الفاظ نہایت کم پائے جاتے ہیں۔ اکثر جگہ عربی، فارسی کے الفاظ جو اردو زبان میں کم مستعمل ہیں، ضرورت سے لانے پڑے ہیں۔ لیکن اس قسم کے الفاظ جہاں آئے ہیں، فارسی ترکیبوں کے ساتھ آئے ہیں جس سے اُن کی غرابت کم ہو گئی ہے، ورنہ اگر اردو کی خاص ترکیب میں اُن الفاظ کا استعمال کیا جاتا تو بالکل خلاف فصاحت ہوتا۔ مثلاً انگشتری، خاتم، رخ، بادہ، شنا، حسن، اور اس قسم کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ ہیں، جو بجائے خود فصیح ہیں لیکن ٹھیٹ اردو میں اِن کا استعمال نہیں ہوتا۔ میر ضمیر ایک موقع پر کہتے ہیں ع

ذریت رسول کی خاطر جلائی نار۔ نار کا لفظ اس موقع پر نہایت نامانوس اور بیگانہ ہے، لیکن یہی لفظ جب فارسی ترکیبوں کے ساتھ اردو میں مستعمل ہوتا ہے، مثلاً نارِ دوزخ، نارِ جہنم، تو وہ غرابت نہیں رہتی۔

فصاحت کے مدارج میں اختلاف ہے، بعض الفاظ فصیح ہیں، بعض فصیح تر، بعض اُن سے بھی فصیح تر، میر انیس صاحب کے کلام کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈھ کر لاتے

ہیں۔ میرزا دبیر اور میر انیس کے ہم مضمون اشعار لو، اگر میرزا صاحب کے ہاں غریب اور ثقیل الفاظ ہوں گے تو اُن کے مقابلہ میں میر صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہوں گے اور اگر میرزا صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہوں گے تو میر صاحب کے ہاں فصیح تر ہوں گے، میرزا دبیر کی تخصیص نہیں، تمام مرثیہ گویوں کے مقابلہ میں میر انیس کے کلام کا یہی حال ہے۔

ہم مثال کے طور پر دو چار شعر نقل کرتے ہیں، جن سے فصاحت اور فصاحت کے اختلاف مراتب کا اندازہ ہو سکے گا۔

میرزا دبیر	ع	کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں
میر انیس	ع	سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں
میرزا دبیر	ع	آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو
میر انیس	ع	آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو
میرزا دبیر	ع	رویا ہیں بھی حسینؑ کو رویا ہی کرتے ہیں
میر انیس	ع	حسرت ہے کہ خواب میں بھی رو دیا کیجئے
میرزا دبیر	ع	جیسے مکان سے زلزلہ میں صاحب مکان
میر انیس	ع	جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

(ابتذال) فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ سادہ، آسان، کثیر الاستعمال ہو، اس لئے لوگ مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ ان دونوں میں

سفید و سیاہ کا فرق ہے، میرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں، اکثر اُن کے کلام میں مبتذل الفاظ آجاتے ہیں۔

مثلاً جہاں حضرت شہر بانوؑ نے حضرت عباسؑ کی لاش پر نوحہ کیا ہے، شہر بانوؑ کی زبان سے فرماتے ہیں ع۔
ہے ہے مرے دیور مرے دیور مرے دیور ۔۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ع ناڑہ نو آن کی سالگرہ کا نکال لا ۔۔
ابتذال کی صاف اور بیّن مثال، نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے اگر یہ میز نہ ہوتا تو سادگی اور صفائی میں نظیر کا کلام میر انیس یا میر تقی سے ٹکر کھاتا۔

ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں وہ مبتذل ہیں لیکن یہ صحیح نہیں، سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا، ابتذال کا معیار مذاقِ صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں، مذاقِ صحیح خود بتا دیتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل، پست اور سوقیانہ ہے۔

میر صاحب کو اگرچہ واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ہر قسم کی جزئی جزئی واقعات اور حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ اُن کی انتہا درجہ کی قادر الکلامی ہے کہ پھر بھی اُن کی شاعری کے دامن پر ابتذال کا دھبہ نہیں آنے پاتا۔

کلام کی فصاحت یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی، لیکن کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے اُن کی ساخت، ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اُس کو خاص تناسب اور توازن ہو، ورنہ فصاحت قائم نہ رہیگی۔ قرآن مجید میں ہے،
ما کذب الفؤاد ما رای - فواد اور قلب دو ہم معنی الفاظ ہیں، اور دونوں فصیح ہیں، لیکن اگر اس آیت میں فواد کے بجائے قلب کا لفظ آئے تو خود یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا، جس کی وجہ یہ ہے کہ گو قلب کا لفظ بجائے خود فصیح ہے لیکن ماقبل اور مابعد کے جو الفاظ ہیں اُن کی آواز کا تناسب، قلب کے لفظ کے ساتھ نہیں ہے۔
میر انیس کا مصرعہ ہے ع فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور۔
صحرا اور جنگل ہم معنی ہیں اور دونوں فصیح ہیں، میر انیس نے جا بجا اِن دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے اور ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کیا ہے، لیکن اگر اس مصرعہ میں صحرا کے بجائے جنگل کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا، میر صاحب کا ایک شعر ہے سہ

طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

یہاں جنگل کے بجائے صحرا لاؤ تو مصرعہ پھس پھسا ہو جاتا ہے۔

شبنم اور اوس ہم معنیٰ ہیں اور برابر درجہ کے فصیح ہیں۔ لیکن میر صاحب کے اس شعر میں سے

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائے گی، لیکن یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے۔ اس مصرعہ میں ع شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے۔

شبنم کے بجائے لاؤ تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے اس لئے یہ ضرور ہے کہ جن الفاظ کے سلسلہ میں وہ ترکیب دیا جائے اُن آوازوں سے اُس کو خاص تناسب بھی ہو ورنہ گویا دو مخالف سُروں کو ترکیب دینا ہوگا، نغمہ اور راگ مفرد آوازوں یا سُروں کا نام ہے، ہر سُر بجائے خود دلکش اور دلاویز ہے، لیکن اگر دو مخالف سُروں کو باہم ترکیب دے دیا جائے تو دونوں مکروہ ہو جائیں گے۔

راگ کے دلکش اور مؤثر ہونے کا گُر یہی ہے کہ جن سُروں سے اُس کی ترکیب ہو اُن میں نہایت تناسب اور توازن ہو۔

الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صوت اور سُر ہیں، اس لئے اُن کی لطافت، شیرینی اور روانی اُسی وقت تک قائم رہتی ہے جب گرد و پیش کے الفاظ بھی لئے ہیں اُن کے مناسب ہوں۔

میرزا دبیر صاحب کا مشہور مصرعہ ہے ع زیرِ قدم والدہ فردوسِ بریں ہے۔

اس میں جتنے الفاظ ہیں یعنی زیر۔ تقدم۔ والدہ۔ فردوس۔ بریں سب بجائے خود فصیح ہیں۔ لیکن اُن کے باہم ترکیب دینے سے جو مصرعہ پیدا ہوا ہے وہ اس قدر بھدّا اور گراں ہے کہ زبان اُس کا تحمل نہیں کر سکتی، شاید تم کو خیال ہو کہ مصرعہ کی ترکیب چونکہ فارسی ہو گئی ہے، اس لئے ثقل پیدا ہو گیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں، سیکڑوں شعروں میں اس قسم کی فارسی ترکیبیں ہیں، لیکن یہ ثقل نہیں پایا جاتا۔ مثلاً میر انیس صاحب کہتے ہیں ؎

میں ہوں سردارِ شبابِ چمنِ خلدِ بریں
میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمدؐ کا مکیں

پہلے مصرعہ میں فارسی ترکیب کے علاوہ توالیِ اضافات بھی موجود ہے، لیکن یہ بھدّا پن اور ثقل نہیں ہے۔

جب کسی مصرعہ یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسب توازن اور توافق پایا جاتا ہے، اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود بھی فصیح ہوتے ہیں تو وہ پورا مصرعہ یا شعر فصیح کہا جاتا ہے، اور یہی چیز ہے جس کو بندش کی صفائی، نشست کی خوبی، ترکیب کی دلآویزی، برجستگی، سلاست اور روانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی چیز ہے جس کی نسبت خواجہ حافظ فرماتے ہیں ؎

آں راکہ خوانی اُستاد گر بنگری بہ تحقیق
صنعت گر است امّا شعرِ رواں ندارد

الفاظ کے توازن و تناسب سے کلام میں جو فرق پیدا ہو جاتا ہے وہ
ایک خاص مثال میں آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ میر انیس حضرت
علی اکبرؑ کے اذان دینے کی تعریف ایک موقع پر اس طرح کرتے ہیں ع

تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

اسی مضمون کو میر صاحب دوسرے موقع پر اس طرح ادا کرتے
ہیں ع

بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسولؐ میں

وہی مضمون ہے وہی الفاظ ہیں، لیکن ترتیب کی ساخت نے
دونوں شعروں میں کس قدر فرق پیدا کر دیا ہے۔

میر انیس کا تمام کلام اس خوبی سے معمور ہے اور اُن کا ہر شعر اس
وصف کا مصداق ہے، نمونہ کے طور پر ہم چند اشعار اس موقع پر نقل
کرتے ہیں ؎

تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں — قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرّے کی چمک مہرِ منور سے ملا دوں — کانٹوں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

برہم ہوئے یہ سنتے ہی عباسؑ خوش خصال ولہ — غازی کو شیرِ حق کی طرح آ گیا جلال
قبضہ پہ ہاتھ رکھ کے یہ بولا علیؑ کا لال — اب یاں سے ہم کو کوئی ہٹا دے یہ کیا مجال
حملہ کریں جو بڑھ کے اگر آستین کو

ہم آسماں سمیت اُلٹ دیں زمین کو

تھا فوجِ قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر — تھیں موج کی طرح سب اُدھر کی صفیں اِدھر
چکّر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور — پانی میں تھے نہنگ اُبھرتے نہ تھے مگر
فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

چھایا تھا سب پہ رعبِ علمدارِ نوجواں — تسلیم کو جھکے ہوئے تھے فوج کے نشاں
گوشہ اماں کا ڈھونڈ رہی تھی ہر اک کماں — ترکش بھی تھے ہراس سے کھولے ہوئے زباں
تیروں کا بیگماں تھا ارادہ گریز کا
منہ کند ہو گیا تھا ہر اک تیغِ تیز کا

آگے چل کر کہتے ہیں ؎

تب شمر نے کہا کہ فصاحت سے کیا حصول — بیعت انہیں تو صلح ہمیں کبھی نہیں قبول
غازی نے پکارا او نجس و مرتد و جہول — لیجیو نہ منہ سے نام جگر گوشۂ رسولؐ
سمجھا ہے کیا امام عراق و حجاز کو
گدّی سے کھینچ لوں گا زبانِ دراز کو

تو کیا ہے اور کیا ہے ترا وہ امیرِ شام — کرتے ہیں بادشاہ کہیں بیعتِ غلام
تو بھی نمک حرام ہے وہ بھی نمک حرام — او بے ادب یزید کجا! اور کجا امام!!
دوزخ سے دور رہتے ہیں ساکن بہشت کے
کعبہ کبھی جھکا نہیں آگے کنشت کے

تاہم اِدھر تھا جشن میں تھے اہلِ شر اُدھر — ولے بجتے تھے شادیانۂ فتح و ظفر اُدھر

انعام بانٹتا تھا ہر اک کو عمر ادھر — روتے تھے دیکھ دیکھ کے حضرت ادھر اُدھر

غل تھا کہ بس حسینؑ بہت روئے بھائی کو

کوئی جواں ہو اور تو بھیجو لڑائی کو

باقی نہیں کوئی تو دغا کو خود آیئے — حیدرؑ کی ذوالفقار کے جوہر دکھایئے

زخم سنان و خنجر و شمشیر کھایئے — گرمی بڑی ہے آج لہو میں نہایئے

آمادہ ہم تو دیر سے بہر ستیز ہیں

تیغیں بھی ہیں آبی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

صابر بڑے ہیں آپ تو یا شاہِ انس و جاں — اک بھائی کے فراق میں یہ نالہ و فغاں

رونے سے جی اٹھیں گے نہ عباسؑ نوجواں — حضرت پکارتے ہیں کسے بھائی اب کہاں

ملتا ہے کب جہاں میں بھلا جو گذر گیا

اب فکر اپنی کیجئے وہ شیر مر گیا

اکبرؑ نے کی غضب کی نظر سوئے فوجِ شام — کانپے یہ غیظ سے کہ اُگلنے لگی حسام

کی عرض ہاتھ جوڑ کے اے قبلۂ انام — سنتے ہیں آپ لشکرِ اعدا کے یہ کلام

خوں اب تو جوش کھاتا ہے ہنگام جنگ ہے

مولا بس اب تو حوصلۂ صبر تنگ ہے

برچھا ادھر شقی نے لیا دیکھ بھال کے — ولہ اکبرؑ ادھر سنبھل گئے بھالا سنبھال کے

روکے کسے جواب کسے دے کدھر پھرے — ولہ بجلی کے ساتھ ساتھ کہاں تک سپر پھرے

سب نشۂ غرورِ جوانی اتر گیا — ولہ تلوار تھی کہ حلق سے پانی اتر گیا

کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا ترکیب الفاظ کے لحاظ سے

[illegible]

شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اجزا کی جو اصلی ترتیب ہے وہ بحال خود قائم رہے، مثلاً فاعل، مفعول، مبتدا، خبر، متعلقات فعل جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں یہی ترتیب شعر میں بھی قائم رہے۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ شعر میں اس ترتیب کا بعینہٖ قائم رہنا قریب قریب ناممکن ہے صرف ایک آدھ شعر یا بہت سے بہت شعر دو شعر میں اتفاقیہ یہ بات پیدا ہو جاتی ہے مثلاً سعدی کے یہ اشعار ؎

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوئے دلاویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہمنشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

لیکن چونکہ نظم کا درحقیقت سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہیں تو نہ ہو سکے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہے، اس بنا پر شاعر کو کوشش کرنی چاہیے کہ اگر اصلی ترتیب پوری پوری قائم نہیں رہ سکتی تو بہر حال اس کے قریب قریب پہونچ جائے جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائے گا، اسی قدر شعر زیادہ صاف، برجستہ، رواں اور ڈھلا ہوا ہوگا اور اردو میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ صفت میر انیس صاحب سے زیادہ کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی، نمونہ کے طور پر ہم چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں :۔

حضرت زینب حضرت امام علیہ السلام سے کہتی ہیں ؎

قربان گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت   تپ کی کبھی ہے شدت میں کئی روز سے خفت
بستر سے میں خود اٹھ کے ٹہلتی بھی ہوں حضرت   پانی کی کبھی خواہش ہے نہ کل بھی ہے رغبت
حضرت کی دعا سے مجھے صحت کا یقین ہے
اب تو مرے منہ کا بھی مزہ تلخ نہیں ہے

صغریٰ نے کہا آپکی باتوں کے میں قربان   ولہ تم جان بچالو کہ میں لونڈی ہوں پھوپی جان
بیٹی ہو علیؑ کی میری مشکل کرو آسان   جیتی رہی صغریٰ تو نہ بھولے گی یہ احسان
کچھ بات بجز گریہ وزاری نہیں کرتیں
اماں تو سفارش بھی ہماری نہیں کرتیں

حضرت زینبؑ، حضرت عباسؑ سے فرماتی ہیں ؎

تم سے بڑی امید ہے زہراؑ کی جائی کو   بھیا تمھیں سے لیگی بہن اپنے بھائی کو

حضرت امام علیہ السلام یزیدیوں سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں ؎

مجھکو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو   تیر جو ڈرے ہیں جو تم نے تو خطا کرتے ہو
کیوں نبی زادہ پہ غربت میں جفا کرتے ہو   دیکھو اچھا نہیں یہ ظلم جو کرتے ہو
شمع ایماں ہوں اگر سر میرا کٹ جائیگا
یہ مرقع ابھی اک دم میں الٹ جائیگا

خولی امام علیہ السّلام کی فوج کی حالت، ابن سعد سے بیان کر رہا ہے ؎

یہ سب غلط سنا تھا کہ ہے لشکر کثیر   کچھ نوجواں ہیں طفل ہیں کچھ اور کچھ ہیں پیر
ہیں ان میں سات آٹھ تو لڑکے کئی صغیر   پس جائینگے وہ ٹاپوں سے ہنگام دار و گیر

کیا چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طاقت دکھائیںگے
اِن سے تو نیمچے بھی سنبھالے نہ جائیں گے

کیا جانے ول میں سوچ تھے کیا شاہِ کربلا — مقتل میں کھینچکر انھیں لے آئی ہے قضا
لشکر تو یہ قلیل اور اس فوج سے وغا — عمریں ہیں چھوٹی چھوٹی بھلا وہ لڑینگے کیا

کچھ آزمودہ کار نہیں کچھ سن نہیں
اِن کے ابھی تو گھر سے نکلنے کے دن نہیں

اس قسم کے اور ہزاروں اشعار ہیں، آگے مختلف موقعوں پر جو اشعار نقل کئے جائیں گے اُن میں اور دوسری خوبیوں کے ساتھ یہ خصوصیت بھی اکثر نظر آئیگی۔

روزمرّہ اور محاورہ جو الفاظ اور جو خاص ترکیبیں اہل زبان کے بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوتے ہیں اُن کو روزمرّہ کہتے ہیں، روزمرّہ اگرچہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ فصاحت ہی کا ایک فرد خاص ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ عام بول چال میں وہی الفاظ زبان پر آئیں گے جو سادۂ صاف اور سہل الادا ہوں، اور اگر اُن میں کچھ ثقل اور گرانی بھی ہو تو رات دن کی بول چال اور کثرت استعمال سے وہ منجھ کر صاف ہو جاتے ہیں۔ ابو العلا معرّی جو ایک ملحد شاعر تھا اُس نے قرآن مجید کا جواب لکھا تھا۔ لوگوں نے اُس سے کہا کہ یہ کلام بلیغ ہے لیکن اس میں قرآن مجید کی سی روانی اور صفائی نہیں پائی جاتی، اُس ملعون نے کہا ہاں ابھی تو نہیں، لیکن جب دو چار سو برس

نمازوں میں منجھ کر صاف ہو جائے گا تو روانی آ جائیگی۔

غرض روزمرہ کے لئے فصیح ہونا لازم ہے۔ میر انیس کے کلام میں نہایت کثرت سے روزمرہ اور محاورہ کا استعمال پایا جاتا ہے، اور اس پر اُن کو ناز بھی تھا چنانچہ فرماتے ہیں ؎

مرغانِ خوش الحان چمن بولیں کیا
مر جاتے ہیں سُنکے روزمرہ میرا

چونکہ میر انیس کا کوئی کلام روزمرّہ سے خالی نہیں ہوتا، اس لئے ہم نمونہ کے طور پر صرف دو چار مثالیں نقل کرتے ہیں ؎

حشر تک خلق میں یہ ذکر غم انگیز رہا
تو تو بچپن کے غلاموں سے کبھی کچھ نہ رہا

تعریف کریں ڈر کے تو خوددار نہ ہونا
اعدا سے کسی بات میں تم نثار نہ ہونا

زینب نے کہا جس میں رضائے شہ عالی
مالک ہیں وہی ہیں تو ہوں اک چاہنے والی

صدقے گئے فرزند پھوپھی سوگ نشیں ہے
سمجھیں تو میرا حق ہے نہ سمجھیں تو نہیں ہے

زندہ نہ محمد ہے نہ اب عون ہے بیٹا
تم بھی جو نہ پوچھو تو مرا کون ہے بیٹا

خادم جدا نہ تھا شہ گردوں سریر سے
ولہ کس جرم پر حضور خفا ہیں حقیر سے

کسکی مجال ہے جو کہے گا یہ کیا کیا؟
ولہ بی بی نے دی غلام کو رخصت بجا کیا

کہتے تھے راہ میں نہ کہ وار اپنا چل گیا
ولہ افسوس ہے کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا

مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال | حسن کلام کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کئے جائیں۔

لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے اور آواز کے مختلف اقسام ہیں مُہیب،
پُررعب، سخت، نرم، شیریں، لطیف، اسی طرح الفاظ بھی صوت اور وزن
کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے ہیں، بعض نرم، شیریں، اور لطیف
ہوتے ہیں بعض سے جلالت اور شان ٹپکتی ہے، بعض سے درد اور
غمگینی ظاہر ہوتی ہے، اسی بنا پر غزل میں سادہ، شیریں، سہل اور لطیف
الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، قصیدہ میں زور اور شاندار الفاظ کا استعمال
پسندیدہ سمجھا جاتا ہے، اسی طرح رزم، بزم، مدح و ذم، فخر و ادّعا، وعظ و پند،
ہر ایک کے لیے جدا جدا الفاظ ہیں، شعرا میں سے جو اس نکتہ سے
آشنا ہیں وہ ان مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں، اور یہ اُن کے کلام کی تاثیر
کا بڑا راز ہے، لیکن جو اس فرق مراتب سے واقف نہیں یا ہیں لیکن
ایک خاص رنگ اُن پر اس قدر چڑھ گیا ہے کہ ہر قسم کے مضامین میں
ایک ہی قسم کے الفاظ اُن کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، اُن کا کلام بجز
ایک خاص رنگ کے بالکل بے اثر ہوتا ہے۔ یہی نکتہ ہے کہ سعدی
سے رزم، اور فردوسی سے بزم نہیں نبھ سکتی۔

میر انیس صاحب نے رزم، بزم، فخر، ہجو، نوحہ، سب کچھ لکھا
ہے لیکن جہاں جس قسم کا موقع ہوتا ہے اُسی قسم کے الفاظ اُن کے
قلم سے نکلتے ہیں رزمیہ فخر لکھتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

جلال اور غیظ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں ؎

کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے ۔۔۔ نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

کیا جانے کس نے روک دیا ہو دلیر کو ۔۔۔ سب وحشت کو سمجھتا ہے غصہ ہی شیر کو

تھا یہ پھرا ہوا عباس سا شیر جواں ۔۔۔ سینہ پہ رکھ کے دیتا تھا ہنس کے سناں

لرزہ تھا رعب حق سے ہر اک نابکار کو ۔۔۔ روکے تھا ایک شیر جری دس ہزار کو

دیکھو ان اشعار میں جو الفاظ آئے ہیں، جس طرح اُن کے مفہوم میں غیظ و غضب ہے اسی طرح الفاظ کی صوت و لہجہ سے بھی ہیبت اور غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔

بحروں کا انتخاب اور حسن قافیہ و ردیف

شعر کی دلاویزی اور دلفریبی کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ ہر مضمون کی مناسب بحریں اختیار کی جائیں، فردوسی کی اسی غلطی نے اس کے یوسف زلیخا کو مقبول عام ہونے سے محروم رکھا۔ شاہنامہ کی بحر رزم کے لئے مخصوص ہے، فردوسی نے عشقیہ واقعات بھی اسی بحر میں ادا کرنے چاہے، اور اس وجہ سے ناکام رہا۔ میر انیس سے پہلے مرثیے اکثر بڑی بڑی بحروں میں لکھے جاتے تھے مثلاً ع

جب تک بھر کے نہر سے عباس غازی گھر چلے،

ع آپ تو جیتے رہے بابا کا سر کٹوا دیا،

یا نہایت چھوٹی بحروں میں

ع یہ کس منہ سے کہیے کہ وہ تشنہ لب ہے،

میر صاحب نے تین چار بحریں خاص کر لیں جن میں چند خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ رزم و بزم، دونوں کے لئے موزوں تھیں، مثلاً یہ بحر، حشر برپا تھا کہ تیغ حُرزِ بجاہ چلی۔

۲۔ فقروں کی ترکیب اُن میں خواہ مخواہ چست ہو جاتی ہے مثلاً یہ بحر،

ع قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں۔

۳۔ کانوں کو خوش معلوم ہوتی ہیں۔

قدیم مرثیوں میں ردیف کا بہت کم التزام ہوتا تھا، قافیہ ہی قافیے ہوتے تھے، میر صاحب نے ردیف کا گویا التزام کر لیا۔ آج کل جو لوگ انگریزی شاعری کی کورانہ تقلید کرتے ہیں وہ تو سرے سے قافیہ ہی کو بیکار کہتے ہیں، ردیف کا کیا ذکر ہے، شاید انگریزی زبان کی ساخت اسی قسم کی ہو جیسا کہ عربی میں ردیف نہایت بدنما معلوم ہوتی ہے، لیکن فارسی اور اُردو میں تو ردیف تال اور سَم کا کام دیتی ہے، جس طرح راگ میں تال نہ ہو تو بے مزا ہے، یہی حالت اُردو شعر کی ہے۔ البتہ ردیف کے التزام کے لئے بہت بڑا قادر الکلام ہونا ضروری ہے، ورنہ ردیف کے التزام کے ساتھ آمد اور بے ساختگی قائم نہیں رہتی، لیکن اگر یہ خوبی ہاتھ سے نہ جانے پائے تو ردیف سے شعر چمک جاتا ہے، ان دونوں شعروں پر غور کرو۔

ساقیا عید ہے، لا بادہ سے مینا بھر کے کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے

چاہنا خلق کو صہبا و صنم سے محروم ولہ ایسی نیت پہ بہشت آپ کو واعظ معلوم

دونوں شعر اپنی اپنی حیثیت سے لاجواب ہیں، لیکن پہلے شعر کو ردیف نے کس قدر چمکا دیا ہے۔ بعض جگہ ردیف کی تکرار نہایت لطف پیدا کر دیتی ہے، میر صاحب کے ہاں اِس کی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ حسن قافیہ و ردیف و تکرار کی یکجائی چند مثالیں، ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں ؎

کہیں صفیں صاف مگر منہ کی صفائی ہو گئی ولہ سیکڑوں خون کئے اور کہیں آئی ہو گئی

شیطان عمر سعد کی گردن پہ چڑھا ہے ولہ بھاگو پسرِ شیرِ خدا رن پہ چڑھا ہے

رُکتا نہ تھا علیِ ولی کے پسر کا ہات ولہ دو ہو کے گر پڑا جسے مارا کمر کا ہات

ہل چل یہ تھی کہ باپ نہ ٹھیرا پسر کے ساتھ ولہ اُس معرکہ میں چھوٹ گئے عمر بھر کے ساتھ

ڈھالوں سے پھول لگئی پھولوں سے زر لیا ولہ اپنا خراج تیغ نے اُن سب سے بھر لیا

سب تھک گئے مگر نہ تھکے تیغ زن کے ہاتھ ولہ وہ معرکہ رہا اِسی گلِ پیرہن کے ہاتھ

ظالم شکار بن گیا گیہاں خدیو کا ولہ کافر وہ تھا تو ہاتھ بھی مارا جنیو کا

ماتم ادھر تھا جشن میں تھے اہلِ شر اُدھر بجتے تھے شادیانۂ فتح و ظفر اُدھر
انعام بانٹتا تھا ہر اک کو عمر اُدھر ولہ روتے تھے دیکھ دیکھ کے حضرت اِدھر اُدھر

پہچانتے تھے خوب پیمبر مرے جوہر مخفی نہیں جبریل امین پر مرے جوہر
کھولے ہیں یداللہ نے اکثر مرے جوہر ولہ کرّار نے دیکھے ہیں مکرر مرے جوہر

کیا کیا چمک دکھائی تھی سر کاٹ کاٹ کے تنی تھی کیا تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پیے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے ولہ دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے

بڑھتے تھے جو پرے سے بڑے بول بول کے — پہلے انھیں کو مار لیا رول رول کے
حملہ کیا جو تیغ دو دم تول تول کے — ولہ ہتھیار سب نے پھینک دیے کھول کھول کے
شمر کے غضب سے مانگتی تھی ہر کماں اماں — مضطر زمیں تھی، مانگتا تھا آسماں اماں
دیتے نہ تھے کسی کو امام زماں اماں — ولہ ہر صف میں تھا یہ شور کہ مولا اماں اماں

تنسیق الصفات | جب کسی موقع پر چند الفاظ ایک وزن یا ایک قسم کے پے در پے آتے ہیں تو ایک خاص لطف پیدا ہوتا ہے، میر صاحب کے کلام میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں ؎

دوزخ کی زبانوں سے بھی آنچ اسکی تری تھی — برچھی تھی کٹاری تھی سروہی تھی چھری تھی
موجود بھی ہر غول میں اور سب سے جدا بھی — دم خم بھی لگاوٹ بھی صفائی بھی ادا بھی
اک گھاٹ پہ تھی آگ بھی پانی بھی ہوا بھی — ولہ امرت بھی ہلاہل بھی مسیحا بھی قضا بھی
کوفہ میں کبھی معرکہ دن بھر لشکر آیا — ولہ شمر آیا۔ سناں آیا۔ حر آیا۔ عمر آیا
سمٹا چھپا۔ اڑا۔ ادھر آیا۔ ادھر گیا — ولہ چمکا۔ پھرا۔ جمال دکھایا۔ ٹھہر گیا
چلتی تھی عجب رنگ سے شمشیر قضا رنگ — ہر بات میں دکھلاتی تھی اعدا کو نیا رنگ
چم خم کا جدا رنگ تھا کس بل کا جدا رنگ — ولہ لب سرخ۔ دہن صاف، بدن گول ہرا رنگ

بلاغت

انیس و دبیر کے موازنہ میں یہ فقرہ ضرب المثل ہو گیا ہے کہ میر صاحب میں فصاحت زیادہ ہے اور مرزا صاحب میں بلاغت، لیکن یہ فقرہ جس قدر

زیادہ مشہور ہے اُسی قدر بلکہ اُس سے زیادہ غلط اور بے معنی ہے،
بلاغت کی جو تعریف تمام کتابوں میں مذکور ہے اور جس سے کسی کو کسی قسم
کا اختلاف نہیں، اُس کی رو سے بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ کلام فصیح ہو،
اس لئے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دینا اجتماع النقیضین ہے،
اگر مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہے تو اُس کے یہ معنی ہیں کہ فصاحت
بھی زیادہ ہے کیونکہ کلام اُس وقت تک بلیغ نہیں ہو سکتا جب تک
اُس کے تمام الفاظ، مفردات و مرکبات فصیح نہ ہوں، اگر فصاحت میں
کسی قسم کی کمی ہو گی تو بلاغت میں بھی کمی ہو گی، اس لئے کسی کلام کی
نسبت یہ کہنا کہ اس میں بلاغت زیادہ ہے اور فصاحت کم، گویا یہ کہنا
ہے کہ فصاحت زیادہ بھی ہے اور کم بھی۔

بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے یہ کی ہے کہ کلام اقتضائے
حال کے موافق ہو، اور فصیح ہو، اقتضائے حال کے موافق ہونا، ایسا جامع
لفظ ہے جس میں بلاغت کے تمام انواع و اسالیب آجاتے ہیں، لیکن
افسوس ہے کہ کتب معانی مثلاً مطول، ایضاح، وغیرہ میں بلاغت کی
جو تشریح کی ہے اور اُس کے جس قدر انواع و اقسام قرار دیے ہیں،
وہ نہایت جزئی اور معمولی باتیں ہیں، اِن تصریحات کی رو سے بلاغت
اُس کا نام ہے کہ مبتدا اور خبر کہاں مقدم لائے جائیں اور کہاں موخر؟
کہاں معرفہ ہوں کہاں نکرہ؟ کہاں مذکور ہوں، کہاں محذوف؟ اسناد
کہاں حقیقی ہو، کہاں مجازی؟ جملہ کہاں خبریہ ہو کہاں انشائیہ؟ دو فقروں

میں کہاں وصل ہو کہاں فصل؟ کلام میں کس موقع پر اطناب کیا جائے کس موقع پر اختصار؟ گویا **بلاغت** کا صرف اس قدر فرض ہے کہ جب تم کسی مطلب کو کسی خاص جملہ میں ادا کرنا چاہو تو وہ یہ بتا دے کہ جملہ کے اجزا کیا ہونے چاہئیں اور اُن اجزا کی ترکیب کیا ہونی چاہیئے، لیکن اگر عام طور پر یہ پوچھا جائے کہ کس قسم کے مضامین کو کیونکر ادا کرنا چاہیئے، مثلاً مدح۔ ذم۔ فخر۔ ہجا۔ تہنیت۔ تعریض۔ شوق۔ محبت۔ ان مضامین سے ہر ایک کے ادا کرنے کے کیا کیا خاص پیرائے ہیں؟ ہر مضمون کا خاکہ قائم کرنا چاہیئے؟ کس قسم کے خیالات کس خاص مضمون کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں؟ تو موجودہ فن بلاغت اس کے متعلق کچھ رہبری نہیں کرسکتا، حالانکہ بلاغت کا اصلی تعلق مضامین ہی سے ہے نہ الفاظ سے۔ مثلاً یہ امر کہ ایک واعظ کو کسی بات کے ثابت کرنے کے لئے کس قسم کے مقدمات سے کام لینا چاہیئے؟ اور اسی بات کو اگر ایک حکیم ثابت کرنا چاہے تو اُس کے استدلال کا کیا طرز ہوگا؟ اس میں الفاظ کی حیثیت سے بحث نہیں ہوتی بلکہ صرف نوعیت استدلال کا لحاظ ہوتا ہے، یعنی اگر ایک حکیم کے استدلال میں واعظانہ مقدمات پائے جائیں تو کہا جائے گا کہ خلافِ بلاغت ہے کیونکہ بلاغت کے معنی مقتضائے حال کے موافق کلام کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک حکیم کو واعظانہ مقدمات سے استدلال کرنا، اُس کے رتبہ کے خلاف ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ بلاغت کو الفاظ سے چنداں تعلق نہیں،

محض مضامین کو بھی بلیغ یا غیر بلیغ کہا جا سکتا ہے، بلاغت الفاظ درحقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے، اصلی اور اعلیٰ درجہ کی بلاغت، معانی کی بلاغت ہے۔

میر انیس صاحب کے کلام میں بلاغت الفاظ بھی اگرچہ انتہا درجہ کی ہے، لیکن یہ اُن کے کمال کا اصلی معیار نہیں، اُن کے کمال کا اصلی جوہر معانی کی بلاغت میں کھلتا ہے۔

کربلا کے واقعات، جو میر انیس اور تمام مرثیہ گویوں کا موضوع شاعری ہے، جہاں تک تاریخ و روایت سے ثابت ہیں نہایت مختصر ہیں، لیکن مرثیہ گویوں نے اُن میں نہایت وسعت پیدا کی ہے۔ بعض جگہ محض ایک اجمالی واقعہ مذکور تھا، اس کو اس قدر وسعت دی کہ واقعہ کے تمام جزئیات بیان کر دیئے۔ بعض جگہ روایت میں اُس واقعہ کا نام و نشان بھی نہ تھا، لیکن اس لحاظ سے کہ وقت اور حالت کے اقتضا سے اُس واقعہ کا پیش آنا ضرور تھا، واقعہ کو فرض کر لیا ہے اور پھر اُس کو اس طرح پھیلا کر لکھا ہے کہ گویا پورا واقعہ بعینہٖ روایتوں میں مذکور تھا۔

مثلاً یہ واقعہ کہ جب حضرت عباس کو علم ملا تو عونؓ و محمدؓ کو رنج ہوا کہ یہ ہمارا حق تھا، وہ اپنی ماں حضرت زینب کے پاس شکایت لیکر گئے، انھوں نے سمجھایا کہ امام علیہ السلام نے جو کچھ کیا بجا کیا" یہ واقعہ نہایت تفصیل سے تمام جزئیات کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ کتب تاریخ میں سرے سے اس کا ذکر نہیں، یا مثلاً حضرت علی اکبرؓ کی تیاری جنگ کے

وقت حضرت زینبؑ کا آزردہ ہونا اور جانے سے روکنا، یا مثلاً حضرت شہربانو کا حضرت علی اکبر سے اس بات پر ناراض ہونا کہ امام علیہ السلام کو تنہا چھوڑ کر کیوں چلے آئے، ان تمام واقعات کا تاریخ میں پتہ نہیں، اس قسم کے واقعات کے بیان کرنے میں بلاغت کا پہلا فرض یہ ہے کہ جو واقعہ فرض کیا جائے وہ ایسا ہو کہ وقت اور حالت کے لحاظ سے اس کا واقعہ ہونا یقینی ہونے کے برابر ہو، اس کے ساتھ واقعہ کے جزئیات اور کیفیات جو بیان کئے جائیں وہ بالکل مقتضائے حال کے موافق ہوں، اور اس طرح بیان کئے جائیں کہ واقعہ کی صورت آنکھوں میں پھر جائے

اس نکتہ کی حقیقت، ایک مثال سے زیادہ تر واضح ہوگی، مرزا دبیر صاحب نے ایک مرثیہ میں، یہ واقعہ باندھا ہے کہ جب حضرت علی اکبر جوان ہوئے تو جابجا ان کے حسن و جمال کا شہرہ ہوا، یہاں تک کہ بادشاہان وقت نے اپنے اپنے ملک سے مصور بھیجے کہ ان کی تصویر کھینچکر لائیں، حلب کا بادشاہ سب سے زیادہ مشتاق ہوا اور جب تصویر اس کے پاس پہنچی تو اس نے فوراً اپنی بیٹی سے حضرت علی اکبر کی نسبت ٹھہرائی، اور حضرت امام حسینؑ کے پاس پیغام بھیجا، امام ممدوح نے اپنی بے اطمینانی کی حالت بیان کی اور اخیر میں لکھا ہے

اکبر کا بیاہ خالق اکبر کے ہاتھ ہے
بابا کے ہاتھ ہے نہ برادر کے ہاتھ ہے

لیکن بادشاہ حلب نے باوجود اس کے نسبت ٹھہرا ہی دی، اور

شادی کے تمام سامان مہیا کرنے شروع کردیے، ادھر کربلا کا واقعہ
پیش آیا جب بادشاہ کو خبر پہونچی تو وہ مع اپنے خاندان کے کربلا پہنچا
بادشاہ کی لڑکی نے جو حضرت علی اکبر سے منسوب تھی اس طرح
نوحہ کیا ہے

آئی ہوں گھر سے بال پریشاں کئے ہوئے
دولہا اٹھو کھڑی ہے دلہن سر کھلے ہوئے
دولہا تمہاری بے وطنی پر نثار ہیں — دولہا تمہاری بے کفنی پر نثار ہیں
دولہا تمہاری تشنہ لبی پر نثار ہیں — دولہا تمہاری کم سخنی پر نثار ہیں
مروے کا ذکر کرتے ہیں سب شور و شین سے
اکبر بیان تمہارے کروں کیا میں بین سے
خوش ہو کے مطلع ہمیں میں سوختہ جگر — اکبر کہیں میں اپنے گھر سے آئی تمہارے گھر
ہم چوڑیاں پہنتے نہ پائی ہیں لحد پر — جو آج ٹھنڈی کرتی ہوں صاحب کی لاش پر
حسرت ہی عقد کی رہی لونڈی کے باپ کو
اکبر یہ سہرا معاف ہو بخشوں میں آپ کو
دولہا میں ننگے سر ہوں مجھے کم سے اڑھاؤ — دولہا کہاں میں بیٹھوں بچھونا مجھے بتاؤ
دولہا مجھے بھی فاطمہ کے پاس لیتے جاؤ — دولہا برابر اپنے مری قبر بھی بناؤ
دولہا مقام شرم ہے در دو نہ پھیر دو
پردہ دلہن کا رکھ لو کھلے سر نہ پھیر دو

مرزا صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فرنگی مردوں کی زبانی

ایک بڑا نوحہ الگ لکھ کر مرثیہ کے ساتھ بطور ضمیمہ کے شامل کیا ہے،
جس کا مطلع یہ ہے؎

کس عادل و منصف کی میں دوں رو کے دہائی ہے ہے مرے نوشاہ
سنتی ہے دولھن شکل رنڈاپے نے دکھائی ہے ہے مرے نوشاہ

یہ تمام قصہ بالکل بلاغت اور مقتضائے حال کے خلاف ہے،
تمام باتوں سے قطع نظر کرکے ایک کنواری لڑکی کا بین اور نوحہ کرنا جو خود
کہتی ہے کہ میں آپ کے عقد میں نہیں آئی اور پھر دولھا دولھا پکارتی
جاتی ہے کس قدر بے معنی اور لغو ہے۔

میر انیس نے سیکڑوں ہزاروں مرثیے لکھے ہیں، اور ہر مرثیہ
بجائے خود ایک قصہ یا حکایت ہے لیکن کوئی واقعہ ایسا نہیں
لکھا جو اقتضائے حال کے خلاف ہو، عون و محمد کی روایت کا
سرے سے کہیں پتہ نہ تھا، لیکن جب میر انیس نے اس کو مرثیہ
میں لکھا تو تمام لوگوں کو اس کی واقعیت کا دھوکا ہوا یہاں تک کہ
ایسا وہ بطور ایک واقعہ مسلمہ کے تمام مرثیہ گویوں کے ہاں مختلف
پیرایوں میں بیان کیا جاتا ہے، اسی طرح میر انیس نے جس قدر
واقعات لکھے ہیں باوجود رقت انگیز اور مؤثر ہونے کے، واقعیت
کے قالب میں اس قدر ڈھلے ہوئے ہیں کہ کہیں سے ان پر
حرف گیری نہیں ہو سکتی۔

مرثیوں میں جو مضامین قدر مشترک کے طور پر ہیں وہ یہ ہیں،

آمادگی سفر، راہ کی تکلیفات اور صعوبتیں، قیام گاہ کا انتظام، دشمنوں کی روک ٹوک، معرکہ کی طیاریاں، رزم آرائی، رجز، حریفوں کا قتال و جدال، دشمنوں کی فتح، اہل حرم کی بیکسی اور بیچارگی، شام کا سفر، قید خانہ، دربار کی حاضری۔

ان میں سے ہر عنوان کے ادا کرلے کے لئے **بلاغت** کے خاص خاص طریقے ہیں، مثلاً سفر کی طیاری کے بیان کرلے ہیں بلاغت کا یہ اقتضا ہے کہ سفر کے وقت، جو جو واقعات، اور حالات پیش آتے ہیں، ان کی تصویر کھینچی جائے، سفر کی آمادگی، سواریوں کی تقسیم زادِ سفر کا انتظام، محملوں اور کجاوں کی تیاری، مستورات کے پردہ کا انتظام، دوست اور احباب کے وداعی جذبات، بھائی بہنوں اور عزیزوں کی گریہ وزاری، دلدہی اور صبر کے کلمات، یہ تمام باتیں تفصیل سے بیان کی جائیں اور اس طرح کی جائیں کہ آنکھوں کے سامنے بعینہ سفر کا نقشہ پھر جائے، میر انیس نے جہاں جہاں سفر کا بیان کیا، ان نکتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔

دو حریفوں کی باہمی معرکہ آرائی کو اس طرح بیان کرنا چاہیئے کہ پہلے دونوں کے سراپا، ڈیل ڈول، اور اسلحۂ جنگ سجنے کا نقشہ دکھایا جائے، پھر بتایا جائے کہ دونوں نے فن جنگ کے کیا کیا ہنر دکھائے، حریف نے حریف پر کیوں کر حملہ کیا، کس طرح وار بچایا، تلوار کے کیا کیا ہاتھ دکھائے، بند کیوں کر باندھے، وغیرہ وغیرہ

میر انیس کے ہاں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں، بخلاف اسکے مرزا دبیر صاحب آسمان و زمین کے قلابے ملا دیتے ہیں، لیکن یہ پتہ نہیں لگتا کہ دونوں حریفوں میں سے کسی نے دوسرے پر وار بھی کیا تھا یا نہیں۔

غرض ہر واقعہ، اور ہر معاملہ کے بیان کرنے میں بلاغت کا یہ اقتضا ہے کہ اس کی تمام خصوصیات، اس طرح دکھائی جائیں کہ دلوں پر وہی اثر طاری ہو جو خود واقعہ کے پیش آنے سے پڑتا، میر انیس کے کلام میں عموماً یہ وصف پایا جاتا ہے ہم نے اس موقع پر مثالیں اس لئے قلم انداز کیں کہ آگے چل کر، واقعہ نگاری، اور اظہار جذبات وغیرہ کے عنوانوں میں جو مثالیں آئیں گی وہی بلاغت کے لئے بھی کافی ہونگی۔

بلاغت کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ واقعات کے بیان میں جس درجہ و رتبہ، اور جس سن و سال کے لوگوں کا ذکر آئے، اسی قسم کے طرز خیال، اور طریق ادا کو ملحوظ رکھا جائے، بوڑھے، بچے، جوان، مرد، عورت، کنواری، بیوہ، آقا، غلام، نوکر چاکر، غرض جس کی زبان سے جو خیال ظاہر کیا جائے اس کی زبان اور طرز خیال کی تمام خصوصیتوں کو قائم رکھا جائے، میر انیس نے تمام مرثیوں میں یہ نکتہ ملحوظ رکھا ہے، مثلاً حضرت امام حسینؑ کے سفر کے وقت، محلہ کی بی بیاں حضرت زینبؑ کو سفر سے روکتی ہیں ؎

سب کہتے ہیں زینبؑ سے کہ اے شاہ کی شیدا   کس طرح کے خط آئے یکایک یہ ہوا کیا؟

پانی کی کمی، گرمی کے دن، خوف کا رستہ　　وہ دھوپ پہاڑوں کی، وہ لوں اور وہ صحرا
کیا سوچ کے اس فصل میں شبیرؑ چلے ہیں
بچوں پہ کرو رحم کہ نازوں کے پلے ہیں

ہر گز ابھی چھ مہینہ کے بھی بچے کا سفر ہے　　کچھ تم کو پہاڑوں کی بھی گرمی کی خبر ہے؟
غربت میں جوانوں کے تلف ہونے کا ڈر ہے　　رحم اس پہ ہو لازم کہ یہ بچہ گل تر ہے
اصغرؑ کو جدا کر کے ہو تعلق ماں کو سوا ہو،
گرمی کے سبب دودھ جو گھٹ جائے تو کیا ہو؟

ایک اور موقع پر اسی مضمون کو ادا کیا ہے ۔

لے لے کے بلائیں یہی سب کرتی ہیں تقریر　　اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیرؑ
سمجھاتی نہیں بھائی کو اے شاہ کی ہمشیر　　مسلمؑ کا خط آلے تو کریں کوچ کی تدبیر
للہ ابھی قبر پیمبرؐ کو نہ چھوڑیں
گھر فاطمہؑ زہرا کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

یہ مثلاً جب حضرت امام حسینؑ اپنی چھوٹی صاحبزادی صغریٰ کو سفر میں لے جانے سے انکار کرتے ہیں تو وہ حضرت زینبؑ سے سفارش کراتی ہیں ۔

صغرا نے کہا آپکی باتوں کے ہیں قربان　　تم جان بچا لو کہ میں لونڈی ہوں پھوپی جان
بیٹی ہو علیؑ کی، مری مشکل کرو آسان　　جیتی رہی صغرا تو نہ بھولے گی یہ احسان
کچھ بات بجز گریہ و زاری نہیں کرتیں
اماں تو سفارش بھی ہماری نہیں کرتیں

دوسروں کی محبت کا طعنہ

پیاری ہیں جو دو بیٹیاں وہ جائینگی ہمراہ — کیا آس کہ میں گور کنارے بھی تو ہوں آہ
بابا کو نہ اماں کو نہ بہنوں کو مری چاہ — سب جیتے رہیں خیر ہمارا بھی ہے اللہ
بھولے سے نہ اب خاطرِ ناشاد کریں گے
میں قبر میں جب ہونگی تو سب یاد کریں گے

خاص عزیزوں کی شکایت

عاشق میرے مشہور ہیں بھیا کئے میں واری — وو دن سے خبر بھی نہیں لی آکے ہماری
قاسم کو غرض کیا جو سنیں گریہ و زاری — میں کون ہوں سکینہ ہیں چچا جان کو پیاری
اللہ تو ہے گر کوئی غمخوار نہیں ہے
مٹی مری کچھ قبر کو دشوار نہیں ہے

یا مثلاً حضرت اصغر کے پیاس سے جاں بلب ہونے کے وقت
اُن کی ماں کی حالت اس طرح بیان کی ہے ؎

چلاتی تھی بکھرائے ہوئے بالوں کو مادر — دولت مری لٹتی ہے اُجڑتا ہے مرا گھر
فریاد ہے اے لختِ دلِ ساقیِ کوثر — آنکھیں کبھی جھپکتے نہیں اب تو علی اصغر
کیا ہو گیا ہے اس صاحبِ اقبال کو میرے
ہے ہے لئے جاتی ہے اجل لال کو میرے

یا مثلاً حضرت امام حسینؑ کی رخصت کے وقت شہربانو فرماتی
ہیں ؎

کچھ حق میں اس کنیز کے فرما کے جایئے
صاحب! کسی جگہ مجھے بٹھلا کے جایئے

یا مثلاً جب حضرت امام حسینؑ کربلا میں پہنچے اور وہاں اُترنے

کا ارادہ کیا، تو حضرت زینبؑ اس مقام کی وحشت اور ویرانی سے گھبرا کر فرماتی ہیں ؎

کیوں چلتے چلتے آپ نے یاں روک لی لگام بھیّا اِدھر تو آؤ یہ ہے کون سا مقام؟
بستی بھی ہے کوئی کہ یہی ایک نہر ہے
اس دشت پر خطر میں اُترنا تو قہر ہے

جنگل میں ہے بسر کیا، ہے سو طرح کا ڈر اُٹھتے ہیں بار بار بگولے اِدھر اُدھر
دن کٹ گیا تو ہوئیگی شب کسطرح بسر لشکر میں غل رہے گا درندوں کا رات بھر
بچے بھی مارے ہول کے تر ہیں پسینے میں
میرا تو دل ابھی سے اُچھلتا ہے سینے میں

اسی واقعہ کو ایک اور موقع پر لکھا ہے ؎

بھائی سے اس زمیں کی سنی ہی بہت صفت ہے وہ امام واقفِ اسرارِ شش جہت
جو جو مسن ہیں اُن سے بھی لازم ہے مشورت صادقے گئی حبیب سے بھی کر لو مصلحت
ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو
بھیّا مجھے یہ ڈر ہے کہ رد و بدل نہ ہو

یا مثلاً جب امام حسینؑ نے حضرت عباسؑ کو علم دیا ہے تو حضرت زینبؑ، عباسؑ کو مبارکباد دیتے ہوئے فرماتی ہیں ؎

گھر میں سلامت آئیں گے جب سرورِ اُمم تب دوں گی تم کو تہنیتِ عہدۂ علم
ہاتوں کو جوڑتی ہے یہ بہنا اسیرِ غم کیجو صلاح صلح اگر لشکر اِدھر ہے کم
تم سے بڑی اُمید ہے زہرا کی جائی کو

بھیا تمھیں سے لیگی بہن اپنے بھائی کو

اسی موقع پر سکینہؑ مبارکباد کو آتی ہیں، تو اُن کے صغر سن
کے لحاظ سے اُن کی مبارکباد دینے کو کس پیرایہ میں ادا کیا ہے ؎

اتنے میں پاس آکے سکینہ نے یہ کہا　　چہرہ کی لوں بلائیں میں صدقے جھکو ذرا
عہدہ علم کا تم کو مبارک ہو اے چچا!　　میں نے دعائیں کی ہیں کہو مجھکو دوگے کیا
میداں کا رخ کروگے کہ دریا پہ جاؤ گے
کیا اب کبھی نہ تم پاس ہمارے بٹھاؤ گے

"جھکو ذرا" کی بلاغت پر لحاظ کرو اور دعا کے صلہ مانگنے کو دیکھو۔

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں۔

چلاتی ہے سکینہ کہ اچھے مرے چچا　　محمل میں گھٹ گئی ہے گودی میں لو ذرا
بابا سے کہہ دو اب کہیں خیمہ کریں بپا　　ٹھنڈی ہوائیں لیکے چچا تم پہ میں فدا
سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ آب ہے
تم تو ہوا میں ہو مری حالت خراب ہے

بچوں کی بول چال سے قطع نظر، یہ دیکھو کہ بچوں کی فطرت کو کس نکتہ سنجی
سے ظاہر کیا ہے، بچوں کی مدعا طلبی کا بڑا آلہ طعن اور تعریض ہے اُس
کو کس خوبی سے ادا کیا ہے، ع تم تو ہوا میں ہو، مری حالت خراب ہے
ایک اور موقع پر جب حضرت عباسؑ لڑنے کے لئے چلے ہیں اور
سب لوگ تن بہ تقدیر اُن کو رخصت کر چکے ہیں، تو حضرت سکینہ کو خبر ہوتی
ہے، وہ گھبرا کر روکنے کے لئے آتی ہیں، اور بچپن کے ناز سے کہتی ہیں۔

خیمہ میں ہوا غل کہ چلے حضرت عباسؑ سب بولے کہ لو اور بھی سرور ہوئے بے آس
گھبرا کے سکینہ نے کہا تب یہ صد یاس یہ کہتے ہو تم مجھکو تو جانے دو چچا پاس
منہ تشنہ سے وہ موڑ سینگے نہ مانوں گی کبھی میں
تم تو مجھے چھوڑ سینگے نہ مانوں گی کبھی میں
عباسؑ پکارے میں اس آواز کے قربان ہم جاتے ہیں پانی کیلئے آؤ میری جان
دامن سے لپٹ کر یہ لگی کہنے وہ نادان ہیں گھر سے تمھیں جانے نہ دونگی کسی عنوان
بابا کا مرے کوئی مددگار نہیں ہے
صدقے گئی پانی مجھے درکار نہیں ہے

یا مثلاً جب حضرت عباسؑ کے شہید ہونے کی خبر آئی ہے اور
لوگ بدحواس ہو رہے ہیں حضرت عباس کی زوجہ نے یہ خبر نہیں سنی
ہے لیکن قرینوں سے اُن کو شبہ ہوتا ہے اُن کے بدحواسانہ استفسار
کو یوں ادا کیا ہے ؎

کہتی تھی یہ گھبرائی ہوئی زوجہ عباسؑ کیوں بی بیو بچے مرے کیا ہو گئے بے آس
کیا کہتے ہیں شاہ شہدا کس سے ہوئی آس اے وائے مقدر نہ سکینہ کی بجھی پیاس
کیسی خبر آئی ہے کہ جی کھوتے ہو لوگو
تم سب مرا منہ دیکھ کے کیوں روتے ہو لوگو

اس مصرعہ میں ع اے وائے مقدر نہ سکینہ کی بجھی پیاس
کس قدر ایثار نفس کا خیال ظاہر کیا ہے یعنی اپنے شوہر کے مرنے کا
غم اپنی مصیبت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ

وہ سکینہ کے لیے پانی نہ لا سکے اور اُن کی پیاس نہ بجھا سکے۔

یا مثلاً جب حضرت علیؑ اکبر نے ماں سے اجازت لے کر میدانِ جنگ میں جانے کا ارادہ کیا ہے اور حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ پھوپی سے بھی تو اجازت لو، اُس وقت حضرت زینبؑ فرماتی ہیں ؎

زینبؑ نے کہا جس میں رضائے شہِ عالی   میں نے تو کوئی بات نہیں منہ سے نکالی
کیا غم ہے نہ پوچھا مجھے، ماں سے تو رضا لی   مالک ہیں وہی میں تو ہوں اک چاہنے والی
صدقے گئے فرزند، پھوپی سوگ نشیں ہے
سمجھیں تو مرا حق ہے نہ سمجھیں تو نہیں ہے

بچپن میں یہ کاہے کو مری چھاتی پہ سوئے   کب جاگی ہیں تا صبح جو یہ چونک کے روئے
کنگھی نہیں کی گیسوئے مشکیں نہیں دھوئے   اِن کے لئے کب میں نے پسر ہاتھ سے کھوئے
کیوں روتے ہیں یہ کس لئے حضرت کو قلق ہے
حق دار ہیں کا ہے کو، مرا کون سا حق ہے

حضرت علیؑ اکبر کو حضرت زینبؑ ہی نے پالا تھا، اور وہ اُن کو اپنے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں، حضرت علی اکبر بھی، ہر بات میں اُنہی کا منہ دیکھتے رہتے تھے، چونکہ اُن کو معلوم تھا کہ حضرت زینب میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت بڑی مشکل سے دیں گی، اس لئے اُنھوں نے پہلے اپنے ماں باپ سے اجازت لی ہے کہ اور لوگ اجازت دے دیں تو حضرت زینبؑ سے درخواست کرنے کے لئے سند ہاتھ آئے، اتنے میں

حضرت امام حسین علیہ السّلام نے فرمایا کہ پہیلی سے بھی تو اجازت لو، وہ بھری ہوئی بیٹھی تھیں، اُن کی طعن آمیز تقریر کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

یا مثلاً جب یزید کی بیوی ہند نے قید خانہ میں اہلِ حرم کے دیکھنے کے لئے جانا چاہا ہے، تو لونڈیوں اور پیش خدمتوں کی تقریر کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

سب عورتوں کو لیکے چلی جب وہ حق شناس — کہنے لگیں یہ تب جو کنیزیں تھیں آس پاس
کپڑے یہ مانگے ہیں بدل ڈالئے لباس — اُس نے کہا کہ ہے مرے دل پر ہجوم یاس
اک دم میں سوگواروں کو میں دیکھ آتی ہوں
کیسا لباس، کیا کسی شادی میں جاتی ہوں

جب وہ قید خانہ کے دروازہ پر پہونچی ہے تو ؎

بڑھ کر کسی کنیز نے تب یہ کیا بیاں — بی بی! کوئی اسیروں میں زندہ نہیں یہاں
چلئے محل میں آپ بھلا جائینگی کہاں — قابل نہیں حضور کے جانیکے یہ مکان
گر غش ہوئی تو آپ میں آیا نہ جائے گا
ہم سے تو اس خرابہ میں جایا نہ جائے گا

لونڈیاں، ہند کو قید خانہ میں جانے سے روکنا چاہتی ہیں، اس غرض کے حاصل کرنے کے لئے پہلے تو یہ کہا کہ یہاں کوئی زندہ نہیں، پھر یہ کہ مکان آپ کے جانے کے قابل نہیں، پھر اس میں مبالغہ کا یہ اسلوب کہ آپ کو اختیار ہے لیکن ع ہم سے تو اس خرابہ میں جایا نہ جائے گا۔

اِسی مضمون کو ایک اور مرثیہ میں اس طرح باندھا ہے کہ دربانوں نے اس خیال سے کہ قید خانہ میں امام زین العابدینؑ بھی ہیں اور وہ غیر محرم ہیں، اہلِ حرم کی طرف مخاطب ہو کر کہا ہے ؎

یا تو بیمار کی آنکھیں آپ ہی بند کریں (قیدی)
یا ہم آکر کسی حجرہ میں جدا بند کریں

غور کرو لونڈیوں اور پیش خدمتوں کی خوشامدانہ فطرت کا کس طرح اظہار کیا ہے، اور دربانوں کی تحقیرانہ فرمائش کس قدر دلدوز ہے کہ بانو زین العابدینؑ کی آنکھیں بند کر دو، یا ہم آکر کسی حجرہ میں اُن کو بند کر دیں۔

یا مثلاً جب حُر نے اپنے بھائی، بیٹے اور غلام سے مشورہ کیا ہے کہ کس کا ساتھ دینا چاہیئے تو انھوں نے یوں جواب دیا ہے ؎

بیٹے نے کہا شہ کی غلامی ہے سعادت — آنکھوں سے چلینگے کہ یہ ہے عین عبادت
بھائی نے کہا کفر ہے حاکم کی اطاعت — کچھ ڈر نہیں، بس آج سے کی ترکِ رفاقت
مظلوم سے، دو روز کے پیاسے سے لڑیں ہم
کیا خوب! محمدؐ کے نواسے سے لڑیں ہم

عبدِ حرِ غازی نے کہا تول کے شمشیر — گر لاکھ ہوں جانیں تو نثارِ سرِ شبیر
دنیا میں نہ ہوگا عمرِ سعد سا بے پیر — کہیئے تو کروں اُسکے مٹا دینے کی تدبیر
حافظ ہے خدا، زور سے تلوار کے چلیئے
اُس فوج میں چلیئے تو اُسے مار کے چلیئے

دیکھو بھائی اور بیٹے نے جو کہا اور جو ارادہ کیا، اُن کو اجازت طلبی کی ضرورت نہیں بخلاف اس کے غلام کہتا ہے کہ ع کہئے تو کروں اس کے مٹا دینے کی تدبیر یہ وہی غلامانہ اندازِ گفتگو ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس فعل کو بھی اپنی طرف نہیں منسوب کرتا بلکہ کہتا ہے ع اُس فوج میں جائیے تو اُسے مار کے چلئے،

یا مثلاً جب حضرت عباسؑ میدان جنگ کو جا رہے ہیں تو اُن کی زوجہ حضرت شہربانو سے کہتی ہیں ؎

کہتی ہے رو کے بانو سے عالم سے بار بار
ہم کو تباہ کرتے ہیں عباس نامدار
ہے لونڈیوں کے باب میں بی بی کو اختیار
کچھ آپ بولتی نہیں اس وقت میں شمار
کہئے جو روکنے کی کوئی اِن سے راہ ہو
اب عنقریب ہے کہ مرا گھر تباہ ہو

اسی طرح کہتے کہتے آخیر میں کہتی ہیں ع

بی بی میں کیا کروں مرے بچے صغیر ہیں۔ دیکھو بیقراری کی معذرت میں کس قدر حسرت بھری ہوئی ہے، حضرت عباسؑ نے زوجہ کی یہ حالت دیکھی تو اُن کو روکا ؎

عباس دیکھتے ہیں جو زوجہ کا اضطرار
ہوتا ہے تیرِ غم جگرِ ناتواں کے پار
روتے ہیں خود وَلے یہ اشارہ ہے بار بار
شوہر کے غم میں یوں کوئی ہوتا ہے بیقرار
آؤ ادب سے دلبرِ زہرؑا کے سامنے
روتی ہیں لونڈیاں کہیں آقا کے سامنے

یا مثلاً جب حضرت عباسؑ، حضرت امام حسینؑ کے اصرار اور امتثالِ امر

کی بنا پر دریا سے ہٹ آئے تو حضرت عباسؑ کی شجاعانہ حسرت کو اس طرح ادا کیا ہے۔

شجاعانہ حسرت

کہتے تھے راہ میں کہ نہ زور اپنا چل گیا
افسوس ہے کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا

یا مثلاً حضرت عباس نے جب حضرت امام حسینؑ سے خیمہ نصب کرنے کے متعلق دریافت کیا ہے تو ؎

کچھ سوچ کر امام دو عالم نے یہ کہا — زینبؑ جہاں کہیں وہیں خیمہ کر دیا
پیچھے ہٹا یہ سنتے ہی عباسؑ باوفا — جا کر قریب محمل زینبؑ یہ دی صدا
حاضر ہے جان نثار امام غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا؟

سعادتمند چھوٹا بھائی عباسؑ کس ادب سے بڑی بہن سے خطاب کرتا ہے

یا مثلاً حضرت زینبؑ نے علی اکبر کو حضرت عباسؑ کے بلانے کے لئے بھیجا ہے تو وہ جا کر مؤدبانہ طریقہ سے حضرت عباس سے کہتے ہیں ع

چلئے پھوپی نے یاد کیا ہے حضور کو

یا مثلاً جب یہ بحث پیدا ہوئی ہے کہ فوج کا علم کس کو دیا جائے تو حضرت عباسؑ کی بیوی اپنے شوہر کا استحقاق اس طرح بیان کرتی ہیں ؎

خادم شہ دیں کے ہیں تو عباسؑ علی ہیں
اس عہدہ کے لائق جو اگر ہیں تو وہی ہیں

"جو اگر" غلط ترکیب ہے لیکن مستورات کی زبان کی بعینہ نقل

کردینے نے وہ بات پیدا کر دی ہے جو صحیح لفظ سے پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

اس قسم کی صدہا مثالیں ہیں۔

بلاغت کا ایک نازک موقع وہاں پیش آتا ہے جہاں حریف مخالف کا ذکر کرنا ہوتا ہے، دشمن کو اگر حقیر اور ذلیل ثابت کیا جائے تو اس کے مقابلہ میں فتحمندی کا مرتبہ گھٹ جاتا ہے، اور شان و شوکت دکھائی جائے تو مذہبی خیال کے خلاف ہوتا ہے، ایسے مشکل موقع پر میر صاحب جس طرح ان دونوں مشکلوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں، اور مدح و ذم کو پہلو بہ پہلو رکھتے ہیں، اس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے ہوگا۔

بالا قد و کلفت، تنومند، و خیرہ سر روئین تن، و سیاہ دروں آہنی کمر
ناوک پیام مرگ کے، ترکش اجل کا گھر تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر
دل میں بدی، طبیعت بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

ساتھ آسکے اور آسی قد و قامت کا ایک یل آنکھیں کبود، رنگ سیہ، ابروؤں پہ بل
بدکار و بدشعار و ستمگار و پُر دغل جنگ آزما بھگائے ہوئے لشکروں کے دل
بھالے لئے، کسے ہوئے کمر میں سنان پر
نازاں وہ حرب گر زپہ، یہ تیغ تیز پر

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں ؎

نکلا وہ تنکے غیظ میں اک پہلوان رزم گیتی کے چار دانگ میں تھی جس شقی کی دھوم
سرہنگ و پُر غرور و سیہ قلب و نحس و شوم لنگر سے جسکے ہل گئی، مقتل کی مرز و بوم

مرحب تھا کفر و شرک میں طاقت میں گیو تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا

چہرہ مہیب، غیظ سے آنکھیں لہو کی جام — تھرائے سام، خوف سے کانپے یہ دو حسام
موذی، سیاہ بخت، سیہ دل، سیاہ فام — کھاتا تھا لاکھ بل جو کوئی لے علیؑ کا نام
کندہ سقر کے قعر کا، پتلا گناہ کا
دشمن تھا خاندانِ رسالت پناہ کا

ٹکڑے کرے پہاڑ کو وہ گرز گاوسر — پہنے ہوئے زرہ پہ زرہ، بر میں بدگہر
زنجیرِ آہنی سے کسے جنگ پر کمر — منہ پھیرے جس سے تیغ وہ فولاد کی سپر
دستانے دونوں دستِ تعدی لپسنا پہ
پاکھر بھی آہنی تھی شقی کے سمند پر

ایک اور موقع پر سے

نکلا ادھر سے بہرِ وغا ایک روسیاہ، — زور آور و تہمتن و مغرور و کینہ خواہ
کاندھے پہ گرز، بر میں زرہ، خشمگیں نگاہ — سر پر مثالِ قبضۂ تیغ آہنیں کلاہ،
آمد شقی کی تھی کہ رواں رود نیل تھا
ہیبت میں تھا جو دیو تو ہیکل میں فیل تھا

واقعات کے بیان میں، بلاغت کا ایک بڑا ضروری اصول یہ ہے کہ کہیں سے سلسلۂ بیان ٹوٹنے نہ پائے، جب کوئی واقعہ مختلف اور متعدد واقعات پر مشتمل ہوتا ہے تو ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف منتقل ہوتے ہوئے اکثر بیان کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے، بارہا اور

بھرتی کے لفظ لانے پڑتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زبردستی
ایک واقعہ کا دوسرے سے پیوند لگایا ہے۔ مرزا دبیر صاحب کے
کلام میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، میر انیس کے اکثر مرثیے،
بہت سے متعدد واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں یہاں تک کہ اگر ان پر الگ
الگ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر واقعہ ایک جداگانہ مرثیہ کا موضوع
ہے لیکن تسلسل بیان کا یہ اثر ہے کہ تمام مختلف واقعات ایک مسلسل
زنجیر بن جاتے ہیں جس کی تمام کڑیاں آپس میں ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔
مثلاً حُر کا ایک مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں حسب ذیل مضامین

بیان کیے ہیں۔
حُر کی مدح وصفت۔ امام علیہ السلام اور اہل بیت کا میدان جنگ
میں آنا۔ دونوں طرف کی طیاریاں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا وعظ
اور اتمام حجت کی تقریر۔ عمر بن سعد کا حُر کی طرف مخاطب ہوتا اور دونوں
کے سوال و جواب۔ حُر کا امام حسینؑ کی طرف رُخ کرنا۔ حضرت امام حسین
علیہ السلام کا بزرگانہ استقبال۔ حُر کی عفو خواہی اور امام حسین علیہ السلام
کا عفو و کرم، حُر کا جنگ کے لئے اجازت طلب ہونا۔ میدان جنگ میں
جانا اور شہید ہونا۔ مرنے کے وقت حضرت امام حسینؑ کا حُر کے پاس
پہونچنا اور نزع کی گفتگو۔
یہ مرثیہ بہت بڑا ہے اور ہر واقعہ کو نہایت طول دے کر لکھا ہے۔
اس لئے پورا مرثیہ اس موقع پر نقل نہیں کیا جا سکتا، ہم صرف اُن موضوں

کے اشعار نقل کرتے ہیں جہاں ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف انتقال کیا ہے۔

مرثیہ حُر کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ تعریف کرتے کرتے لڑائی کا ذکر کرتے ہیں، ؎

وصفِ حُر میں ہے زباں معترفِ عجز و قصور　　آمد آمد کی بہادر کا کروں اب مذکور
جب ہوئی مستعدِ جنگ سپاہ مقہور　　مہر افلاکِ امامت نے کیا رن میں ظہور
غل ہوا جنگ کو اللہ کے پیارے نکلے
اے فلک دیکھ زمیں پر بھی ستارے نکلے

ہو گئے سرخ شجاعت سے رُخِ آلِ نبی　　آئی ٹھنڈی جو ہوا پھول گئے تشنہ لبی
رن میں کڑکا ہوا بجنے لگے باجے غضبی　　یکہ تازوں نے کیا شور مبارز طلبی
ایک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کاروں کی
برق ہر صف میں چلنے لگی تلواروں کی

برچھیاں تول کے ہر غول سے اسوار بڑھے　　نیزے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے خونخوار بڑھے
تیر جوڑے ہوئے چلوں میں کماندار بڑھے　　بولے شہ، یاں سے ابھی کوئی نہ زنہار بڑھے
(یہاں سے امام حسینؑ کا وعظ و تلقین کی طرف گریز ہے)

اسدِ حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں
میں نبی زادہ ہوں، سبقت مجھے منظور نہیں

یہ سخن کہہ کے مخاطب ہوئے اعدا سے امامؑ　　اے سپاہِ عرب و مصر و رے کوفہ و شام
تم پہ کرتا ہے حسینؑ آخری حجت کو تمام　　ہے سرِ مصحفِ ناطق ہوں سنو میرے کلام

سخن حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو
شور باجوں کا مناسب ہو تو موقوف کرو

امام حسینؑ کا وعظ نہایت تفصیل سے لکھا ہے اس کے بعد عمر بن سعد اور حُر کی مخاصمانہ گفتگو اور سوال و جواب کا بیان کرنا تھا، اس کے لئے ربط کلام کا یہ طریقہ نکالا کہ حضرت امام حسینؑ کے وعظ سے تمام فوج متاثر ہوئی یہاں تک کہ عمر بن سعد نے حُر کی طرف (ایک افسر فوج کی حیثیت سے) دیکھا کہ یہ کیا رنگ ہے، اس نے کہا امامؑ بالکل سچ کہتے ہیں۔ اسی طرح دونوں میں تکرار اور ردوکد کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس موقع کے اشعار یہ ہیں ؎

شہ کی مظلومی پہ گریاں ہوئی ظالم کی سپاہ — عمر سعد نے کی مڑ کے رُخ حُر پہ نگاہ
بولا وہ اشہد باللہ بجا کہتے ہیں شاہ — محسن و منعم و آقا ہے مرا وہ ذیجاہ
اُنکے احسان کا کیونکر کوئی منکر ہو جائے
سخن حق میں جو شک لائے وہ کافر ہو جائے

دونوں میں دیر تک ردّ و قدح ہوتی رہی، اب اس واقعہ کے بیان کرنے کا موقع آیا کہ حُر نے امام حسینؑ کی طرف رُخ کیا اور اُن سے جا کر مل گیا، اس کو یوں ادا کیا کہ عمر بن سعد حُر سے کہتا ہے کہ خبردار! اگر تو نے اُدھر جانے کا قصد کیا تو پرچہ نویس یزید کو خبر کر دیں گے، اور تیری جان پر آفت آ جائے گی، حُر جواب دیتا ہے ؎

عمل خیر سے بہکا نہ مجھے اے ابلیس — وہی کونین کا مالک ہے وہی ہیں [illegible]

کیا مجھے دیگا نڈر حاکم ملعون و خسیس　　کچھ تردد نہیں کہدے کہ کہیں چھپ تو نہیں

ہاں کسوے ابن شہنشاہ عرب جاتا ہوں

لے شتاب جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں

کہکے یہ داب سے غازی نے نکالی تلوار　　سرخ آنکھیں ہوئیں ابرو پہ بل آیا اک بار

تن کے دیکھا طرفِ فوجِ امامِ ابرار　　پاؤں رکھنے لگا تن تن کے زمیں پر رہوار

غل ہوا سید والا کا ولی جاتا ہے

سو طرفدار حسین ابن علی جاتا ہے

کیا دو تین رسالوں نے تعاقب ہر چند　　حر کا ہاتھ آنا تو کیسا ہے نہ کی گرد سمند

کہتے تھے ہاتھ میں وہ لیکے جو دوڑے تھے کمند　　یہ فرس تھا کہ چھلاوہ، یہ پری تھا کہ پرند

کیا سبک سوئے چمن باد بہاری پہونچی

ہم یہیں رہ گئے، واں حر کی سواری پہونچی

حضرت امام حسینؑ نے عباسؑ علمدار کو حر کے استقبال کو بھیجا،

اس کی تقریب یوں پیدا کی ہے

یاں ہوئے علم امامت سے شہ دیں آگاہ　　ہنس کے عباسؑ سے فرمایا کہ اے غیرت ماہ

میرے لشکر کی طرف ہے رخ حر ذی جاہ　　سب سے کہدو کہ نہ روکے کوئی اس شخص کی راہ

جا کے لینے کو عجب رتبہ شناس آتا ہے

میرا مہمان، مرا عاشق مرے پاس آتا ہے

اس کے بعد حر کی معذرت خواہی، حضرت امام حسینؑ کا عفو،

پھر حر کی طلبی اذن جنگ کو نہایت عمدگی اور پر اثر طریقہ سے ادا کیا

ہے۔ پورا مرثیہ پڑھو، اور جہاں جہاں ایک واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ شروع ہوتا ہے، اُن پر غور سے نظر ڈالتے جاؤ تو معلوم ہوگا کہ سلسلۂ تقریر کے زور سے مختلف واقعات کو کس خوبی سے ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔

بلاغت کی جزئیات۔ بلاغت کے جزء اسالیب، نہایت مختلف الصورۃ ہیں اور چونکہ ہر جگہ ایک نئی صورت پیدا ہوتی ہے اس لئے اُن کے کلیات مشکل سے قائم ہو سکتے ہیں، چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

مثال ۱: جب امام حسین علیہ السّلام کے تمام عزیز و اقارب و رفقا شہید ہو چکے ہیں تو اتفاق سے ایک راہرو کا ادھر گزر ہوا، وہ یہ عبرت انگیز موقع دیکھ کر ٹھہر گیا اور امام علیہ السّلام سے واقعہ کی کیفیت پوچھنی شروع کی، آپ نے اپنی مظلومی اور دشمنوں کی بے رحمی کی داستان سنائی، لیکن اپنا نام نہ بتایا، وہ آپ کا صورت شناس نہ تھا، لیکن قراین سے اُس کو اشتباہ ہوتا تھا کہ آپ خاندان نبوت سے تعلق رکھتے ہیں، بالآخر اُس نے کہا کہ ع اظہار اسم اقدس و اعلیٰ ہیں کیا ہرج ہے آپ نے جو کچھ اور جس طرح جواب دیا اُس کو اِس طرح ادا کیا ہے ؎

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

اس شعر میں بلاغت کے جو نکتے ہیں صرف مذاقِ صحیح اُن کا احاطہ کر سکتا ہے، تاہم جس حد تک بیان میں آ سکتا ہے ہم بیان کرتے

ہیں۔

موقع کی حالت یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ اپنا نام اس حیثیت کے ساتھ بتائیں جس سے کسی قدر شرف اور فضیلت کا اظہار ہو، تاکہ پوچھنے والا سمجھ سکے کہ یہ وہی امام حسین ہیں جن کا وہ غائبانہ دلدادہ اور مشتاق ہے، لیکن امام ممدوح کو خاکساری مانع آتی ہے، وہ اس پر اکتفا کرتے ہیں کہ میں حسین ابن علیؑ ہوں، لیکن چونکہ مستفسر قرائن سے اس حد تک پہونچ چکا ہے کہ محض نام لینے سے بھی غالبًا پہچان لے گا، اور اس لئے حسینؑ کہنا بھی گویا اپنے آپ کو، امام کہنا ہے، اس بنا پر نام لینا بھی ایک طرح پر شرف اور فضیلت کا اظہار ہے، اس لئے خالی نام لیتے ہوئے بھی آپ شرما جاتے ہیں اور شرم سے آپ کی گردن جھک جاتی ہے، اس بنا پر شاعر کہتا ہے کہ ع

مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

لیکن شاعر کو جو امام حسین علیہ السّلام کی عظمت کے اثر سے لبریز ہے، گوارا نہیں ہوتا کہ آپ کا نام اس سادگی سے لیا جائے، اس کے نزدیک امام علیہ السّلام اگر اپنے آپ کو بادشاہ مشرقین کہتے تو یہ کچھ خودستائی نہ تھی، بلکہ محض ایک واقعہ تھا، جس طرح رسول اللہ اپنے آپ کو رسول اللہ کہتے تھے اور یہ خودستائی نہیں خیال کی جاتی تھی، شاعر کے دل میں حسرت ہے کہ کاش امام نے بیان واقعہ ہی کیا ہوتا، اس کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے ع

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں

تاہم اس سے یہ خیال بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام کی عالی ظرفی اور شرافت نفس کا یہی اقتضا تھا کہ وہ خاکساری کو بیان واقعہ پر مقدم رکھتے۔

اس موقع پر یہ کہے بغیر رہا نہیں جاتا کہ اسی واقعہ کو مرزا دبیر صاحب نے اس طرح باندھا ہے ع فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ کی جو بحث ہے اس کے فیصلہ کے لئے دونوں کے صرف یہ دونوں مصرعے کافی ہیں،

مثال ۲، میدان کربلا میں امام علیہ السّلام یزیدیوں سے پہلے پہونچے تھے، اور نہر فرات کے قریب اترے تھے، یزید کی فوج پہونچی تو رئیس فوج نے امام علیہ السّلام کی فوج کو وہاں سے ہٹا دینا چاہا اور کہا کہ ؎

ہم گھاٹ روکنے کے لئے آئے ہیں ادھر
ہے آج شب کو داخلہ شمر کی خبر

اُن کی آمادگی اور شرارت دیکھکر، امام علیہ السّلام کے رُفقا برہم ہوئے، اس موقع کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں، ؎

بگڑے ابو ثمامہ و سعد فلک سریر ۔۔۔ بولی زہیر قین نے شمشیر بے نظیر
جوڑا کماں میں ابن مظاہر نے ایک تیر ۔۔۔ بولے اسد کہ زجر کے قابل ہیں یہ شریر
عابس کو غیظ لشکر بدخو پہ آگیا

غصہ سے بل ہلال کے ابرو پہ آگیا

اُلٹی جناب قاسم ذیشاں نے آستیں
قبضہ پہ ہاتھ رکھکے بڑھے اکبر حسیں
بولے پکڑ کے تھیجے زینب کے مہ جبین
شیروں سے کیا لڑائی کو لے لینگے اہل کین

ابو ثمامہ ۔ سعد ۔ زہیر وقین ۔ اسد ۔ عابس ۔ حضرت امام حسینؑ کے رُفقا میں سے تھے، حضرت قاسم بھتیجے، حضرت علی اکبر صاحبزادے، اور حضرت زینبؑ کے صاحبزادے آپ کے بھانجے تھے، اس موقع پر بلاغت یہ ہے کہ جن لوگوں کو جس قدر امام علیہ السّلام سے قرب تھا، اسی نسبت سے اُن کی طیش و آمادگی جنگ کی حالت دکھائی ہے، ابو ثمامہ اور سعد بگڑ کر رہ گئے، اسد نے کہا کہ یہ زجر کے قابل ہیں، عابس کو غصہ آگیا، ہلال کے ابرو پر بل پڑ گئے، زہیر قین نے تلوار تول لی، حضرت قاسمؑ نے آستین اُلٹی، حضرت علی اکبرؑ تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کے آگے بڑھے، زینبؑ کے صاحبزادوں نے تیغے سنبھال لیے، اس فرقِ مراتب کو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔

مثال ۳ ۔ جب تمام اعزہ اور احباب شہید ہو چکے، اور صرف علی اکبرؑ کا دم باقی رہ گیا، تو دشمنوں نے چاہا کہ امام حسین علیہ السّلام اُن کو بھی میدانِ جنگ میں بھیجیں تاکہ بیٹا باپ کی آنکھوں کے سامنے خاک و خون میں ملا دیا جائے، اس غرض سے اُنھوں نے اس طرح امام حسینؑ علیہ السّلام کو مخاطب کیا ۔

اعدا پکارتے تھے کہ یا شاہ دیں پناہ — باقی ہے اور کوئی کہ بس ہو چکی سپاہ
عباس سا تو اب کوئی ہوگا نہ خیر خواہ — بھیجو کسی کو جلد کہ ہم دیکھتے ہیں راہ
چنتے ہو گل پسر کو شہادت کے باغ سے
کب تک بچا سکے گا کلیجہ کو داغ سے

دنیا سے کوچ کر گئے عباس نامدار — اب بے چراغ ہے لحد شیر کردگار
حضرت کا صبر و شکر ہے عالم پہ آشکار — مثل خلیل کیجئے فرزند کو نثار
آہیں نہ بھریے بیٹے کے سر کو نہ روئیے
جب جائیں ہم کو کھو کے پسر کو نہ روئیے

بھائی کا داغ اور ہے داغ پسر اور — بازو کا درد اور ہے درد جگر ہے اور
قوت بدن کی اور ہے نور نظر ہے اور — سینہ کا زخم اور ہے درد کمر ہے اور
گر صبر ہے تو گود کے پالے کو بھیجئے
نیزوں میں اپنے گیسوؤں والے کو بھیجئے

دشوار ہے اگر غم فرزند نوجواں — مرنے کو آپ آئیے اے قبلۂ زماں
مشتاق تیر ہیں تبر و خنجر و سناں — جاں اپنی دیجئے جو ہے پیاری پسر کی جاں
اصغر سے کچھ غرض ہے نہ اکبر سے کام ہے
ہم کو تو آپ کے سر انور سے کام ہے

ان تمام اشعار میں دشمنوں کی طنز، تعریض اور اکسا کر علی اکبر کے بھجوانے کو کس بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے، طنز کا سب سے بڑا نکتہ یہ ہے کہ اس میں واقعیت کا پہلو موجود ہو کیونکہ سچا طعنہ

نہایت سخت اثر کرتا ہے، یہ امر کہ بیٹا بھائی سے زیادہ عزیز ہوتا ہے، ایک بدیہی بات ہے پھر اس دعوے کو متعدد تمثیلوں سے اور زیادہ قطعی کر دیا ہے یعنی بازو کے درد کو جگر کے درد سے کیا نسبت نہیں جسم کی طاقت پر آنکھوں کی بصارت کو ترجیح ہے، سینہ کے زخم سے کمر کے درد کو کیا نسبت ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے حضرت عباسؑ کو حضرت علی اکبرؑ سے پہلے میدان جنگ میں بھیج دیا تھا تو اس وجہ سے بھیجا تھا کہ عباسؑ کسی طرح گوارا نہیں کرتے تھے کہ ان کے ہوتے علی اکبرؑ پر آنچ آجائے لیکن دشمن اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ بیٹا بھائی سے زیادہ عزیز ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کی یہ لڑائی دینداری پر مبنی نہیں ہے، ورنہ خدا کی راہ میں بیٹے اور بھائی کی کیا تمیز تھی، بلکہ بیٹے کو خدا کی راہ میں پہلے نثار کرنا تھا جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے کیا تھا، پھر یہ ٹہوکا دیتے ہیں کہ آپ کا صبر اور تحمل تو مسلم الثبوت ہے، بیٹے کے لئے یہ بیقراری کیوں؟ ان طنزیہ فقروں میں جن الفاظ سے امام علیہ السلام کو خطاب کیا ہے، بالکل تعریض سے بھرے ہوئے ہیں، شاہ دیں پناہ۔ قبلۂ زماں۔ سر انور۔ ان سب الفاظ کے یہ معنی کہ آپ اپنے آپ کو ایسا سمجھتے ہیں۔

مثال ۴۔ واقعۂ کربلا کے بعد جب اہل بیت یزید کے دربار میں گئے ہیں تو یزید نے ان سے اس طرح خطاب کیا ہے، ۵

تخت کے سامنے رو تم ہوئے گئے جو اسیر ۔ دیکھ کر سید سجاد کو بولا وہ شریر
سرکشی کرکے تم سر پہ ہوئے مجھ سے شریر ۔ شکر کرتا ہوں کہ خالق نے کیا تم کو حقیر

سنبھلنے کا کہیں دنیا میں سہارا نہ رہا
پنجتن اٹھ گئے اب زور تمھارا نہ رہا

ہاں کہو آج حمایت کو تمہیں ہیں کہاں ۔ کیا ہوئے ابن علی حیدر صفدر ہیں کہاں
قید میں اسکی بہو آئی ہے تیغ بر ہیں کہاں ۔ ننگے سر زینب دلگیر ہے سرور ہیں کہاں

ذبح خنجر سے ہوا جو وہ پدر کس کا ہے
اک ذرا غور سے دیکھو کہ یہ سر کس کا ہے

ان اشعار میں یزید کے کفر اور ارتداد کو ایسے بلیغ اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے جس سے زیادہ خیال میں نہیں آسکتا، یزید کو تسلیم ہے کہ سید سجاد یعنی امام زین العابدین اور اہل حرم نہال نبوت کے شاخ و برگ ہیں، وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ان کا جو کچھ زور ہے، وہ جناب رسالت پناہ اور آل عبا کے بل پر ہے، باوجود اس کے اس بات پر مسرت ظاہر کرتا ہے کہ ان کا زور نہیں رہا جس کے یہ معنی کہ اس کو خود رسول اللہ کے دنیا میں نہ رہنے کی خوشی ہے۔ اس پر بھی اکتفا نہیں کرتا، بلکہ صاف صاف کہتا ہے کہ رسول اللہ کہاں ہیں؟ حسین کہاں ہیں؟ علی کہاں ہیں؟ حسن کہاں ہیں؟ ان سب پر طرہ یہ کہ ان باتوں پر خدا کے احسان کا ممنون ہے کہ اس نے اہل بیت کو خوار اور حقیر کیا، گویا یہ امر خود خدا کو پسند اور مرغوب

تھا۔ اخیر کا مصرع اک ذرا غور سے دیکھو کہ یہ سر کس کا ہے، بلاغت کی
جان ہے۔ غور سے دیکھنے کی فرمائش اس لئے ہے کہ امام زین العابدین
کے نزدیک حسینؑ اس پایہ کے شخص تھے کہ ان کے سر کا کاٹا جانا اور
یزید کے دربار میں حاضر کیا جانا عقل میں نہیں آسکتا اس لئے کہتا ہے
کہ شک ہو تو ذرا غور سے دیکھو، ذرا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہے۔

مثال ۵، ۵

ٹھہرا رہے تھے سن کے یہ تاکید خاص و عام — چیں بر جبیں قریب گیا حرِّ نیک نام
دیکھا کیا شقی یہ نہ حر نے کیا سلام — کافر سے کیا جھکے وہ خدا سے ہو جس کو کام
چیں بر جبیں قریب جو وہ شیر نر گیا
اللہ رے رعب حق کہ پسر سعد ڈر گیا

ڈر کر کہا عمر نے کہ اے حرِّ نامور — رن میں سوار تیرے رسالے کے ہیں کدھر
کتنے جوان صفوں میں ہیں کتنے ہیں نہر پر — حر نے کہا کہ مجھ کو کچھ اس کی نہیں خبر
دنیا میں زور اپنا ہے اور اپنا ہاتھ ہے
میں ہوں کسی طرف نہ کوئی میرے ساتھ ہے

کہنے لگا یہ حر سے بہ نرمی وہ حیلہ ساز — مدت سے ہے یزید کو تیری وفا پہ ناز
سر پہ نہ ہوں گے ہم سے کبھی سرورِ حجاز — اب بعد فتح اور بھی ہوگا تو سرفراز
دیر اس میں کیا جو امر قریب الوقوع ہو
تو مصلحت جو دے تو لڑائی شروع ہو

جو اس میں تیری رائے وہی ہے مجھے پسند — پانی تو تین دن سے ہے بدنصیبوں پہ بند

گھوڑے بہت ہیں یاورِ سلطانِ ارجمند پس جائیں گے اُٹھائے سواروں نے جب سمند

لشکر میں یاں چھ لاکھ دلاور جوان ہیں

واں ایک صف ہے جس میں بہتّر جوان ہیں

آمادہ قتلِ شاہ پہ ہیں سب جوان و پیر کہتا ہے اب سپر پسر شاہِ قلعہ گیر

کیوں برچھیاں حسینؑ پہ پہلے چلیں کہ تیر حر نے کہا کہ مجھ سے نہ پوچھ اے امیر

انساں کو اختیار ہے خود اپنے کام میں

مجھ کو شریک کرتا ہے قتلِ امام میں

یہ وہ موقع ہے کہ حر جو یزید کے رسالہ کا افسر تھا، اس بات پہ آمادہ ہو چکا ہے کہ یزید سے ٹوٹ کر امام علیہ السّلام کی فوج میں آجائے۔ یہ خبر سپہ سالار یعنی ابن سعد کو پہنچی تو وہ حر کو طلب کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کو رام کرکے اس ارادہ سے روک لے۔ باوجود اس کے کہ حر کے ارادہ کی خبر سن چکا ہے اور جب حر اس کے سامنے گیا تو سلام تک نہ کیا، تاہم ابن سعد اس تجاہل کے ساتھ پیش آتا ہے کہ گویا اس کو اس واقعہ کی مطلق خبر نہیں بالکل خالی الذہن ہو کر پوچھتا ہے ع

رن میں سوار تیرے رسالے کے ہیں کدھر

حر نہایت بے پروائی اور گستاخی سے جواب دیتا ہے۔ ابن سعد اس کو بھی نظر انداز کرتا ہے اور اس کھرے پر چڑھاتا ہے کہ یزید کو مدت سے تیری وفاداری پر ناز ہے۔ اس کے ساتھ یہ ثابت کرتا ہے کہ امام علیہ السّلام کسی طرح اس معرکہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ پھر کس استمالت سے کہتا

MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH
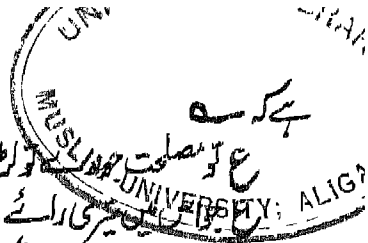
ہے کہ

ع تو مصلحت ہو دے تو لڑائی شروع ہو،

ع ہاں میری رائے وہی ہے مجھے پسند،

ع کیوں برچھیاں حسینؑ پہ پہلے چلیں کہ تیر،

گویا کوئی کام حُرؑ کے مشورہ کے بغیر کرتا نہیں چاہتا۔ اس کے ساتھ یہ ثابت کرتا جاتا ہے کہ امام علیہ السلام کی فوج نہایت کم ہے۔ کل ایک صف ہے اور اس میں بھی صرف بہتّر جوان ہیں، امام سے لڑنے کے لیئے کہتا ہے لیکن اُن کا نام جب لیتا ہے تو کبھی سرورِ حجازؑ کبھی سلطان ارجمند، کبھی شاہ کے لفظ سے خطاب کرتا ہے، یہ بھی استمالت کا ایک پہلو ہے کیونکہ اگر صاف صاف امام علیہ السلام کی برائی کی جائے تو ڈر ہے کہ حُرؑ بالکل ہتّے سے اُکھڑ جائے گا،

مثال ۲ ؎

رخصت طلب ہے شاہ سے اکبر سا لالہ فام شہزادہ مرتے جاتے ہیں سالم ہے یہ غلام

اللہ رو کیئے نہ اب اسے خواہرِ امام وہ امر کیجئے کہ ہو جس سے میرا نام

بیکس ہوں ساتھ ماں نہیں سر پہ پدر نہیں

میں آپ کا غلام تو ہوں گو پسر نہیں

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت زینبؑ کے دونوں صاحبزادے شہید ہو چکے ہیں، اور حضرت عباسؑ میدانِ جنگ میں جانا چاہتے ہیں لیکن حضرت زینبؑ روکتی ہیں، حضرت عباسؑ منت اور لجاجت کرتے ہیں کہ

للّٰہ نہ روکیے،

اس کے لیے کس قدر بلیغ پیرایہ اختیار کیا ہے، اوّل تو اُن کو خواہرِ امام سے مخاطب کیا ہے حالانکہ وہ حضرت عباسؑ کی بھی بہن تھیں، اس سے علاوہ اس کے کہ اُن کا احترام مقصود ہے خفیف سا اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ آپ کو مجھ سے وہ محبت نہیں جو حقیقی بھائی بہن میں ہوتی ہے، اور چونکہ درحقیقت حضرت زینبؑ ان کی حقیقی بہن نہ تھیں یہ تعریض زیادہ کارگر ہوتی ہے، پھر فرماتے ہیں کہ میں بیکس ہوں، نہ باپ سر پہ ہے نہ ماں ساتھ ہے سب سے کارگر یہ فقرہ ہے کہ ع

بی بی آپ کا غلام تو ہوں گو پسر نہیں

یعنی اگر آپ کا فرزند ہوتا تو مجھ کو بھی اسی طرح اجازت دیتیں جس طرح اپنے صاحبزادوں کو دی اور انھوں نے شہادت کی دولت حاصل کی۔

مثال نمبر ۶ ـــہ

بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمھیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام مدینہ منورہ سے روانہ ہو رہے ہیں، تمام خاندان کو ساتھ لیا ہے لیکن صغریٰ کو باوجود اس کے کہ آپ کی چہیتی بیٹی تھیں بیماری کی وجہ سے ساتھ نہیں لے جاتے۔ صغریٰ نہایت گریہ و زاری کرتی ہیں اور ایک ایک سے منت کرتی ہیں کہ مجھ کو بھی ساتھ لیتے چلیے لیکن کوئی حامی نہیں بھرتا، اس وقت علی اصغر

سے جوشش مادر بچے کو خطاب کر کے کہتی ہیں کہ اس وقت میرا اور کوئی
مددگار نہیں ہے، ایک تم ہو لیکن افسوس تم کو بولنے کی طاقت نہیں، تمام
لوگوں سے مایوس ہو کر ایک بچہ کا سہارا ڈھونڈنا اور پھر یہ خیال کہ وہ بولنے
کے قابل نہیں، انتہا درجہ کی حسرت اور ناکامی کی تصویر ہے۔

مثال ۸؎

استغاثہ یہ کیا حر نے جو با دیدۂ نم ۔۔۔ جوش میں آ گیا اللہ کا دریائے کرم
خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلا کے شہنشاہِ امم ۔۔۔ حر کو ہاتفِ غیبی نے صدا دی اس دم
شکر کر سبطِ رسول الثقلین آتے ہیں
اے برادر ترے لینے کو حسینؑ آتے ہیں

آخیر شعر میں امام حسین علیہ السلام کا نام جس سادگی سے لیا ہے
کمال بلاغت ہے، اس موقع پر اگر بہت سے اوصاف کے ساتھ اُن
کا نام لیا جاتا تو یہ بات حاصل نہ ہوتی، جب کوئی شخص کمالات و فضائل
میں انتہا کے رتبہ تک پہونچ جاتا ہے تو اس کے نام لینے کے
ساتھ اس کے تمام اوصاف اور کمالات خیال میں آجاتے ہیں، اُن
کے سادہ نام لینے سے اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہے، نظامی نے بھی
ایک موقع پر اس اسلوب کو برتا ہے، دارا نے جب سکندر کو خط لکھا
ہے تو سکندر کے دعوائے ہمسری پر نہایت تعجب اور افسوس ظاہر کیا
ہے، اس موقع پر کہتا ہے؎

فلک بیں چہ ظلم آشکارا کند ۔۔۔ کہ اسکندر آہنگ دارا کند

دارا نے یہ فرض کیا ہے کہ سکندر کی حقارت اور میری جاہ و عزت
اس قدر مسلّم عام ہے کہ صرف دونوں کا نام لے لینا کافی ہے۔ چنانچہ
کہتا ہے کہ آسمان کا یہ ظلم دیکھو کہ سکندر، دارا کے مقابلہ کا قصد کرتا
ہے، لیکن یہاں اس طرز بیان کا موقع نہ تھا اس لئے سننے والوں پر
کچھ اثر نہیں پڑتا۔ دارا کے زمانہ میں ممکن ہے کہ یہ حالت رہی ہو
لیکن آج سکندر کی عظمت و شان اس قدر مسلّم ہے کہ سکندر کے محض
نام لینے سے اس کی حقارت کا تصور نہیں ہوتا اس لئے شاعر (نظامی)
کو چاہیے تھا کہ وہ اور واقعات سے پہلے سکندر کی ذلت اور حقارت
ثابت کرتا، تب یہ طریقہ بیان مؤثر ہوتا، یہی موقع فردوسی کو بھی
عرب و عجم کے مقابلہ میں پیش آیا۔ چونکہ فردوسی بلاغت کے تمام
اصول سے واقف تھا، اس نے سمجھا کہ گو اس زمانہ میں عرب کی وہی
حالت تھی، لیکن جس زمانہ میں فردوسی خود موجود ہے، وہ حالت بدل
گئی ہے، یعنی عرب کی عظمت تمام قلوب پر چھائی ہوئی ہے اس
لئے محض عرب کے نام لینے سے سامعین کے دل میں عرب کی
حقارت اور ذلت کا خیال نہیں آسکتا، اس لئے اس نے پہلے
یہ بیان کیا کہ عرب اونٹ کا دودھ اور گوہ کا گوشت کھایا کرتے
تھے، اس طرح اس نے عرب کی قدیم حالت کی تصویر کھینچ دی
اور چونکہ بیان واقعی تھا، اس لئے اس کا پورا اثر ہوا ؎

ز شیر شتر خوردن و سوسمار عرب را بجائے رسید است کار

سر تخت کیاں را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اس کے ساتھ عجم کا ذکر تخت کے ساتھ کیا اور عجم کا نام لیا تو
کیان کے لفظ سے لیا جو کہ شان و شوکت پر دلالت کرتا ہے۔ اب
جب دونوں قوموں کی ذلت اور عظمت کا نقشہ کھینچ چکا تو یہ الفاظ
کہ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو۔ آج بھی سامعین کے دل میں
انقلاب زمانہ پر حسرت کا وہی اثر پیدا کرتے ہیں جو اس وقت عجم
کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

مثال ۹۔

حر نے جب یزید کی فوج سے الگ ہو کر امام حسین علیہ السلام
کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا تو در پر سے عفو تقصیر کے
لیے اس طرح فریاد کی ہے۔

ڈر کر کہا کہ صدا دور سے آئی آل اطہار — الغیاث اے جگر و جان رسول مختار
مجرم ایسا ہوں کہ عصیاں کا نہیں جس کے شمار — عفو کر عفو کہ اے سبط شہ فیض شعار

پار دریا سے خطا سے مری کشتی ہو جائے
ڈوبتی بھی ترے صدقے سے کشتی ہو جائے

اے مددگار معین الضعفا رحم کری — اے خبر گیر گروہ غربا رحم کری
پاؤں لغزش میں ہیں لے ہے خدا رحم کری — ہاتھ باندھے ہوئے حاضر ہے یہ عقدہ کشا رحم کری

دیجئے حر کو سند نار سے آزادی کی
آئیے جلد خبر لیجئے فریادی کی

میرے اعمال ہیں ہر چند سراسر بیدی   ہوں گنہگار خدا کے ازلی و ابدی
آپ ہیں مالک سرکار جناب احدی   اے خداوند جہاں خضر بیابان خضر بری

جو تہی دست ہیں تکتے ہیں شہنشاہ کا ہاتھ
آپ کا ہاتھ زمانے میں ہے اللہ کا ہاتھ

پھر جناب امام علیہ السلام نے اس کی تقصیر معاف کر دی ہے اور کمال مہربانی سے پیش آئے ہیں تو

حُر پکارا انّی انت والی یا لقاللہ   قابل عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ
مجھ سے گمراہ کو اک آن میں جانے ملے براہ   سب ہے صدقہ انھیں قدموں کا خدا ہو آگاہ

مہر ذرّہ پہ جو ہو تیر تاباں ہو جائے
آپ جس مور کو چاہیں وہ سلیماں ہو جائے

اس موقع پر میر انیس نے اپنی عادت کے خلاف متعدد عربی جملے استعمال کئے ہیں جو اردو میں بظاہر غریب اور نامانوس معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان جملوں کی وجہ سے اس وقت کی حالت کی جو تصویر کھینچ جاتی ہے وہ اور کسی طرح ممکن نہیں۔ دعا۔ استغاثہ اور فریاد کے لئے عربی جملے ایک خاص اثر رکھتے ہیں، اور اس لئے جاہل سے جاہل آدمی بھی جب دعا مانگتا ہے تو عربی ہی الفاظ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً استغاثہ اور فریاد کے وقت بھی اسی قسم کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً الامان۔ الغیاث چونکہ حُر عربی النسل ہے، اس لئے اس کی زبان سے بے ساختہ وہ الفاظ جو

اِن موقعوں پر عرب استعمال کرتے ہیں، واقعہ کی تصویر کھینچنے کے لیے زیادہ کارگر ہو سکتے ہیں، بابی انت وامی فداک اور قربان ہونے کے موقع پر بولتے ہیں، اور یہ فقرہ ایسا موثر اور دلنشین ہے کہ اردو کا کوئی جملہ وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا تھا۔

مثال ۱۰۔ حضرت عباسؑ کو جب امام حسین علیہ السلام نے فوج کا علم عنایت فرمایا ہے تو حضرت زینبؑ ان سے فرماتی ہیں ؎

گھر میں سلامت آئینگے جب سرورِ اُمم ... تب دونگی تم کو تہنیت عہدۂ علم
ہاتھوں کو جوڑتی ہے یہ بہنا اسیرِ غم ... کچھ صلاح صلح کر لشکر ادھر ہے کم
تم سے بڑی اُمید ہے زہراؑ کی جائی کو
بھیا تمھیں سے لے گی بہن اپنے بھائی کو

انیسؔ نے شعر میں معمولی طریقۂ کلام یہ تھا کہ مجھ کو تم سے بڑی امید ہے اور میں امام حسینؑ کو تمھیں سے لوں گی لیکن حضرت زینبؑ نے اپنے آپ کو زہراؑ کی جائی کہا اور پھر کہا کہ بہن اپنے بھائی کو تمھیں سے لے گی، اس اسلوبِ کلام کے بدل دینے سے جو بلاغت پیدا کی وہ خود ظاہر ہے۔

مثال ۱۱۔

کس کس کے داغ آج جگر پر اٹھائے ہیں ... پیاسا تمھیں شہید کا دینے کو آئے ہیں
ہم تمھارے لال کے خوں میں نہائے ہیں ... بیٹھے ہیں خاک اڑا کے یہ آنسو بہائے ہیں

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت علی اکبر شہید ہو چکے ہیں اور امام حسین

علیہ السلام زنانہ میں تشریف لے گئے ہیں اور حضرت زینبؑ سے علی اکبرؑ کی شہادت کا واقعہ بیان فرماتے ہیں۔ اس موقع پر یہ لفظ "تمھارے لال" ایک خاص اثر پیدا کرتا ہے، علی اکبر امام حسین علیہ السلام کے صاحبزادے تھے، لیکن امام علیہ السلام اُن کو حضرت زینبؑ کا لال کہہ کر خطاب کرتے ہیں؛ اور کہتے ہیں کہ ہم جو خون میں نہائے ہیں، یہ تمھارے لال کا خون ہے' انسان کو رنج وغم کی حالت میں جب کوئی نہایت قریب کا عزیز ہمدرد اور غم گسار مل جاتا ہے تو جوش محبت میں اُس غم کو اپنی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ اُسی شخص کی طرف منسوب کرتا ہے، گویا اس سے ایسی ہمدردی کی اُمید کرتا ہے کہ وہ واقعہ خود اُسی شخص پر پیش آیا ہے، یہاں اس طرز بیان نے زیادہ اثر اس وجہ سے پیدا کیا ہے کہ فی الواقع حضرت زینبؑ کو علی اکبرؑ سے نہایت سخت محبت تھی، علی اکبرؑ کو بچپن سے اُنھی نے پالا تھا اور اُن کو اپنے بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔

مثال ۱۲۔ جب حضرت عباسؑ نے پانی لانے کے لیے نہر پر جانا چاہا ہے تو حضرت زینبؑ نے خطرہ کے لحاظ سے اُن کو روکنا چاہا۔ امام حسینؑ بھی اُن کا جانا گوارا نہیں کرتے۔ اُس وقت حضرت عباسؑ کی زوجہ حضرت زینبؑ سے کہتی ہیں ؎

کہنے لگی یہ زوجۂ عباسؑ خوش صفات | بی بی بھلا یہ کون سے وسواس کی ہے بات
مشکیزہ لیکے گر یہ نہ جائیں سوئے فرات | پھر ننھے ننھے بچوں کی کس طرح ہو حیات

ہر وقت کبریا سے طلب گار خیر ہوں
آ گئے جو کچھ سبھوں کی رضا میں تو غیر ہوں

یہ فقرہ "میں تو غیر ہوں" اس موقع پر نہایت مؤثر اور بلیغ فقرہ ہے، وہ حالانکہ حضرت عباسؑ کی بیوی ہیں لیکن اپنے آپ کو غیر کہتی ہیں۔ یہ اس بات کی تعریض ہے کہ میری بات نہ ماننا گویا مجھ کو غیر سمجھنا ہے۔

مثال ۱۳

قیدی ہوں ظلم رسیدہ بھی ہوں نادار بھی ہوں
اس لٹے قافلے کا قافلہ سالار بھی ہوں

یہ وہ موقع ہے کہ ہند (یزید کی بیوی) قید خانہ کے دیکھنے کے لئے گئی ہے، وہاں امام زین العابدینؑ کو قید میں دیکھ کر نام و نسب پوچھا ہے اور امام موصوف نے جواب دیا ہے۔ اس شعر میں قافلے کے ساتھ لٹے کی قید نے نہایت بلاغت پیدا کی ہے حسرت اور رنج کے اظہار کا یہ انتہائی درجہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ایک ظاہری معزز لقب سے یاد کرتا ہے اور ساتھ ہی ایک دوسرا لفظ بھی ایسا استعمال کرتا ہے جس سے وہ معزز لقب اور زیادہ ناکامی اور حرمان ثابت کرتا ہے، امام زین العابدینؑ نے اپنے آپ کو قافلہ سالار کہا، لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ لٹے قافلے کا قافلہ سالار ہوں۔

مثال ۱۴

سبقت لگے تھا طلب ہوئے اعدا سے امام   لے سپاہ حرب مصروف ہوئے وکود و شام

تم پہ کرتا ہے حسینؑ آخری حجت کو تمام　　پسرِ مصحفِ ناطق ہوں سنو مجھ سے کلام
سخنِ حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو
شور باجوں کا مناسب ہو تو موقوف کرو

تیسرے شعر میں "مناسب ہو" کے جملۂ معترضہ نے نہایت بلاغت پیدا کی ہے، چونکہ وعظ اور پند کا موقع ہے اور یزیدیوں سے توقع بھی نہ تھی کہ وہ امامؑ کی کسی بات کو جو تحکم کے لہجہ میں کہی جاتی قبول کرتے۔ اس لیے امام انھیں کی مرضی پر رکھا گیا کہ اگر تم مناسب سمجھو تو باجوں کا شور ذرا موقوف کر دو۔

استعارات و تشبیہات: یہ چیزیں حسنِ کلام کا زیور ہیں، بلکہ سچ یہ ہے کہ نظم و نثر اور تقریر و تحریر میں جو کچھ جادوگری ہے بہت کچھ انھی کی بدولت ہے، لیکن جس طرح ہر چیز جب تک نیچرل حالت میں رہتی ہے اُس کا اصلی حسن قائم رہتا ہے، جب تکلف اور تصنع شروع ہوتا ہے تو اثر میں کمی آجاتی ہے اسی طرح تشبیہہ اور استعارہ میں بھی جب تقصد و تکلف، غرابت اور غیر معتدل ندرت پیدا کی جاتی ہے تو اصلی اثر جاتا رہتا ہے۔

اُردو کی شاعری میں جس طرح اور بہت سے بے معنی تکلفات پیدا ہو گئے ہیں، جنھوں نے شاعری کا اصلی جوہر خاک میں ملا دیا ہے۔ اُسی طرح تشبیہات و استعارات کی حالت بھی بالکل بدل گئی ہے، اور لطف یہ کہ آجکل کے اہلِ سخن بدمذاقی سے اسی کو کمالِ سخن سمجھتے ہیں۔

انسان میں فطرتاً یہ بات پیدا کی گئی ہے کہ وہ اشیا کی تصویر سے لطف اٹھاتا ہے، ایک بدصورت حبشی ہمارے سامنے آئے تو ہم کو نفرت ہوگی لیکن اگر کوئی ہو بہو اس کی تصویر کھینچ دے تو ہم کو لطف آئے گا اور جس قدر وہ زیادہ اصل کے مطابق ہوگی اسی قدر طبیعت پر لطف اور استعجاب کا زیادہ اثر ہوگا۔ چونکہ تشبیہ بھی ایک قسم کی تصویر ہے، اس لئے طبیعت کا اس سے محظوظ اور متلذذ ہونا ایک فطرتی امر ہے۔

تشبیہ کی دو قسمیں ہیں۔ مفرد۔ مرکب، مفرد جس طرح چہرہ کو پھول سے تشبیہ دی جائے، مرکب جس طرح کہا جائے کہ میدان جنگ میں گرد اٹھی تو اس میں تلواریں اس طرح چمکتی تھیں جس طرح شب کو ستارے ٹوٹتے ہیں۔

مفرد تشبیہ میں چنداں جدت نہیں ہوسکتی، اولاً تو اس وجہ سے کہ مفرد چیزوں کی طرف ہر شخص کا خیال منتقل ہوسکتا ہے، ثانیاً مدت سے شعراء اور اہل قلم اس قسم کی تشبیہ سے کام لے رہے ہیں، اس لئے عالم قدرت میں جو چیزیں تشبیہ کے قابل تھیں اکثر کام میں آچکیں، مثلاً چہرہ کو پھول، آفتاب، مہتاب، آئینہ سے تشبیہ دے سکتے تھے، سو سو دفعہ دے چکے، اب عالم فطرت میں کوئی نئی چیز پیدا ہو تو چہرہ کی تشبیہ میں بھی جدت پیدا ہو۔

البتہ مرکب تشبیہ میں ہر وقت جدت پیدا ہوسکتی ہے کیونکہ

اوّل تو ترکیب کی ہزاروں صورتیں ہیں، دوسرے یہ کہ چند اشیا کی ترکیب سے جو مجموعی ہیئت پیدا ہوتی ہے اس کی طرف ہر شخص کا خیال نہیں منتقل ہو سکتا۔

ایک نکتہ اور سمجھ لینے کے قابل ہے، تشبیہ کی اصلی خوبی یہ ہے کہ مشبّہ کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے اور نیچرل شاعری میں جیسا کہ قدمائے عرب کی شاعری تھی، تمام تشبیہیں اسی قسم کی ہوتی تھیں، لیکن ایک مدت سے ایشیائی شاعری نیچرل حالت سے دور پڑ گئی ہے اس لئے آج اس قسم کی تشبیہات کا ڈھونڈھنا بے فائدہ ہے، تاہم تشبیہ کی خوبیاں جس قدر میر انیس صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہیں اردو زبان میں اُن کی نظیر نہیں مل سکتی، اُن کی تشبیہات میں جو خصوصیات ہیں اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) اکثر تشبیہات مرکب ہیں۔

(۲) اکثر تشبیہات قریب الفہم اور سریع الانتقال الی الذہن ہیں، اور یہی تشبیہ کا بڑا کمال ہے۔

(۳) علمائے معانی نے لکھا ہے کہ تشبیہ کی غرض کبھی مشبّہ کی رفعت اور حسن، اور کبھی تحقیر اور ذلت، اور کبھی رعب و ہیبت ہوتی ہے، یہ باتیں میر انیس کی تشبیہات میں کمال کے درجہ پر پائی جاتی ہیں، مثلاً حضرت عباس پر جب ہر طرف سے برچھیاں چلنے لگی ہیں تو اس حالت کو اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گردِ آفتاب کے

برچھیوں سے زخمی ہونا، شکست اور مغلوبیت کی حالت ہے اِس لئے اس کے بیان کرنے سے ذلّت کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس تشبیہ نے حالت بدل دی۔

یا مثلاً جب حضرت عبّاسؑ کے دونوں ہاتھ تلوار سے کٹ کر گر پڑے اور اُنھوں نے مشک کو دانتوں سے پکڑ لیا تو اس حالت کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔

ع مشکیزہ تھا کہ شیر کے مُنہ میں شکار تھا

مشکیزہ کا منہ میں لینا ایک بدنما صورت ہے لیکن اس تشبیہ نے بدنمائی کے بجائے شان پیدا کر دی۔

یا مثلاً جب تمام اہلِ بیت ایک ہی رسن میں قید کئے گئے ہیں تو اُس حالت کو اِس طرح بیان کیا ہے ؎

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن
جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گلہائے چمن

رسّی میں باندھا جانا اور وہ بھی ایک ہی رسّی میں، بظاہر نہایت ذلّت نما حالت تھی لیکن تشبیہ نے بدنمائی کو حسن سے بدل دیا۔

یا مثلاً یہ شعر ؎

مقتل میں کیا ہجوم تھا اُس نورِ عین پہ پروانے گر رہے تھے چراغِ حسینؑ پہ

یا مثلاً اِن اشعار میں تشبیہ سے دشمن کی ہیبت اور بدنمائی پیدا کی ہے ؎

کہتی تھی یہ زرہ بدنِ بد خصال میں
پکڑا ہے پیل مست کو لوہے کے جال میں

ع گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا ؎

سینے کے نیچے کوا کہ خیبر کا بند باب
تنور گرم تھا شکم خانماں خراب
جوشِ غضب سے سرخ ہوئی چشم نابکار
مثلِ تنور منہ سے نکلنے لگا بخار

(۴) محسوسات سے جو تشبیہ دی جاتی ہے نہایت عمدہ خیال کی جاتی ہے، کیونکہ محسوسات رات دن محسوس ہوتے رہتے ہیں اس لئے اُن کے ذکر کے ساتھ فوراً اُن کی صورت ذہن میں آجاتی ہے، اور اس لئے مُشبّہ کی تصویر بھی آنکھوں میں پھر جاتی ہے، اس قسم کی تشبیہات میر انیس کے ہاں کثرت سے ملتی ہیں، مثلاً بھاگڑ اور اضطراب کا بیان، ؎

یوں روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

تلوار کی تعریف ؎

جوشن کو کاٹ جاتی تھی یوں آکے اوج سے پیراک جس طرح نکل آتا ہے موج سے

کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سناں ۔ غل تھا کہ اژدھا ہے نکالے ہوئے زباں

یا مثلاً دو حریف برچھیوں سے ایک دوسرے پر وار کر رہے ہیں اور برچھیوں کی انیاں باہم ٹکراتی ہیں۔

ع دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے

اسی حالت کی ایک اور تشبیہ،

ع شمعوں کی تھیں لویں کہ ملیں اور جدا ہوئیں

تعزیہ خانے میں لوگوں کا سیاہ ماتمی لباس، ؎

مردم سیاہ پوش ہیں سب اور گھر سفید
جیسے بیاض چشم ادھر اور ادھر سفید

حضرت علی اکبر کا چھوٹا سا نیزہ، دشمن کے بھالے سے ٹکراتا ہے،

ع غل تھا کہ اژدھے سے وہ افعی لپٹ گیا

غیظ اور غضب کی حالت، ؎

یوں غیظ تھا عمر کی طلب سے دلیر کو
جس طرح ٹوک دے کوئی غصے میں شیر کو

ڈھال پر تلوار کو آسانی سے روک لینا ؎

یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغ جہول کو
جس طرح روک لے کوئی شہ زور پھول کو

خزاں کے موسم میں پتوں کی حالت ؎

ع پتے بہ رنگ چہرۂ مدقوق زرد تھے۔

(۵) بعض جگہ تشبیہ سے مبالغہ مقصود ہوتا ہے، اس قسم کی تشبیہیں میر صاحب کے ہاں نہایت اعلیٰ درجہ کی پائی جاتی ہیں اگرچہ فی الحقیقت ان سے تشبیہ کی اصلی غرض نہیں حاصل ہوتی کیونکہ مبالغہ خود ایسی چیز ہے جو اصلیت سے دور کر دیتی ہے۔

گرمی کی شدت کا بیان، ؎

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں | انگارے تھے حباب، تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں | تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ، گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

اب ہم چند اشعار ہر قسم کی تشبیہ کے ایک جا نقل کرتے ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ میر صاحب نے تشبیہ میں کیا کیا لطافتیں پیدا کی ہیں، ؎

کُہنی سے دونوں ہاتھ جُدا تن سے سر جدا | ہر نخل قد کی شاخ جدا اور ثمر جدا
ہر سنگ ریزہ نور سے دُرِّ خوش آب تھا | لہریں جو تھیں کرن تو بھنور آفتاب تھا

ع ہم لوگ زمانہ میں حباب لب جو ہیں ؎

ہلنے لگے درخت لرزنے لگے جبال
سبزہ نہ تھا کھڑے تھے بدن پر زمیں کے بال

ع چلنے میں نیزے کانپتے تھے مثل پائے پیر ع

یہ غیظ تھا عمر کی طلب سے دلیر کو | جس طرح ٹوک دے کوئی غصہ میں شیر کو

گھوڑے کی تعریف

سرعت میں تھا ہرن تو وغا میں ہزبر تھا ولہ پستی میں سیل تھا تو بلندی میں ابر تھا

پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے ولہ تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کار ونکی ولہ برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی

ع لہراتی ہے کیا نہر مثالِ شکمِ مار

ع افلاک ہنڈولے کی طرح تھے تہ و بالا، سے

یارب ترا نام پاک جپنے کے لئے گویا اک ہڈیوں کا مالا ہوں میں

آڑ کر گری زمیں پہ سناں اس نکان سے ولہ گرتا ہے جیسے تیرِ شہاب آسمان سے

گرمیاں تھی نوتیغ دم امتحاں نہ تھی ولہ یہ طرفہ بات تھی کہ دہن تھا زباں نہ تھی

یوں جلوہ گر زرہ میں تن سرخ فام تھا ولہ گویا بچھا ہوا چمنستاں میں دام تھا

چپ ہوں مگر زباں ہے وہی اپنے کام میں ولہ گویا کہ ذوالفقار علی ہے نیام میں

ناخن نے دکھایا جو رخ جلوہ گر اپنا ولہ شرما کے مہ نو نے جھکایا ہے سر اپنا

ع رہوار کیا، ہوا پہ سلیماں کا تخت تھا

ع بیٹھا ہے شیر پنجہ کو ٹیکے ترائی میں سے

تلوار اور گھوڑے کی تشبیہ

کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سناں غل تھا کہ اژدہا ہے نکالے ہوئے زباں

ع ذرے نہ تھے زمیں پہ سونے کے پھول تھے

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

ع کھلتی تھیں اور حبابوں کی آنکھیں جھپکتی تھیں

جل کر کبھی بڑھا کبھی پیچھے سرک گیا شعلہ تھا آگ کا کہ بجھا اور بھڑک گیا

ع اعدا کا لہو تیغ کی پاچھوں میں بھرا تھا

تلواریں منہ چھپائے تھیں سایہ میں ڈھال کے — خنجر بھی رہ گئے تھے زبانیں نکال کے

غل ہوا جنگ کو اللہ کے پیارے نکلے — ولہ — اے فلک دیکھ زمیں پر بھی ستارے نکلے

سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا — ولہ — دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

آیا گیا فرس جو سمٹ کر ادھر ادھر — ڈھالوں کا ابر رہ گیا پھٹ کر ادھر ادھر

حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا — لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا

ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب — اور آب میں سروں کو چھپانے لگے حباب

کڑیوں سے یوں زرہ کے نکل جاتی تھی شتاب — جس طرح دام سے نکل آتی ہے موجِ آب

سرکش تھے باد کبر سے جو خانماں خراب — خود اُن کے گر کے ٹوٹ گئے صورتِ حباب

خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب — ولہ — خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب

ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر — ولہ — منہ کھولے چھپتی پھرتی تھیں لیکن ادھر ادھر

بھاگی تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر — تھے نہ نشیں نہنگ، مگر آب تھے جگر

دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
لیکن پڑے تھے پانوں میں چھالے حباب کے

ع ہو گیا چوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش ؎

تیغوں کی کچھ خبر نہ تھی نہ ڈھالوں کا ہوش تھا — نیزہ ہر اک سوار کو اک بارِ دوش تھا

خاک اڑتی تھی منہ پر حرمِ شیرِ خدا کے — تھا چین پہ جبیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

اگرچہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض صنائع ایسے بھی ہیں کہ اگر بے تکلفی سے آ جائیں تو کلام میں حسن پیدا ہو جاتا ہے لیکن عام حالت یہ ہے کہ اکثر صنائع و بدائع شاعری اور انشا پردازی کا دیباچۂ زوال ہیں۔

میر انیس جس زمانے میں تھے، شاعری کا مدار صنائع و بدائع پر رہ گیا تھا، مبالغہ ایہام اور مناسبات لفظی، یہی چیزیں شاعری کا کمال خیال کیجاتی تھیں، میر انیس کو انھیں لوگوں میں رہنا سہنا تھا، انہی سے داد سخن لینی تھی، اور زیادہ سچ یہ ہے کہ انہی کی قدر دانی پر معاش اور ضروریات زندگی کا انحصار تھا، ایسی حالت میں کیونکر ممکن تھا کہ وہ زمانہ کی حکومت سے آزاد رہتے، وہ جانتے تھے کہ جس شاعری کو وہ زندہ کرنا چاہتے ہیں صنائع و بدائع اس کے چہرہ کے داغ ہیں، لیکن انھوں نے مجبوراً اس کو گوارا کیا، یہ صرف قیاس نہیں بلکہ مستند اور صحیح روایت سے ثابت ہے، میرے ایک معزز دوست نے خود میر انیس سے پوچھا کہ کیا آپ لفظی رعایتوں اور صنائع و بدائع کو پسند کرتے ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ "نہیں" لیکن آخر لکھنؤ میں رہنا ہے" تاہم میر انیس نے یہ کیا کہ جو صنعتیں محض لغو تھیں، مثلاً صنعت اہمال اور لزوم ما لا یلزم وغیرہ نہایت کم برتیں اور جس قدر برتیں اُن سے صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ اس جولانگاہ میں بھی وہ بھی حریفوں سے پیچھے نہیں، باقی صنعتوں کو انھوں نے اس طرح برتا کہ کلام کی اصلی خوبی یعنی برجستگی، صفائی اور سادگی میں فرق نہ آنے پائے، ہم اُن تمام صنعتوں کی کچھ کچھ مثالیں نقل کرتے ہیں، جو میر صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

ایہام کے معنی یہ ہیں کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوں، ایک معنی

مراد ہوں، اور دوسرے معنی مراد نہ ہوں، لیکن مقدم اور مؤخر الفاظ سے اس کو مناسبت ہو، مثلاً۔

ع ‏ ‏ اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

رنگ کے دو معنی ہیں، ایک تو وہی معمولی رنگ، دوسرے طرح، قسم، طرز، یہاں یہی پچھلے معنی مراد ہیں، یعنی پھول کے مضمون کو میں سو طرح سے باندھ سکتا ہوں، یہاں پہلے معنی مراد نہیں لیکن گل سے اس کو مناسبت ہے، یہ صنعت اگر بے ساختگی اور بے تکلفی سے برتی جائے، تو کلام میں نہایت حسن پیدا ہو جاتا ہے، قدما میں یہ صنعت بالکل متروک تھی، سلمان ساوجی نے اس کی ابتدا کی اور اس میں نہایت غلو کیا تاہم اکثر جگہ نہایت بے تکلفی سے بھی استعمال کیا ہے۔

سلمان کے بعد خواجہ حافظ کے کلام میں کہیں کہیں اس کا پتہ لگتا ہے، لیکن پھر کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، اردو میں ابتدا ہی سے اس کی طرف میلان رہا، میر انیس کے زمانہ تک اس کو رواج عام ہو چکا تھا، اور یہ صنعت مضمون بندی کی ایک بڑی عمدہ صنعت خیال کی جاتی تھی، میر انیس صاحب نے بھی عوام پسندی کی بنا پر یہ صنعت نہایت کثرت سے برتی ہے، لیکن اکثر جگہ نہایت بے تکلفی سے ادا ہوئی ہے، چند مثالیں ذیل میں درج ہیں، ؎

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے ‏ ‏ اقلیم سخن میری قلمرو سے نہ جائے

ہر چند کہ ہوں خسروِ اقلیم سخن　　پر غیر دوات کچھ قلمرو میں نہیں
تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں　　قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
کیا خوف انکو نہر پہ گر روک ٹوک ہے　　نیزہ نہیں جو پاس تو اسمیں بھی نوک ہے
ٹبت توڑ دئے ہیں جو سوئے دیر گئی ہوں　　خندق کو تو دو ہاتھ میں میں تیر گئی ہوں

ع　چلاتی تھیں پریاں کہ خدا جان بچائے،
(جان جن کو بھی کہتے ہیں)

ع　دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے،
(دم خون کو بھی کہتے ہیں)

ع　سب فوج کی تیغیں تھیں اور اک شاہ کا دم تھا،
(دم تلوار کی باڑھ کو بھی کہتے ہیں) ؎

ڈھالوں کا دور برچھیوں کا اوج ہو گیا　　ہنگام ظہر خاتمۂ فوج ہو گیا
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح　　ولہ　ہر خار کو بھی نوک زبان تھی خدا کی مدح
کم نہ کچھ مرتبۂ آل عبا ہووے گا　　ولہ　عاصیوں کا اسی پردہ میں بھلا ہوئیگا

ع　اک ایک کوس راہ جبل میں پہاڑ تھا
ع　غل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی،
ع　سر دھڑ سے گر پڑا تو جسد کو خبر ہوئی،
ع　ایسا گنہ کیا ہے کہ کچھ جس کی حد نہیں
(حد گناہ کی سزا کو بھی کہتے ہیں)
ع　دریا لہو کا پھیر گئی چار ہاتھ میں ؎

پیدل میں تھی نہ جان نہ دم تھا سوار میں ولہ ٹوٹی ہوئی صفیں تھیں بھلا کس قطار میں
ایسا کوئی طفلی میں نمودار نہ ہوگا ولہ ہاتھ ایسا تو جعفر کا بھی طیار نہ ہوگا
اللہ رے سخن کی ترے تاثیر انیس ولہ رو دیتے ہیں مثل شمع جلنے والے
اگر بزم عزائے شہ میں رونا ولہ ہر آنکھ پہ فرض عین ہو جاتا ہے

ع حسرت ہے کہ خواب میں بھی رویا کیجئے ،

(عربی میں رویا کے معنی خواب کے ہیں)

ع چپ ہوں مگر زباں ہے وہی اپنے کام میں

(کام فارسی میں تالو کو کہتے ہیں)

ع آب بقا بھی ہو تو مرے کام کا نہیں ،

مبالغہ، قدما کے نزدیک مبالغہ اس حد تک ممدوح تھا کہ کسی وصف کو ایک لطیف پیرایہ میں معمولی حالت سے کچھ بڑھ کر بیان کیا جائے ، لیکن جب حد سے بڑھا تو عیب اور نقص ہو گیا، فن بلاغت کے امام ابن قدامتہ نے نقد الشعرا میں اس کی مثال میں ابو نواس کا یہ مصرعہ نقل کیا ہے ۔

ع یا امین اللہ عش ابدا .... اے خدا کے امین تو ہمیشہ زندہ رہ ،

امام موصوف نے لکھا ہے کہ کسی شخص کا ہمیشہ زندہ رہنا ناممکن ہے ، اس لئے یہ مبالغہ معیوب اور قبیح ہے ، شعرائے عرب اس قسم کا مبالغہ کرنا چاہتے تھے تو پہلے امکان کی شرط لگا دیتے تھے یعنی

اگر یہ ممکن ہوتا تو یوں ہوتا، ابوتمام کہتا ہے ؎

ولوان مشتاقا تکلف فوق ما   فی وسعہ لشی الیک المنبر

یعنی اگر کوئی مشتاق اپنی طاقت سے بڑھ کر کام کر سکتا، تو ممبر خود تیرے پاس چلا آتا، لیکن عرب میں بھی جب تکلف اور تصنع زیادہ بڑھا اور صحیح مذاق مفقود ہو گیا تو مبالغہ کی یہی خوبی رہ گئی کہ مستبعد اور ناممکن ہو، اور جس قدر زیادہ ناممکن ہو، اسی قدر زیادہ اس کا کمال ہے، اب یہ حالت پہونچ گئی کہ سودا گھوڑے کی تعریف میں کہتے ہیں، ؎

ق

روبرو سے اگر آئینہ کے اس کلگوں کو
پھینکدے لیکے کبھی شرق سے تو غرب تلک
اتنے عرصہ میں پھر آئے تو اسے باورکر
عکس بھی آئینہ سے ہونے نہ پائے منفک

میرانیس کے زمانہ میں، مبالغہ کمال کی حد کو پہونچ چکا تھا، اور یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب تک مبالغہ میں انتہا درجہ کا استبعاد نہیں ہوتا تھا، سامعین کو مزا نہیں آتا تھا، مجبوراً میر صاحب نے بھی وہی روش اختیار کی لیکن چونکہ ان کی اصل فطرت میں سلامت روی اور اعتدال تھا۔ اس لئے اس میدان میں وہ اپنے حریف مرزا دبیر سے بہت پیچھے رہ گئے، اور یہی بات ہے جس کی بنا پر ان کے حریف کہتے ہیں "کہ وہ خیال بندی اور مضمون آفرینی میں

مرزا دبیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

بہر حال اُن کے مبالغہ کا نمونہ یہ ہے گرمی کی شدت کے بیان میں لکھتے ہیں:-

وہ لُو وہ آفتاب کی حدّت وہ تاب و تب — کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب — خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
سُرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
سایہ کنوئیں میں اُترا تھا پانی کی چاہ سے

آبِ رواں سے منہ نہ اُٹھاتے تھے جانور — جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر — خسخانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب — چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب — کافورِ صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کُرۂ زمہریر میں

شیر اُٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے — آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے — گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں　　انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں　　تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

اس کی ثنا اگر کوئی لائے زباں پر　　ساکن جو حرف ہو وہ نہ آئے زبان پر
کل کی طرح اشارے میں سو بار پھیر لو　　بجلی ہے جس طرف دم پیکار پھیر لو
کاوے میں شکل گنبد دوّار پھیر لو　　نقطے کے گرد صورتِ پرکار پھیر لو
دوڑے بروے آب تو پتلی بھی تر نہ ہو
آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

حسن التعلیل یہ ایک لطیف صنعت ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ شاعر ایک ایسی چیز کو کسی چیز کی علت فرض کرتا ہے، جو درحقیقت اُس کی علت نہیں، مثلاً ؎

بھلائی جو کرے دنیا میں ہووے وہ پامال
بسان جادہ کسی کو تو راہ مت بتلا

جادہ یعنی راستہ پامال ہوتا ہے، شاعر اُس کی یہ وجہ قرار دیتا ہے کہ راستہ لوگوں سے بھلائی کرتا ہے اس لئے پامال ہے، یہ ایک قسم کی تخئیل ہے، اور اس لحاظ سے یہ صنعت عین شاعری ہے۔ کیونکہ شاعری درحقیقت تخئیل کا نام ہے، اس صنعت میں اس وقت زیادہ لطافت پیدا ہو جاتی ہے، جب وہ وصف جس کی علت بیان کی

ہے تخییل پر مبنی ہو، مثلاً میر انیس کا یہ شعر ؎

ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب
اور آب میں سروں کو چھپانے لگے حباب

موجوں کے اضطراب، اور حباب کے سر چھپانے کی علت، ڈر اور خوف کو قرار دیا ہے، لیکن موج کا اضطراب، اور حباب کا پانی میں سر چھپانا، خود کوئی واقعی چیز نہیں، بلکہ شاعر نے موج کی حرکت کو اضطراب قرار دیا ہے، اور حباب جو ٹوٹ جاتا ہے، تو اس کو فرض کیا ہے کہ اس نے پانی میں منہ چھپا لیا، اس صنعت کو میر انیس نے اکثر جگہ نہایت خوبی سے برتا ہے،

ع تیغیں برہنہ ہو گئی تھیں چوم کر نیام ؎

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی — ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی
یہ سن کے تہلکہ صفِ اعدا میں پڑ گیا — ٹوٹا یہ مورچہ وہ رسالہ بگڑ گیا
ہر غول میں علم سے علم جھک کے لڑ گیا — جو رہ گیا نشاں وہ خجالت سے گڑ گیا

ڈر سے نہ بڑھاتے تھے جو سرکش قدم اپنے — تیغیں بھی نیاموں سے چراتی تھیں دم اپنے
تھم گیا طبل وغا کی بھی وہ آواز کا جوش — ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش

ع اکبر سے بھی دنیا میں کچھ آگے بڑھی رہی

(حضرت علی اکبر کی تلوار کی تعریف) ؎

ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر — منہ کھولے چھپتی پھرتی تھیں لیکن ادھر ادھر
بھاگی تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر — تھے تشنہ لب نہنگ، مگر آب تھے جگر

دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

خاک اڑتی تھی منہ پر حرم شبیر خدا کے   تھا چین بجبیں فرش بھی جھوکوں سے ہوا کے

ع   ڈھالوں کا یہ عالم تھا کہ چھپتی تھیں پس پشت

صنعت طباق، یعنی دو متضاد یا متقابل چیزوں کو یکجا جمع کرنا۔ میر انیس نے اس صنعت کو اکثر برتا ہے اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ برتا ہے۔

ع   کھلتا نہیں کچھ آپ نے کیوں باندھے ہیں ہتھیار ؎

ہاتھ باندھے ہوں ہیں اے عقدہ کشا اور کنی
پاؤں لغزش میں ہیں اے دست خدا اور کنی

مری قدر کر اے زمین سخن   کہ میں نے تجھے آسمان کر دیا

یہ فصل اور یہ بزم عزا یادگار ہے   پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے

ع   گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے ؎

استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان
پانی میں آگ آگ میں پانی خدا کی شان

ع   بانو! یہ رہے یاد ہمیں بھول نہ جانا

ع   فاقے سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر ؎

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک مآب   پر تھی رخوں پہ خاک تیمم سے طرفہ آب

نیزہ ہلا کے شاہ پہ آیا وہ خود پسند   مشکل کشا کے لعل نے کھولے تمام بند

ع تو عالم و دانا ہے کہ میں ہیچمداں ہوں،
ع ثابت نہ ہوا کب صفت اوّل ہوئی آخر،
ع پانی ہے میرے زور کے آگے ہوا کا زور،
ع قرآن میں کیا خفی ہے کہ ہم پر جلی نہیں، ؎
پیچھے کبھی قافلے سے رہنا نہ انیس اے عمر دراز! تیری کوتاہی ہے،
ع نیزوں سے کہیں عقد کشا بند ہوا ہے،

مراعات النظیر، یعنی الفاظ کی رعایت، یہ وہی صنعت ہے جو آج عوام کا سرمایۂ ناز ہے، اور جس کو مہذب ضلع جگت کہہ سکتے ہیں، امانت لکھنوی اس شریعت کا پیغمبر ہے، اس کے مصحف کمال کی ایک آیت یہ ہے۔

ع بھیڑیئے ملتے ہیں آنکھیں تری گمرگابی پر

منشی امیر احمد صاحب مرحوم فرماتے ہیں، ؎

کبوتر نہ ہوتا تھا جانے پہ راضی تو بھیجا اُسے روغنِ قاز مل کر

چونکہ عوام کی تسخیر کا سب سے چلتا جادو یہی صنعت ہے اور چونکہ لکھنؤ کی شاعری کے رگ و پے میں یہ صنعت سرایت کر گئی تھی، اس لئے میر انیس صاحب کے ہاں بھی اس کی بہتات ہے، لیکن اتنی احتیاط ہے کہ ابتذال نہیں آنے پاتا اور بعض جگہ تو واقعی اس سے لطف پیدا ہو جاتا ہے، فارسی شعرا نے بھی اس کو برتا ہے، لیکن نہایت فصاحت کے ساتھ۔ مثلاً ؎

خواجہ حافظ لسان

"تا دل ہرزہ گرد من رفت بچین زلف او — زاں سفر دراز خود قصد وطن نمی کند
چشم بیمار ترا عین بلا می بینم — لیکن ابروی تو چیز لیست کہ بالای بلاست"

بہر حال میر انیس کی صنائعی کے یہ نمونے ہیں ؎

جب تک یہ چمک مہر کی پرتو سے نہ جائے — اقلیم سخن میری قلمرو سے نہ جائے
ہر نخل برومند ہے یا حضرت باری — ولہ — پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری

ع آتی ہوں میں سروں پہ ذرا فرق فرق سے

(تلوار کی زبان سے)

ع کیا مورچہ بندی تھی پئے قتل سلیمان ؎

اصغر سے اگر اکبر مہرو نہ ملے گا — تم ہاتھ سے جاؤگے تو بازو نہ ملے گا
فرماتے تھے حسینؑ کہ او خانماں خراب — دریا کو خاک جانتا ہے ابن بوتراب

ع آب بقا بھی ہو تو مرے کام کا نہیں
ع یہ پھول کربلا کے بسانے کو آئے تھے
ع کٹ کٹ گئے وہ سیف زبانی دکھا گئی (تلوار) ؎

خالی نہ گیا وار کوئی تیغ دو سر کا — ہاتھ اڑ گئے گر پانوں بچا کر کوئی سر کا

اس ضعف میں لغزش سے نہ وہ پانوں تھے آگاہ
پایا تھا ثبات قدم پائے ید اللہ

محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا — چلئے اب دیدار مرگ آیا ہے
کون سا باغ تجھے شاد نے دکھلایا ہے — کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے

ع تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

ع کافر جو تھا تو ہاتھ بھی مارا جنیو کا ؎

اب تک یہ لڑائی کے نہیں ڈھنگ سے واقف
دونوں میں نہیں ایک بھی چورنگ سے واقف

ع سب فوج کی تیغیں تھیں اور اک شاہ کا دم تھا ؎

واللیل، والضحیٰ، رُخِ روشن، خطِ سیاہ   لعل و غزال و گل، لب و رخسار و چشمِ شاہ
ابرو و زلف و رُخ شب قدر و ہلال و ماہ   تیر و سناں و زرہ مژہ، سرمہ و نگاہ

چھپتی تھیں، بھاگی جاتی تھیں، گرتی تھیں خاک پہ
قبضوں سے تیغیں، جسم سے روحیں تنوں سے سر

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر   پہچوں سے ہاتھ شانوں سے بازو تنوں سے سر تفطیل
قبضہ سے تیغ، بر سے زرہ، ہاتھ سے سپر   برچھی سے پھل، کماں سے زرہ، زین سے تبر

مہلہ

وہ طاہر و اطہر ہو اگر معرکہ آرا   معلوم ہو حملہ اسد اللہ کا سارا
آگاہ ہو کس طرح کہو عمر کو مارا   صمصام کا اک وار ہوا کس کو گوارا

واللہ گر اک دم کو وہ صمصام علم ہو
ہر روح کو اُس دم ہوسِ مُلکِ عدم ہو

کس کا اسد اللہ سا ہو والی مرحوم   ہلال ہم مالک کل طاہر و معصوم
صدرِ دو سرا رحم دل و سرور مظلوم   آسودہ ہر اک سالک و گمراہ و محروم

معصوم کا دلدار ہو سالار اُمم ہو

اولاد کا اُس عالم و عادل کا الم ہو

اس طرح کا دالا ہمم اس طرح کا سردار اس طرح کا عالم کا ممد اور مددگار
وہ مصدر الہام احد محرم اسرار وہ اصل اصول کرم داد دوار
حاصل اگر اک مردِ دل آگاہ کو مارا
مارا اگر اس کو اسد اللہ کو مارا

تلمیع، میر صاحب نے اس صنعت کو نہایت خوبی سے برتا ہے وہ عربی فقروں کو اس خوبی سے اشعار میں لاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے، انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا ہے ؎

حُر پکارا بابی انت و امی یا شاہ قابل عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ

ع اے خداوند جہاں خذ بیدی خذ بیدی ؎

انصاف کا اس وقت طلبگار ہوں تم سے ہے کون مراد آیۂ لا اسئلکم سے
انھی راںڈوں میں ہے اک دختر فرزند نبیؐ ولہ خوگر سینۂ دلبند رسول عربی
آفت فاقہ کشی، بے پدری، تشنہ لبی دمبدم لب پہ یہ ہے این ابی این ابی
حامی ہے سب کا کون حیات و ممات میں ولہ کس کی ثنا ہے سورۂ والعادیات میں
کس کے لیے اکملت لکم دینکم آیا اتممت علیکم کا ملا ہے کسے پایا
ہے انفسنا انفسکم کس سے اشارا اللہ نے کس گھر میں ستارے کو اتارا

انسانی جذبات یا احساسات

"یہاں تک جن محاسن کلام کا ذکر ہوا، وہ شاعری سے نہیں، بلکہ بلاغت

سے تعلق رکھتے تھے، شاعری جس چیز کا نام ہے اُسکی بحث اب شروع ہوتی ہے۔

یہ شاعری کی اصلی روح درواں ہے، اور اگر مل صاحب کی رائے تسلیم کی جائے تو صرف اسی چیز کا نام شاعری ہے شاعری درحقیقت مصوری ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ مادیات اور محسوسات کی تصویر کھینچنا اس قدر دشوار نہیں، جس قدر غیر محسوسات اور غیر مادی اشیاء کا نقشہ اُتارنا مشکل ہے، ایک درخت کی تصویر کھینچنی ہو تو کسی قسم کی تخیل اور دیدہ وری کی ضرورت نہیں، ٹہنیاں، پھل، پھول، پتے سب سامنے ہیں اور ہر شخص اُن کو محسوس کر سکتا ہے، مصور کا صرف یہ کمال ہے کہ ہر چیز کا پورا نقشہ کھینچ دے، لیکن۔ رنج۔ غم۔ جوش۔ محبت۔ غیظ۔ بیقراری۔ بیتابی۔ مسترت، خوشی۔ محسوس اور مادی چیزیں نہیں ہیں۔ آنکھ اُن کو محسوس نہیں کر سکتی، البتہ دل پر اُن کا اثر ہوتا ہے۔ لیکن یہ اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا۔ اس لئے اُن کی ہو بہو اور اصلی تصویر اُتارنا مشکل ہے۔

میر انیس کا اصلی جوہر یہیں آکر کھلتا ہے، اور یہیں اُن کی شاعری کی حد، اُن کے ہمعصروں سے بالکل الگ ہو جاتی ہے، انسانی جذبات کی سیکڑوں قسمیں ہیں اور پھر ہر ایک کے مختلف مراتب اور مدارج ہیں، مثلاً جذبات انسانی کی ایک قسم محبت ہے، لیکن محبت کے بھی مختلف اقسام اور مدارج ہیں۔ باپ بیٹے کی محبت، بھائی بھائی کی محبت، یا آشنا کی محبت۔ آقا اور غلام کی محبت وغیرہ وغیرہ میر انیس کے مرثیوں میں

نہایت کثرت سے اِن جذبات کا اور اِن کے مختلف مدارج کا ذکر ہے، لیکن جس جگہ جس چیز کو لیا ہے اس کمال کے ساتھ اس کی تصویر کھینچی ہے کہ اس کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے،

مثال ا - حضرت امام علیہ السّلام نے مدینہ سے جب سفر کیا تو تمام کنبہ ساتھ تھا، لیکن حضرت صغرٰیؓ چونکہ بیمار تھیں، اس لئے آن کو ساتھ نہیں لیا ہے، رخصت کے وقت جب گھر میں تشریف لائے تو چاہتے ہیں کہ صغرٰیؓ پر یہ راز ظاہر نہ ہونے پائے، لیکن یہ راز کب چھپ سکتا تھا۔ بہر حال حضرت امام حسین علیہ السّلام خود صغرٰیؓ سے رخصت ہونے کے لئے اُن کے پاس تشریف لے گئے صغرٰیؓ کو اصرار ہے کہ میں تنہا نہیں رہ سکتی، حضرت سمجھاتے ہیں کہ تم اس بیماری کی حالت میں کیونکر چل سکتی ہو، وہ نہیں مانتیں، اُس وقت باپ، بیٹی، ماں، بھائی، بہنوں پر محبّت کا جو اثر ہے اور جس طرح اس کا اظہار ہوا ہے، اُس کی تصویر اس طرح کھینچی ہے ؎

یہ کہتی تھی زینبؓ کہ پکارے شہ عادل ۔۔۔ تیار ہیں دروازے پہ سب ہودج و محمل
طے شام تلک ہو گی کہیں آج کی منزل ۔۔۔ رخصت کرو لوگوں کو بس اب رونے سے حاصل
چلتی ہے ہوا سرد ابھی وقتِ سحر ہے
بچّے کئی ہمراہ ہیں، گرمی کا سفر ہے
رخصت کرو انکو کہ جو ہیں ملنے کو آئے ۔۔۔ کہہ دو کوئی گہوارۂ اصغرؑ کو بھی لائے
نادان سکینہؑ کہیں آنسو نہ بہائے ۔۔۔ جانے کی خبر میری نہ صغرٰیؓ کہیں پائے

ڈر ہے کہیں گھبرا کے دم اس کا نہ نکل جائے
باتیں کرو ایسی کہ وہ بیمار بہل جائے

سُنکر یہ سخن بالو ہے نا شاد پکاری
میں لٹتی ہوں کیسا سفر اور کیسی سواری
غش ہو گئی ہے فاطمہ صغرا مری پیاری
یہ کس کے لئے کرتے ہیں سب گریہ و زاری
اب کس پہ میں اس صاحب آزار کو چھوڑوں
اس حال میں کس طرح سے بیمار کو چھوڑوں

ماں ہوں میں کلیجہ نہیں سینے میں سنبھلتا
صاحب مرے دل کو یہ کوئی ہاتھوں سے ملتا
میں تو اسے لیجلتی پہ کچھ بس نہیں چلتا
رہ جائیں جو بہنیں بھی تو دم اسکا بہلتا
دروازے پہ تیار سواری تو کھڑی ہے
پر اب تو مجھے جان کی صغرا کی پڑی ہے

چلاتی تھی کبرا کی بہن آنکھیں تو کھولو
کہتی تھی سکینہ کہ ذرا منہ سے تو بولو
ہم جاتے ہیں تم اٹھ کے بغلگیر تو ہو لو
چھاتی سے لگو باپ کی دل کھول کے رو لو
تم جن کی ہو شیدا وہ برادر نہ ملے گا
پھر گھر میں جو ڈھونڈوگی تو اکبر نہ ملے گا

ہشیار ہو کیا صبح سے بیہوش ہو خواہر
اصغر کو کرو پیار کلیجے سے لگا کر
چھاتی سے لگو اٹھ کے کھڑی روتی ہیں مادر
ہم روتے ہیں دیکھو تو ذرا آنکھ اٹھا کر
افسوس اسی طور سے غفلت میں رہو گی
کیا آخری بابا کی زیارت نہ کرو گی

سنکر یہ سخن شاہ کے آنسو نکل آئے
بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے

منہ دیکھ کے بانوؑ کا سخن لب پہ یہ لائے   کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اسکو بچائے
جس صاحب آزار کا یہ حال ہو گھر میں
دانستہ میں کیونکر اُسے لے جاؤں سفر میں

کہکر یہ سخن بیٹھ گئے سیدؑ خوشخو   اور سورۂ الحمد پڑھا تھام کے بازو
بیمار نے پائی گل زہرا کی جو خوشبو   آنکھوں کو تو کھولا پہ ٹپکنے لگے آنسو
ماں سے کہا مجھ میں جو حواس آئے ہیں اماں
کیا میرے مسیحا مرے پاس آئے ہیں اماں

ماں نے کہا ہاں ہاں وہی آئے ہیں مری جاں   جو کہنا ہے کہہ لو کہ یہاں اور ہے ساماں
دیکھو تو ادھر روتے ہیں بی بی شہ ذیشاں   صغرا نے کہا انکی محبت کے میں قرباں
وہ کونسا ساماں ہے جو یوں روتے ہیں بابا
کھل کر کہو کیا مجھ سے جدا ہوتے ہیں بابا

یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لئے باہر   نہ فرش نہ ہے مسند فرزند پیمبرؐ
دالان سے کیا ہو گیا گہوارۂ اصغرؑ   اجڑا ہوا لوگو نظر آتا ہے مجھے گھر
کچھ منہ سے تو بولو مرا دم گھٹتا ہے اماں
کیا سبط پیمبر سے وطن چھٹتا ہے اماں

شبیرؑ کا منہ تکنے لگی بانوئے مغموم   صغرا کیلئے رونے لگیں زینبؑ و کلثومؑ
بیٹی سے یہ فرمانے لگے سید مظلوم   پردہ رہا اب کیا تمھیں خود ہو گیا معلوم
تم چھٹتی ہو اس واسطے سب روتے ہیں صغرا
ہم آج سے آوارۂ وطن ہوتے ہیں صغرا

اب شہر میں اک دم بھی ٹھہرنا مجھے دشوار   ہیں پا بہ رکاب اور ہو تم صاحب آزار
پھر آتا ہے وہ گھر میں سفر میں جو ہو بیمار   تکلیف تمہیں دوں یہ مناسب نہیں زنہار
غربت میں بشر کے لئے سو طرح کا ڈر ہے
میرا تو سفر رنج و مصیبت کا سفر ہے

یوں جلتی ہے خاک اڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام   جنگل میں نہ راحت نہ کہیں راہ میں آرام
بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام   دریا کہیں حائل کہیں پانی کا نہیں نام
صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گزر جائے
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

صغرا نے کہا کھانے سے خود ہی مجھے انکار   پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار
کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کی یہ بیمار   تبرید فقط آپ کا ہے شربت دیدار
گرمی میں بھی راحت سے گذر جائے گی بابا
آئے گا پسینہ تپ اتر جائے گی بابا

کیا تاب اگر منہ سے کہوں درد ہے سر میں   اف تک نہ کروں بھڑکے اگر آگ جگر میں
بھولے سے بھی شب کو نہ کراہوں گی سفر میں   قربان گئی چھوڑ نہ جاؤ مجھے گھر میں
ہو جانا خفا راہ میں گر روئے گی صغرا
یاں نیند کب آتی ہے جو واں سوئے گی صغرا

وہ بات نہ ہوگی کہ جو بے چین ہوں مادر   ہر صبح میں پی لوں گی دوا آپ بنا کر
دن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغر   لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر
میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو

بابا مجھے فضہ کی سواری میں بٹھا دو

شہ بولے کہ واقف ہے مرے حال سے اللہ — میں کہہ نہیں سکتا مجھے درپیش ہے جو راہ
کھل جائیگا یہ راز بھی گو تم نہیں آگاہ — ایسا بھی کوئی ہے جسے بیٹی کی نہ ہو چاہ
ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغرا
ہے مصلحت حق یہی جو کہتا ہوں صغرا

اے نور بصر آنکھوں پہ لیکر تجھے چلتا — تو مجھ سے بہلتی مرا دل تجھ سے بہلتا
تپ ہے تجھے اور غم سے جگر ہے مرا جلتا — یہ ضعف کہ دم تک نہیں سینے میں سنبھلتا
جز ہجر علاج اور کوئی ہو نہیں سکتا
دانستہ تمہیں ہاتھ سے میں کھو نہیں سکتا

منہ تکنے لگی ماں کا وہ بیمار بصد غم — چتون سے عیاں تھا کہ چلیں آپ بھی ہم
ماں کہتی تھی مختار ہیں بی بی شہ عالم — میرے تو کلیجے پہ چھری چلتی ہے اس دم
وہ درد ہے جس درد سے چارا نہیں صغرا
تقدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغرا

صغرا نے کہا کوئی کسی کا نہیں زنہار — سب کی یہی مرضی ہے کہ مر جائے یہ بیمار
اللہ! نہ وہ آنکھ کسی کی ہے نہ وہ پیار — اک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا سب کے ہیں غمخوار
بیزار ہیں سب ایک بھی شفقت نہیں کرتا
سچ ہے کوئی مردے سے محبت نہیں کرتا

ہمشیر کے عاشق ہیں سلامت رہیں اکبر — اتنا نہ کہا مر گئی یا جیتی ہے خواہر؟
میں گھر میں تڑپتی ہوں وہ ہیں صبح سے باہر — وہ کیا کریں برگشتہ ہے اپنا ہی مقدر

پوچھا نہ کسی نے کہ وہ بیمار کدھر ہے
نہ بھائیوں کو دھیان نہ بہنوں کو خبر ہے

کیا انکو پڑی تھی جو وہ غم کھانے کو آتے | میں کون ہوں جو صورت مجھے دکھلانے کو آتے
ہوتی جو غرض چھاتی سے لپٹانے کو آتے | زلفیں جو الجھتیں تو سلجھوانے کو آتے
کل تک تو مرے حال پریشان پہ نظر تھی
تقدیر کے اس پیچ کی مجھکو نہ خبر تھی

مانوس سکینہ سے ہیں عباس دلاور | میں کون ہوں جو میری خبر پوچھتے آکر
سرسبز رہے خلق میں تو بادہ شبّر | شادی میں بلائیں مجھے یہ بھی نہیں باور
بے دولہا بنے منہ کو چھپاتے ہیں ابھی سے
میں جیتی ہوں اور آنکھ چراتے ہیں ابھی سے

کس سے کہوں اس درد کو میں بیکس و رنجور | بہنیں بھی الگ مجھ سے ہیں اور بھائی بھی ہیں دور
اماں کا سخن یہ ہے کہ بیٹی میں ہوں مجبور | ہمراہی بیمار کسی کو نہیں منظور
دنیا سے سفر رنج و مصیبت میں لکھا تھا
تنہائی کا مرنا مری قسمت میں لکھا تھا

سب بیبیاں رونے لگیں سن سن کے یہ تقریر | چھاتی سے لگا کر اسے کہنے لگے شبیر
لو صبر کرو کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر | منہ دیکھ کے چپ رہ گئی وہ بیکس و دلگیر
نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے
اچھا تو کہا منہ سے پہ آنسو نکل آئے

بانو کو اشارہ کیا حضرت نے کہ جاؤ | اکبر کو بلاؤ علی اصغر کو بھی لاؤ

آئے علی اکبرؑ تو کہا شاہ نے آؤ　　روٹھی ہے بہن تم سے گلے اُسکو لگاؤ
چلتے ہوئے جی بھر کے ذرا پیار تو کر لو
پینے اُنھیں کب آؤ گے اقرار تو کر لو
پاس آن کے اکبر نے یہ کی پیار کی تقریر　　کیا مجھ سے خفا ہو گئیں صغرا مری تقصیر
چلّانے لگی چھاتی پہ منہ رکھ کے وہ دلگیر　　محبوب برادر ترے قربان یہ ہمشیر
صدقے ترے سر پر سے اُتارے مجھے کوئی
بل کھائی ہوئی زلفوں پہ وارے مجھے کوئی
رُخساروں پہ سہرے کے نکلنے کے ہیں صدقے　　تلوار لئے شان سے چلنے کے ہیں صدقے
افسوس سے اِن ہاتھوں کے ملنے کے ہیں صدقے　　کیوں روتے ہو اشک آنکھوں کے ڈھلنے کے ہیں صدقے
جلد آن کے بہنا کی خبر لیجیو بھائی
بے میرے کہیں بیاہ نہ کر لیجیو بھائی
پیارے مرے بھیا مرے مہرو علی اکبرؑ　　چھپ جائینگے آنکھوں سے یہ گیسو علی اکبرؑ
یاد آئیگی یہ جسم کی خوشبو علی اکبرؑ　　ڈھونڈھینگی یہ آنکھیں تمھیں ہر سو علی اکبرؑ
دل سینے میں کیونکر تہ و بالا نہ رہے گا
جب چاند چھپے گا تو اُجالا نہ رہے گا
کیا گزریگی جب گھر سے چلے جاؤ گے بھائی　　کیسے مجھے ہر بات میں یاد آؤ گے بھائی
تشریف خدا جانئے کب لاؤ گے بھائی　　کی دیر تو جیتا نہ ہمیں پاؤ گے بھائی
کیا دم کا بھروسہ کہ چراغِ سحری ہوں
تم آج مسافر ہو تو ہم کل سفری ہیں

ہاں سچ ہے کہ بیمار کا بستر نہیں جانا　　صحت سے جو ہیں اُن میں کہاں میرا ٹھکانا
بھیّا جواب آنا تو مری قبر پہ آنا　　ہم گور کی منزل کی طرف ہونگے روانا
کیا لطف کسی کو نہیں گر چاہ ہماری
وہ راہ تمھاری ہے تو یہ راہ ہماری

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغرا ترے قربان　　گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جان
بیکس مری بچی ترا اللہ نگہبان　　صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آن
کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا
کنبہ کے لئے جان کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ وزاری　　اصغر مرا روتا ہے صدا سن کے تمھاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری　　آ آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جانتے ہو اور سا تجھ بہن جا نہیں سکتی　　تب پر تمھیں چھاتی سے میں لپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی　　رکھ لوں تمھیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی
بے کس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمھیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

معصوم نے جس دم یہ سنی درد کی گفتار　　صغرا کی طرف ہاتھوں کو لٹکا دیا اک بار
لے لے کے بلائیں یہ لگی کہنے وہ بیمار　　جھک جھک کے دکھاتے ہو مجھے آخری دیدار
دنیا سے کوئی دن میں گذر جائے گی صغرا

تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ مرجائے گی صغرا

مثال ۲۔ انھیں واقعات کو ایک دوسرے موقعہ پر لکھا ہے ؂

باتیں یہ ابھی تھیں کہ شہ بحر و بر آئے دیکھا رخ ہمشیر کو اور اشک بہائے
ماں بیٹھی تھی صغرا کو جو چھاتی سے لگائے روتے ہوئے تشریف شہ دیں وہیں لائے

بیٹی شہ ذیجاہ کی تعظیم کو اٹھی
بستر سے عصا تھام کے تسلیم کو اٹھی

جلد اسکے قریب آکے یہ کہنے لگے حضرت بیٹھو کہ ابھی اٹھنے کی تم میں نہیں طاقت
اک ضعف کی تصویر ہو ایسی ہے نقاہت کیوں رات کو کیسی رہی بی بی کی طبیعت

تپ میں جو کراہی تھیں تو گھبرائے تھے صغرا
بیہوش تھیں تم شب کو بھی ہم آئے تھے صغرا

صحت دے تمھیں حق یہی بابا کی دعا ہے اولاد کو راحت ہو تو جینے کا مزا ہے
اب بادیہ پیمائی ہے ایذا ہے بلا ہے کیا جانیے شبیر کی تقدیر میں کیا ہے

دل جلتا ہے جب تپ میں تمھیں پاتا ہوں صغرا
اس رنج سے میں اور گھلا جاتا ہوں صغرا

ایسا سفر صعب اور اس طرح کا بیمار ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائے کہیں راہ میں آزار
کیا نرگسی آنکھوں سے نقاہت ہے نمودار سب زرد ہے ازمانِ حرارت سے تن زار

چہرے پہ کسی روز بحالی نہیں پاتا
سرعت سے کبھی نبض کو خالی نہیں پاتا

دم چڑھتا ہے بستر سے اٹھائی ہو اگر سر بی بی کہو محمل میں چڑھا جائے گا کیوں کر
گھر میں تمھیں پانی کی پھڑک رہتی ہے دن بھر پھر کیا ہو کسی دن جو نہ پانی ہو میسر
ہم جانیکے قابل نہیں ہیں رہ نہیں سکتا
نسبت سے ہے وہ تشویش کہ کچھ کہہ نہیں سکتا
گھر میں تمھیں چھوڑوں یہ نہیں دل کو گوارا لیجاؤں تو بچنا نہیں ممکن ہے تمھارا
بچوں میں کوئی تم سے زیادہ نہیں پیارا مجبور ہوں بجز ہجر نہیں اب کوئی چارا
فرقت میں سدا نالہ و فریاد کروں گا
اُتروں گا جو منزل پہ تمھیں یاد کروں گا
صغرا نے کہا آپکی الفت کے میں قربان پھر کسکو ہو گر آپ کو لونڈی کا نہ ہو دھیان
صدقے گئی صحت کا بھی ہو جائیگا سامان مولا کی توجہ ہے ہر اک درد کا درمان
جس پہ نظر لطف مسیح دوسرا ہو
برسوں کا ہو بیمار تو اک دم میں شفا ہو
قربان گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت تپ کی بھی ہے شدت میں کئی روز سے خفت
بستر سے میں خود اٹھ کے ٹہلتی بھی ہوں حضرت پانی کی بھی خواہش ہے غذا کی بھی ہے رغبت
حضرت کی دعا سے مجھے صحت کا یقین ہے
اب تو مرے منہ کا بھی مزا تلخ نہیں ہے
کیوں روتے ہو بابا یہ تردد کی نہیں جا سب سہل ہے کچھ مجکو نہیں ہونے کی ایذا
پہلے سے کہے دیتی ہوں اے سید والا میں خانۂ ویراں میں نہیں رہنے کی تنہا
اب روح مرے جسم میں گھبراتی ہے بابا

اِن باتوں سے کچھ بوئے فراق آتی ہے بابا
مرجاؤنگی بچھڑی جو مسیح دوسرا سے صحت مجھے ہو جائیگی حضرت کی دعا سے
کٹ جائیگا اندوہِ سفر فضل خدا سے بیماری ہیں جان آئیگی جنگل کی ہوا سے
سب ساتھ ہیں روؤنگی نہ غم کھاؤں گی بابا
لیٹی ہوئی محمل میں چلی جاؤں گی بابا
شہ نے کہا تم حال سے میرے نہیں آگاہ مجبور نکلتا ہوں میں اس شہر سے واللہ
آفت کا ہے بی بی یہ سفر خوف کی ہے راہ بیمار ہو کس طرح سے لے جاؤں تمھیں آہ
آزار رسیدہ ہوں گرفتارِ بلا ہوں
گھر چھوڑ کے جلادوں کی سرحد میں چلا ہوں
وہ صعب پہاڑوں کا سفر اور وہ کڑے کوس دن رات مسافر پہ کبھی دھوپ کبھی اوس
ایک ایک قدم رنج و الم حسرت و افسوس ہوتا نہیں جز خار کوئی آ کے قدم بوس
آرام کہیں راہ میں جانی نہیں ملتا
جنگل ہیں وہ پُر ہَول کہ پانی نہیں ملتا
تھوڑے ہی دنوں ہوئیگی کنبے سے جدائی پردیس سے آکر تمھیں لے جائینگے بھائی
کی مجھ سے نہ گر کوفے کی خلقت نے بُرائی ممکن ہو کہ میں اور نہ کروں وعدہ وفائی
خوش ہونگا تم اب دل پہ اگر جبر کرو گی
مرجاؤں گا جب میں تو نہ کیا صبر کرو گی
ثابت ہوا صغرا پہ کہ اب ہم رہے گھر میں بس پھر گئی تنہائی کی تصویر نظر میں
اک جوش ہوا آنسوؤں کا دیدۂ تر میں صدمے سے کھٹک درد کی پیدا ہوئی سر میں

شکل اپنی شبِ ہجر جو دکھلا گئی اُس کو
کانپا یہ تنِ زار کہ تپ آ گئی اُس کو

تھرّاتی ہوئی اُٹھ کے گری شہ کے قدم پر — کی عرض کہ مر جاؤں گی یا سبطِ پیمبرؐ
تنہائی میں بابا مرا دل بہلے گا کیونکر — سب بیٹیاں ہیں کیا میں نہیں آپکی دختر
بے آپ کے اس گھر میں نہ یا شاہ رہونگی
اچھا میں کنیزوں ہی کے ہمراہ رہوں گی

سب رونے لگے سُن کے یہ بیمار کی تقریر — چلّائی سکینہ کہ میں صدقے مری ہمشیر
گھبرا کے یہ فرمانے لگے حضرتِ شبیرؑ — تم بیٹی کو سمجھاؤ کچھ اے بانوئے دلگیر
کم سن ہیں مسافر مجھے تشویش بڑی ہے
دن چڑھتا ہے اور آج کی منزل بھی کڑی ہے

یہ سُنتے ہی بس ماں کی تو چھاتی اُمنڈ آئی — چلّائی وہ ناشاد کہ ہے ہے مری جائی
زینبؑ نے کہا گھر سے نکلتا ہے یہ بھائی — مر جانے سے کچھ کم نہیں صغرا کی جدائی
گھر لٹتا ہے کس طرح قیامت نہ بپا ہو
پہلا ہے یہ غم آگے خدا جانئے کیا ہو

آغازِ سفر میں تو یہ ماتم ہے یہ کہرام — کیا دیکھیں دکھاتا ہے اِس آغاز کا انجام
جنگل ہو کہ بستی ہو کہاں راحت و آرام — ماں روئے گی بیٹی سے بچھڑ کر سحر و شام
بستی بھی ہے جنگل جو کلیجہ نہ ہو بر میں
بھولیگی وہ ؟ چھوڑینگے اکیلا جسے گھر میں

صغراؑ نے کہا آپ کی باتوں کے میں قربان — تم جان بچا لو کہ میں لونڈی ہوں پھوپی جان

بیٹی ہو علیؑ کی مری مشکل کرو آسان　　جیتی رہی صغراؑ تو نہ بھولے گی یہ احسان
کچھ بات بجز گریہ و زاری نہیں کرتیں
امّاں تو سفارش بھی ہماری نہیں کرتیں

بیماری ہیں جو دو بیٹیاں وہ جائینگی ہمراہ　　کیا اُنس کہ میں گور کنارے بھی ہوں آہ
بابا کو نہ امّاں کو نہ بہنوں کو مری چاہ　　سب جیتے رہیں خیر ہمارا بھی ہے اللہ
بھولے سے نہ اب خاطرِ ناشاد کرینگے
میں قبر میں جب ہونگی تو سب یاد کرینگے

کیا خلق میں لوگو کوئی ہوتا نہیں بیمار　　ہے کون سی تقصیر کہ سب ہو گئے بیزار
زندہ ہوں پہ مردہ کی طرح ہو گئی دشوار　　کیوں بھاگتے ہیں سب مجھے ہے کونسا آزار
حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اس کا
وہ آنکھ چُرا لیتا ہے مُنہ تکتی ہوں جس کا

تب کیا مجھے آئی کہ پیامِ اجل آیا　　ہے ہے مری راحت کی بنا میں خلل آیا
چھوڑا مجھے سب نے جو سفر کا محل آیا　　کیا خوب مرے نخل تمنا میں پھل آیا
دل سخت کیا ماں نے مجھے غم ہے اسی کا
سچ ہے کہ زمانے میں نہیں کوئی کسی کا

وہ چاہنے والا ہے مصیبت میں جو کام آئے　　میں سب کی ہوئی اور کوئی میرا نہ ہوا ہائے
اس راہ میں ہمراہ کنیزیں تو ہوں اے وائے　　کنبے کی جو ہو چاہنے والی وہی رہ جائے
بیماری مرض میں دوا خوب ہوئی ہے
تجویز مرے واسطے کیا خوب ہوئی ہے

تنہائی میں رونے سے اُتر جائیگی یہ تپ　　ہاں درد بھی سر میں مرے ہوئیگا نہیں اب
تڑپونگی تو جائیگی یہ اعضا شکنی سب　　بہتر یہی ترکیب ہے نسخہ یہی انسب
کم ہوگی حرارت الم و رنج و محن میں
غم کھانے سے آجائیگی طاقت مرے تن میں

تنہائی میں شدت بھی نہ ہوگی خفقاں کی　　بیمار کا دل بہلے گا وحشت سے مکاں کی
تڑپونگی نہ فرقت میں امام دوجہاں کی　　شفقت مجھے یاد آئیگی بہنوں کی نہ ماں کی
فرقت میں مری طرح جگر کس سے سنبھلتا
میں گھر میں نہ ہوتی تو یہ گھر کس سے سنبھلتا

سب جانے والے ہیں کروں کس کی شکایت　　بابا کی یہ تقریر ہے بہنوں کی یہ صورت
چھوڑا ہمیں بس دیکھ لی اماں کی محبت　　بولیں نہ پھوپی جان بھی کچھ وا دری قسمت
فرقت کا الم میرے کلیجہ کو چھری ہے
سب اچھے ہیں لوگو مری تقدیر بُری ہے

عاشق مرے مشہور ہیں سجّاد گئے ہیں واری　　دو دن سے خبر بھی نہیں لی آکے ہماری
قاسم کو غرض کیا جو سنیں گریہ و زاری　　میں کون ہوں؟ سکینہ ہے چچا جان کو پیاری
اللہ تو ہے گر کوئی غمخوار نہیں ہے
مٹی مری کچھ قبر کو دشوار نہیں ہے

اُس وقت صحت مری ہو جائے گی حالی　　جب راہ میں خط پڑھ کے کہینگے شہ عالی
لو مر گئی کنبے کی جو تھی چاہنے والی　　آباد جو حجرہ تھا وہ اب ہو گیا خالی
قسمت نے سنائی خبر مرگ سفر میں

وہ قبر میں سوئی جسے چھوڑ آئے تھے گھر میں

پھر ہم نہیں ملنے کے کوئی لاکھ ہو جو یا سب رو کے کہیں گے کہ اسے ہاتھ سے کھویا
عالم سے وہ بیگانہ ہے جو قبر میں سویا کیا نفع اسے کوئی کڑھا یا کوئی رویا
پُرسے کے لئے جمع ہوئے لوگ تو پھر کیا
پردیس میں کنبے نے رکھا سوگ تو پھر کیا

ہاں ذکر یہ سُنتا آئے جو روتے ہوئے اکبرؑ سُرخ آنکھیں تھیں اور زرد تھا غم سے رُخِ انور
چلّائی بہن بھائی کی چھاتی سے لپٹ کر اس سینے کے اِن ہاتھوں کے قربان خواہر
فریاد ہے بے موت بہن مرتی ہے بھائی
تقدیر ہمیں تم سے جدا کرتی ہے بھائی

بھیا مری تنہائی پہ آنسو نہ بہاؤ وہ دن ہوں کہ پھر خیر سے اس شہر میں آؤ
ہر چند یہ مشکل ہے کہ جیتا ہمیں پاؤ صدقے گئی پھر آنے کا وعدہ کئے جاؤ
عرصہ ہو تو خط لکھ کے طلب کیجیو بھائی
اب بیاہ میں مجھ کو نہ بھلا دیجیو بھائی

رونے کا اُدھر غُل تھا کہ فضّہ یہ پکاری تیار ہے ناموس محمدؐ کی سواری
دروازے کے نزدیک ہے زینبؑ کی عماری کیا دیر ہے اب آئیے بد اللہ کی پیاری
ہر بار قناتوں کے قریب آتے ہیں عباسؑ
اب جلد سواری ہو یہ فرماتے ہیں عباسؑ

شبیرؑ نے رو کر کہا لو جاتے ہیں صغراؑ جلد آتے ہیں یا خود تمہیں بلواتے ہیں صغراؑ
ہم سب تری تنہائی کا غم کھاتے ہیں صغراؑ جاں اپنی نہ کھو دینا تمھیں سمجھاتے ہیں صغراؑ

قربان پدر آب و غذا ترک نہ کیجو
بڑھ جائے گا آزار دوا ترک نہ کیجو

بیٹی سے یہ فرما کے چلے قبلۂ عالم ناموس محمدؐ بھی چلے ساتھ بصد غم
صغراؑ بھی چلی جاتی تھی روتی ہوئی باہم ہمسائیاں باندھے ہوئے تھیں حلقۂ ماتم
راحت تھی جو سب کو شہ ذیجاہ کے دم سے
اک بیٹی تھی ایک لپٹتی تھی قدم سے

غل تھا شہ ابرار خدا حافظ و ناصر رانڈوں کے مددگار خدا حافظ و ناصر
اے خلق کے سردار خدا حافظ و ناصر محتاجوں کے غمخوار خدا حافظ و ناصر
دکھ فاقوں کے غربت کے الم کس سے کہینگے
مشکل کوئی اب ہوگی تو ہم کس سے کہینگے

صغراؑ کو نقاہت سے نہ تھی طاقت رفتار اٹھی کئی بار اور گری در پہ کئی بار
جس ناقے پہ تھی بانوئے ناشاد دل افگار اس ناقے کے پاس آکے یہ چلائی وہ بیمار
قربان گئی آخری دیدار دکھا دو
اماں مجھے اصغرؑ کو پھر اک بار دکھا دو

مضطر ہوئی سن کر یہ خبر بانوئے بے پر پردے سے جگر بند کا منہ بند کر دیا باہر
بیٹی سے کہا دست پسر ماتھے پہ رکھکر لو آخری تسلیم بجا لاتے ہیں اصغرؑ
منہ زرد ہے رخساروں پر آنسو بھی بہے ہیں
یہ نرگسی آنکھوں سے تمھیں دیکھ رہے ہیں

تھراتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر وہ پکاری اس ہاتھ کے اس چاند سے ماتھے کے میں واری

آخر کوئی دن میں ہے بس اب موت ہماری — بھیّا نہیں جینے کی میں فرقت میں تمہاری
جب آکے پھر اس جھولے کو آباد کرو گے
تم بھی مری گودی کو بہت یاد کرو گے

عباسؑ سے شہ نے کہا اے ثانیِ حیدرؑ — مر جائے گی اب فاطمہ صغراؑ مری دختر
حمّالوں سے کہدو کہ بڑھیں اونٹوں کو لیکر — اسواریوں کے ساتھ رہیں قاسمؑ و اکبرؑ
احباب جو روتے ہیں تو غم کھاتے ہیں ہم بھی
سب شہر کے ناکے پہ تمہیں آتے ہیں ہم بھی

مثال ۳۔ حضرت علی اکبرؑ کی رخصت اور باپ ماں کی حالت سے

مومنو مرنے کو ہمشکل نبیؐ جاتا ہے — دولتِ بانوئے بیکس پہ زوال آتا ہے
کیا الم ہے کہ جگر سینے میں تھرّاتا ہے — داغ بیٹے کا فلک باپ کو دکھلاتا ہے
ماں تڑپتی ہے شہ جن و بشر روتے ہیں
کس جواں بیٹے سے ماں باپ جدا ہوتے ہیں

بیٹا کیا جاتا ہے ہوتا ہے بھرا گھر برباد — ہوتی ہے دولتِ فرزندِ پیمبرؐ برباد
کرتے ہیں اپنی جوانی علی اکبرؑ برباد — جان کھوتا ہے پدر ہوتی ہے مادر برباد
داغِ اولاد ہے یاں صبر کا مقدور نہیں
پہلے فرزند سے مر جائیں تو کچھ دور نہیں

ایسا بیٹا جسے اٹھارہ برس پالا ہے — گھر سے جاتا ہے وہی گھر کا جو اجیالا ہے
تفرقہ چرخِ ستمگر نے عجب ڈالا ہے — کیا کریں صبر کلیجہ بھی تہ و بالا ہے

دل کی بیتابی ہر اک آن سوا ہوتی ہے
روح ماں باپ کے قالب سے جدا ہوتی ہے

داغِ اولاد نہیں آہ اُٹھایا جاتا ایسا بیٹا نہیں ہاتھوں سے گنوایا جاتا
درد وہ ہے کہ زباں پر نہیں لایا جاتا زخم وہ ہے کہ جگر پر نہیں کھایا جاتا

داغِ فرزند حسینؑ ابنِ علیؑ سے پوچھو
نوجواں بیٹے کا غم باپ کے جی سے پوچھو

سوچیں سب صاحبِ اولاد کہ کیا مشکل ہے تا کجا صبر کہ ماں باپ کا آخر دل ہے
پہلے فرزند سے بابا کا جگر گھائل ہے زخم اکبر نے نہیں کھائے پہ ماں بسمل ہے

پار جب سینے سے برچھی کی انی ہووے گی
کیا غضب ہووے گا کیا سینہ زنی ہووے گی

باندھتا ہے وہ کمر اور کمر شاہ ہے خم تیغ سجتا ہے پسر باپ کے دم میں نہیں دم
شان سے شانے پہ رکھتا ہے کماں وہ ضیغم تیرِ غم لگتے ہیں مادر کے جگر پہ پیہم

تن پہ چار آئینہ سجنے کا وہاں ساماں ہے
چار پارا ہے جگر ماں کا پدر حیراں ہے

واقعی دولتِ اولاد عجب دولت ہے اُسکے راحت ہی تو ماں باپ کو بھی راحت ہے
نوجواں بیٹے کا مرنا بھی بڑی آفت ہے زندگی تلخ ہے پھر جینے کی کیا لذت ہے

اُس کا دل دیکھیے چھٹے باپ سے جس کا بیٹا
اور بیٹا بھی تو ہمشکل نبیؐ سا بیٹا

ہیں مسیں بھیگتی اٹھارہ برس کا ہے سن تشنہ ہیں مائی ہیں مادر نے مرادوں کے ہیں دن

رنج ہیں کاٹی ہیں دکھ درد کی راتیں گن گن — پالنے والی کو چین آئے گا کیونکر اس بن
ماں کو حسرت ہے دلہن بیاہ کے گھر لانے کی
فکر یاں عین جوانی میں ہے مر جانے کی

ماں کو منظور ہے جاوے نہ کہیں نورِ نظر — اور فرزند کو درپیش ہے دنیا سے سفر
باپ کو غم ہے کہ چھٹتا ہے برابر کا پسر — سیدھی ہو سکتی نہیں خم ہوئی جاتی ہے کمر
بھائی کے واسطے قاسم کی دلہن روتی ہے
پکڑے دامانِ قبا چھوٹی بہن روتی ہے

رن کو جانے کیلئے بانو کے جائے ہیں کھڑے — شوق ہے جنگ کا ہتھیار لگائے ہیں کھڑے
ہاتھ جوڑے ہوئے گردن کو جھکائے ہیں کھڑے — ماں سے مرنے کے لیے آنکھ چرائے ہیں کھڑے
شاہ خاموش ہیں پر بول نہیں سکتے ہیں
کبھی بانو کا کبھی بیٹے کا منہ تکتے ہیں

دل سے فرماتے ہیں یہ دیکھئے اب ہوتا ہے کیا — بانو دیتی ہے کہ بیٹے کو نہیں دیتی رضا
صبر کی جا نہیں ہوتا ہے پسر ماں سے جدا — اب خدا خیر کرے ہے یہی مر جانے کی جا
جسم کانپے گا قلق ہوگا غش آ جائے گا
حرفِ رخصت کا نہ بانو سے سنا جائے گا

بانو کہتی ہے کہ کیا کہتے ہیں اکبر یا شاہ — انکے جو دل میں ہے کچھ آپ ہیں اس سے آگاہ
دیکھتی ہوں میں کہ حضرت کی بھی حالت ہے تباہ — ماجرا کیا ہے یہ کچھ مجھ سے تو کہیے للہ
منہ سے کچھ کہتے نہیں پاسِ ادب کرتے ہیں
کونسی چیز ہے جو ماں سے طلب کرتے ہیں

شاہ فرماتے ہیں بانوؑ سے کہ اے نیک نہاد　　رازداں ہوتی ہو ماں بیٹے کی بابا سے زیاد
پوچھو اکبرؑ سے کہیں گے جو کچھ انکی ہو مراد　　حق نہ ماں باپ کو دکھلائے فراقِ اولاد
تھا مقدر ہیں کہ سب ہو ویں جدا ہم دیکھیں
اب بھی اٹھ جائیں جہاں سے تو نہ یہ غم دیکھیں

سن کے یہ بانوؑ نے فرزند سے پوچھا رو رو　　کیا کہا چاہتے ہو ماں سے تو اے لال کہو
ہاتھ کیوں جوڑے ہو ان ہاتھوں کے میں صدقے ہو　　کہا اکبرؑ نے رضا مرنے کی اماں ہمیں دو
صبر فرماؤ کہ اب تم سے جدا ہوں گے ہم
دودھ بخشو ہمیں بابا پہ فدا ہوں گے ہم

یہ سخن سنتے ہی فرزند سے ماں ہو گئی زرد　　دھیان آیا کہ چلا ہائے پسر بہر نبرد
مردنی پھر گئی چہرے پہ اٹھا دل میں درد　　دیکھ منہ بیٹے کا کہنے لگی بھر کر دمِ سرد
تم سے بچھڑونگی تو واری میں کدھر جاؤں گی
پھر نہ رخصت کا سخن کہنا کہ مر جاؤں گی

کہا اکبرؑ نے کہ بہتر ہے نہ دیجے رخصت　　خیر مرنے کو نہ جاوینگے نہ کیجے رخصت
پسرِ بابا سے ہوئے بھائی بھتیجے رخصت　　مجھکو بھی دھیان یہ تھا آپ سے لیجے رخصت
ماں سے فرزند کو تلوار کا یارا کیا ہے
تابع حکم ہیں ہم زور ہمارا کیا ہے

سب نے قربان کیے زہراؑ کے پسر فرزند　　کٹ گئے تیغوں سے کس کس کے جگر کے پیوند
میں نے چاہا تھا کہ ہو آپ کا بھی نام بلند　　پر تعجب ہے کہ آئی نہ مری عرض پسند
آپ کہتی ہیں نہ جاؤ تو نہ جاویں گے ہم

اپنے ہم چشموں کو پھر منہ نہ دکھاویں گے ہم

جائیگا سوئے یثرب تو نہ جائے گا غلام　　کام بابا کے نہ آئے تو وطن سے کیا کام
خیمے کے لوٹنے کو آئے گا جب لشکرِ شام　　قید ہم ہونگے کہ لڑنے کا یہی ہے ہنگام
آبرو پاتے جو سر تیغ سے کٹواتے ہم
طوق و زنجیر کی ایذا سے بھی چھٹ جاتے ہم

آج جو مرتے تو داخل شہدا میں ہوتے　　پائینتی باپ کے آرام سے رن میں سوتے
لاش پر کہتے ملک ہائے علیؑ کے پوتے　　حشر تک ہم کو عزادار جہاں میں روتے
جو ہے منظور ہمیں آپ کو منظور نہیں
اب بھی فرماؤ تو میدانِ وغا دور نہیں

بولی ماں ہو گئے آزردہ میں واری بیٹا　　گلہ آمیز یہ باتیں ہیں تمہاری بیٹا
باپ پیارا ہے تمھیں ماں نہیں پیاری بیٹا　　دھیان اپنا ہے نہیں فکر ہماری بیٹا
پہلو بابا کا تو آباد کیا چاہتے ہو
پالنے والی کو برباد کیا چاہتے ہو

علی اکبرؑ مری محنت کی طرف دھیان کرو　　اماں واری مری بستی کو نہ ویران کرو
چھوڑ کر ماں کو نہ تم کوچ کا سامان کرو　　پھر فدا ہو جیو پہلے مجھے قربان کرو
مرے جیتے نہ قدم گھر سے نکالو بیٹا!
اپنی مادر کا جنازہ تو اٹھا لو بیٹا!

ماں کی تقریر سے مایوس ہوئے جب اکبرؑ　　اشک آنکھوں سے بہے چاند سے رخسار پہ
رکھ دی تلوار لگے کھونے ہاتھوں سے کمر　　بانوؑ گھبرا گئی ٹکڑے ہوا زینبؑ کا جگر

لے کے بیٹے کی بلائیں کہا کیوں روتے ہو
لو نہ رو کوں گی ہیں کاہے کو خفا ہوتے ہو

رو کے کہنے لگے بیٹے سے امام خوش خو — ماں تو دیتی ہے رضا مرنے کی آزردہ نہ ہو
پھر کہا بانو سے اب مرنے کی رخصت انہیں دو — تھا مقدر میں یہی صبر کرو شکر کرو
یہ دعا مانگو کہ تڑپے نہ کلیجا میرا
آزماتا ہے مرے صبر کو مولا میرا

تم نے اٹھارہ برس کھینچے ہیں گو رنج و تعب — بانوئے خواہش تقدیر سے ناچار ہیں سب
اسکا میں کون ہوں تم کون ہو جو مرضی اب — زور کیا جسکی امانت ہے وہ کرتا ہے طلب
اب نہیں جینے کے عمر اتنی ہی یہ لائے تھے
خلق میں داغ دکھانے کو ہمیں آئے تھے

شہ نے سمجھایا تو بانو نے کہا یہ رو کر — کیوں کمر کھولتے ہو غصے سے صدقے مادر
ماں سے چلتے ہوئے آزردہ نہ جاؤ اکبر — خیر جو مرضی ہے اچھا کرو دنیا سے سفر
اب تو راضی ہوئے مادر سے ہیں واری بیٹا
آگے آؤ کہ بلائیں لوں تمھاری بیٹا

سن کے ماں سے یہ سخن قدموں پہ فرزند گرا — عرض کی آپ سے روٹھوں مرا مقدور ہے کیا
ماں نے چھاتی سے لگا کر کہا صدقے بیٹا — جاؤ رخصت بھی کیا دودھ بھی تمکو بخشا
غم نہ کھانا کہ یہ ماں رو رو کے مر جائے گی
ساتھ دو باپ کا ماں کی بھی گذر جائے گی

کہکے یہ روئی جواں بیٹے کو چھاتی سے لگا — غل ہوا بانو نے دی مرنے کی اکبر کو رضا

خاک پر سید سجاد نے سر دے پٹکا　　روکے چلانے لگیں بہنیں کہ ہئے ہے بھیا
کچھ زباں سے علی اصغرؑ جو نہ کہہ سکتا تھا
جھولے سے رو رو کے بھائی کی طرف تکتا تھا

کہتی تھی پیٹ کے سر زینبؑ مضطر ہے ہے　　نوجواں مرنے چلا بھائی کا دلبر ہے ہے
بانو لوٹی گئی برباد ہوا گھر ہے ہے　　ہم سے پردیس میں چھوٹے علی اکبرؑ ہے ہے
پاس کوئی نہیں تنہا شہ مظلوم ہوئے
ہائے نانا کی زیارت سے بھی محروم ہوئے

چھوڑ کر روتا انھیں خیمے سے اکبرؑ نکلے　　پیچھے فرزند کے روتے ہوئے سرور نکلے
پر عجب حال سے ہمشکل پیمبرؐ نکلے　　مڑ کے تکتے تھے کہ خیمے سے نہ مادر نکلے
ماں کے رونے کی جو کانوں میں صدا آتی تھی
ٹکڑے ہوتا تھا جگر چھاتی پھٹی جاتی تھی

در پہ موجود سواری کو جو تھا اسپ عقاب　　جوڑ کر ہاتھ کہا شاہ سے باچشم پرآب
فدوی اسوار ہو لیجائیں جو تشریف جناب　　بولے شہ تم چڑھو گھوڑے پہ میں تھاموں رکاب
باپ نے پاؤں کو گر ہاتھ لگایا تو کیا
کاندھے پر چڑھتے تھے گھوڑے پہ چڑھایا تو کیا

مثال ۴۔ حضرت امام زین العابدینؑ اپنے بھائی علی اکبرؑ کو رخصت کر رہے ہیں، سہ

فضہ سے کہا کیا ہوا کیسی ہے یہ زاری　　سر پیٹ کے وہ خادمہ خاص پکاری
شبیرؑ اکیلے ہیں غضب ہو گیا واری　　اب جاتی ہے رن کو علی اکبرؑ کی سواری

ماں خاک اُڑاتی ہے پھوپی غش میں پڑی ہیں
سب بیبیاں حلقہ کئے گرد اُن کے کھڑی ہیں
فرمایا عصا لاکہ برادر سے مل آئیں   غازی سے مجاہد سے دلاور سے مل آئیں
دریائے شہادت کے شناور سے مل آئیں   شبیرؑ کے پیارے علی اکبرؑ سے مل آئیں
بھائی کا نہیں کوچ یہ رخصت ہے نبیؐ کی
ہم آپ چلیں گے کہ زیارت ہے نبیؐ کی
فضہ نے عصا دے کے جو بازو کو سنبھالا   بستر سے اُٹھا کانپ کے وہ گیسوؤں والا
خم ہو گیا تھا، درد کمر سے قد والا   تھرا کے پڑا پانوں کہیں اور کہیں ڈالا
اشک آنکھوں سے بہتے تھے گریبان قبا پر
ہر بار ٹھہر جاتے تھے سر رکھ کے عصا پر
آواز حزیں تھی کہ میری جان برادر   بیمار برادر ترے قربان برادر
ہم آتے ہیں ٹھہرے رہو اک آن برادر   ذی قدر برادر مرے ذی شان برادر
بھائی سے بغلگیر تو ہوتے ہوئے جاؤ
ہم روئیں تمھیں تم ہمیں روتے ہوئے جاؤ
عابدؑ کی طرف دیکھ کے دوڑے علی اکبرؑ   آنکھوں کو ملا ہاتھوں سے قدموں پہ رکھا سر
سجادؑ نے فرمایا کلیجے سے لگا کر   گردن میں مرے ڈال دو باہوں کو برادر
شانے کے قریں زلف معنبر رہے بھائی
چہرہ مرے چہرہ کے برابر رہے بھائی
اے روشنی خانۂ زہراؑ ترے صدقے   اے باپ کے عاشق مرے شیدا ترے صدقے

اے تشنہ لب اے بیکس و تنہا ترے صدقے — اے رہرو فردوس معلّا ترے صدقے
گھر آج اُجڑتا ہے لٹے جاتے ہیں بھائی
ہم قافلہ والوں سے چھٹے جاتے ہیں بھائی

مثال ۵ - حضرت امام حسین علیہ السّلام بہن، بیٹی اور بیوی سے رخصت ہوتے ہیں ؎

روتے ہوئے حرم میں گئے قبلۂ انام — تر تھی لہو سے لخت جگر کی قبا تمام
رُخ زرد دل میں درد بدن سرد تشنہ کام — طاقت نہ قلب میں نہ بدن میں لہو کا نام
یہ درد تھا جگا میں کہ دل ٹکڑے ہوتے تھے
یہ حال تھا کہ رونے پہ دشمن بھی روتے تھے

پیارے نہ تھے حسینؑ علیہ السّلام کے — لائی حرم سرا میں بہن ہاتھ تھام کے
تھرا رہے تھے پاؤں شہ تشنہ کام کے — سر دوش پر تھا زینبؑ عالی مقام کے
فرماتے تھے بہن علی اکبرؑ گذر گئے
ہم ایسے سخت جاں تھے کہ اب تک نہ مر گئے

پرسا تمھیں شہید کا دینے کو آئے ہیں — کس کس کے داغ آج جگر پر اٹھائے ہیں
بیٹھے ہیں خاک اڑائی ہے آنسو بہائے ہیں — یہ ہم تمھارے لال کے خوں میں نہائے ہیں
سر تھا حسینؑ بیکس و تنہا کی گود میں
بیٹے کی جان نکلی ہے بابا کی گود میں

سر بارِ دوش ہے ہمیں رخصت کرو بہن — اب عنقریب خیمۂ عصمت ہیں تیغ زن
مردے پڑے ہوئے ہیں عزیزوں کے بے کفن — پامال ہو نہ لاشۂ فرزند صف شکن

محجوب ہم ہیں قاسمؑ بے پر کی روح سے
شرمندگی نہ ہو علی اکبرؑ کی روح سے

یہ سن کے بی بیوں کے جگر پر چھری چلی　　زینبؑ زمیں پہ گر کے پکاری کہ یا علیؑ
سرِ خفی جہاں کے ہیں سب آپ پر جلی　　جاتا ہے سرکشوں میں یہ کونین کا ولی
بیکس کو آسرا ہے پسر کا نہ بھائی کا
آقا یہی تو وقت ہے مشکل کشائی کا

صدقے گئی پسر کے بچانے ہیں کد کرو　　فرزندِ فاطمہؑ کی بلاؤں کو رد کرو
دریا کو چھین لو حقِ زہراؑ سند کرو　　یا شیرِ حق مقام مدد ہے مدد کرو
پانی پہ جنگ آگ لگی ہے یہ دہر میں
حصہ پسر کا کیا نہیں مادر کے مہر میں

یا مصطفےٰؐ بلا میں پھنسا ہے تمہارا لال　　یا شیرِ ذوالجلال دکھاؤ انھیں جلال
یا فاطمہؑ میں لٹتی ہوں کھولو سر کے بال　　یارب الٹ دے آج یہ سب عرصۂ قتال
پھر کیا کسی سے کام ہے سب سے جدا رہوں
بھائی کو اپنے لے کے میں جنگل میں جا رہوں

فرمایا شہ نے صبر بہن چاہیے تمھیں　　خالق کی یاد سرّ و علن[1] چاہیے تمھیں
لب پر رضا رضا کا سخن چاہیے تمھیں　　جو ماں کا تھا چلن وہ چلن چاہیے تمھیں
ہر بار پوچھتے تھے سبب آہ سرد کا
شکوہ کیا علیؑ سے نہ پہلو کے درد کا

---

[1] یعنی پوشیدہ و ظاہر ۱۲

یہ سچ کہ تمکو مجھ سے محبت ہے اے بہن	کیا کیجے ناگزیر یہ فرقت ہے اے بہن
پیارے تمھارے بھائی کی رخصت ہے اے بہن	دنیا مقام رنج و مصیبت ہے اے بہن
بھولے نہ یاد حق کبھی گو حال غیر ہو
اُس کی ظفر ہے خاتمہ جس کا بخیر ہو

دیکھا یہ کہہ کے بالی سکینہ کو پاس ہے	لپٹی وہ دوڑ کر شہ گردوں اساس سے
طاقت نہ تھی کلام کی ہرچند پیاس ہے	بولی وہ تشنہ کام شہ حق شناس سے
کیا اِس بلا کے بن سے تہیہ سفر کا ہے
صدقے گئی بتاؤ ارادہ کدھر کا ہے

فرمایا شہ نے ہاں سفر ناگزیر ہے	آؤ گلے لگو کہ یہ صحبت اخیر ہے
اب آرزوئے قرب خدائے قدیر ہے	تنہا ہیں ہم سپاہ مخالف کثیر ہے
طے ہو یہ مرحلہ جو اعانت خدا کرے
جس کا نہ کوئی دوست ہو بی بی وہ کیا کرے

سن کر مصیبتِ پدر بیکس و حزیں	بولی بلائیں باپ کی لے کر وہ مہ جبیں
نکلو بلا کے بن سے کہیں یا امام دیں	آقا سوا حضور کے میرا کوئی نہیں
صدقے گئی مدینے چلو یا نجف چلو
لللہ ساتھ لے لو مجھے جس طرف چلو

شہ نے کہا کہ بند ہیں راہیں پدر نثار	پھیلی ہوئی ہے چار طرف فوج نابکار
پیدل نکلنے پاتا ہے ناکوں سے نہ سوار	اس دشت کیں میں قید ہے احمد کا یادگار
قاصد جو میرے نام کا خط لے کے آتے ہیں

سر کاٹ کر درختوں میں لٹکائے جاتے ہیں

عمو تمھارے چھوڑ گئے ہم کو جاں بلب — بی بی قدم پہ گر کے ہیں کون روکے اب؟
تلواریں چل گئیں بنے قاسمؑ پہ بےسبب — مرنا شباب میں علی اکبرؑ کا ہے غضب
تھے جتنے زندگی کے حلاوت وہ چھٹ گئے
وہ تین گھر بھرے ہوئے اک دم میں لُٹ گئے

بی بی یہاں سے اہل وطن ہیں قریب تر — پر میری بیکسی کی نہیں ایک کو خبر
بھیجے ہیں شیعیاں یمن نے بھی نامہ بر — لیکن حسینؑ تک نہ ہوا ایک کا گذر
قریوں سے بھی مدد کو جو نکلا وہ گھر گیا
لشکر نبی اسد کا قریب آ کے پھر گیا

گھیرا ہے اسلیئے مجھے اِس بن میں بیگناہ — تا مجھ تک آسکے نہ کوئی میرا خیر خواہ
نہ دوست، نہ عزیز، نہ غمخوار، نہ سپاہ — ہمراہی سب عدم میں، وطن دور گھر تباہ
مجھ سا بھی کوئی بیکس و بے پر بشر نہ ہو
مر کر نہ دفن ہوں تو کسی کو خبر نہ ہو

جانا ہے دور شب کو جو آنا ہوا ادھر — ضد کر کے روئیو نہ ہمیں چاہتی ہو گر
پہلے پہل ہے آج شب فرقت پدر — سو رہیو ماں کی چھاتی پہ غربت سے رکھکے سر
راحت کے دن گذر گئے یہ فصل اور ہے
اب یوں بسر کرو جو یتیموں کا طور ہے

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولی وہ تشنہ کام — بتلایئے مجھے کہ یتیمی ہے کس کا نام
آنکھوں سے خوں بہا کے یہ کہنے لگے امام — کھل جائے گا یہ درد و الم تم پہ تا بہ شام

بی بی نہ پوچھو کچھ یہ مصیبت عظیم ہے
مر جائے جس کا باپ وہ بچہ یتیم ہے

تن سے اتار و طوق پہن لو پدر نثار چھینا کہیں جو لوٹنے آئیں ستم شعار
چلائیو تو بین ابھی کہہ کے بار بار دشمن ہمارے نام کا ہے شمر نابکار
لو الوداع جاتے ہیں اب قتل گاہ میں
سونپا تمہیں خدا و نبی کی پناہ میں

یہ کہہ کے پیاری بیٹی سے دیکھا ادھر ادھر پوچھا کدھر ہیں بانوئے ناشاد نوحہ گر
فضہ نے عرض کی کہ ادھر بیٹھی ہیں سر رخصت کی بھی حضور کے انکو نہیں خبر
لب پر گھڑی گھڑی علی اکبر کا نام ہے
چلئے ذرا کہ کام اب ان کا تمام ہے

رکھی تھی لاکے لاش پسر آپ نے جہاں منہ اس زمیں پہ ملتی ہیں اور ہے لہو جہاں
کرتی ہیں اٹھ کے آہ تو ہلتا ہے آسماں نعرہ یہ ہے کہ ہائے علی اکبر جواں
واری گئی نہ قبر میں اماں کو گاڑ کے
جنگل بسا دیا مری بستی اجاڑ کے

روتے ہوئے وہاں جو گئے شاہ خوش خصال دیکھا کہ غش میں ہیں خاک پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
شبیر بیٹھ کر یہ پکارے بصد ملال اے شہر بانو ہوش میں آؤ یہ کیا ہے حال
سچ ہے یہ فلک نے تم کو بڑے دکھ دکھائے ہیں
صاحب اٹھو کہ ہم آخری رخصت کو آئے ہیں

سنکر صدا حسین کی چونکی وہ نوحہ گر کی عرض سر جھکا کے قدم پر بچشم تر

ننھا حضور آئے ہیں باندھے ہوئے کمر — صاحب کہاں ہے مشکوں والا مرا پسر
ایسے نہیں وہ دکھ میں جدا ہوں جو باپ سے
اپنے مرادوں والے کو میں لونگی آپ سے

اے جانِ فاطمہ مرا پیارا کہاں گیا — اماں کی زندگی کا سہارا کہاں گیا
وہ تین دن کی پیاس کا مارا کہاں گیا — سیدانیوں کی آنکھوں کا تارا کہاں گیا
مرتی ہوں اپنے سروِ سہی قد کو دیکھ لوں
اک بار پھر شبیہ محمد کو دیکھ لوں

وہ گورا گورا چاند سا مکھڑا دکھائیں پھر — لے لوں میں گیسوؤں کی بلائیں تو جائیں پھر
مجھکو تو خیریت سے غرض ہے نہ آئیں پھر — خوشبو میں تن کی سونگھ لوں جنگل بسائیں پھر
تڑپے گا دل تو لے کے اجازت حضور سے
میں دیکھ لونگی در پہ کھڑے ہو کے دور سے

بیخود تھی میں جب آئے تھے میدان کو وہ ادھر — کیا دیکھتی مجھے تو کچھ آتا نہ تھا نظر
سنبھالا ذرا جو دل تو پھڑکنے لگا جگر — کب آئے کب گئے مجھے مطلق نہیں خبر
آئے تو چھپ کے آئے گئے بے ملے ہوئے
باتیں نہ پیار کی ہوئیں نہ کچھ گلے ہوئے

گر میں خفا تو آئیں میں اٹھ کر منا لیا — ان کی خطا نہیں ہے میں تقصیر وار ہوں
واری ہوں انکی آپ کی خدمت گزار ہوں — اے ابنِ عم سمجھئے کہ بہت بے قرار ہوں
تکلیف گرچہ ہوگی شہِ مشرقین کو
لے آیئے منا کے مرے نورِ عین کو

باتیں یہ سن کے کہنے لگے شاہِ بحر و بر　　یارب جدا نہ ہو کسی ماں سے جواں پسر
بانوؔ کسے بلاؤں؟ کہاں ہے وہ سیمبر؟　　ہمشکل مصطفےٰ تو گئے جان سے گذر
ہر دکھ میں صبر کرتے ہیں جو حق شناس ہیں
جس نے تمھیں دیا تھا وہ اب اسکے پاس ہیں

جاگے ہوئے تھے رات کے نیند آ گئی انھیں　　ہے ہے منافقوں کی نظر کھا گئی انھیں
مخفی بہت کیا پہ اجل پا گئی انھیں　　صحرائے کربلا کی فضا بھا گئی انھیں
زندہ نہ ہوگا لال اگر مر بھی جاؤ گی
اب تو کوئی گھڑی میں ہمیں بھی نہ پاؤ گی

جاتے ہیں ہم وہیں کہ جہاں ہے وہ لالہ فام　　دے دو جو اپنے لال کو دینا ہو کچھ پیام
سنکر یہ ذکر ہوش میں آئی وہ تشنہ کام　　سمجھی کہ گھر تباہ ہوا اب چلے امام
خنجر سے حلق شاہ کے کٹنے کا طور ہے
بستی اجڑ کے تخت الٹنے کا طور ہے

دامن پکڑ کے شاہ کا بولی وہ دلفگار　　اے ابن فاطمہؑ! یہ کنیز آپ کے نثار
بعد آپ کے جو لوٹنے آئیں ستم شعار　　بیٹھے کہاں یہ بیکس و غمگین و سوگوار
کچھ حق میں اس کنیز کے فرما کے جائیے
صاحب کسی جگہ مجھے بٹھلا کے جائیے

میں وہ ہوں جو کہ قید میں آئی تھی یا امام　　مشہور ہوں کنیز امام فلک مقام
پاس آپ کے ہے نانا کا اے قبلۂ انام　　گر قید ہو گئی تو کہیں گے یہ خاص و عام
بندی چلی ہے شام کو آل رسولؐ کی

دیکھو! یہی بہو ہے علیؑ و بتولؑ کی

فرمایا شہ نے حافظ و حامی ہے ذوالجلال — زہراؑ کی بیٹیوں کی رہو تم شریکِ حال
زینبؑ کو دیکھو سر پہ نہ بھائی نہ دونو لال — صاحب تمہارے ساتھ ہے عابدؑ سا خوش خصال
بے وارثوں کا وارث و والی آلہ ہے
دیکھو ڈگے نہ پاؤں کہ مشکل کی راہ ہے

لو الوداع لاش پہ اب آ کے رو لیو — لیکن نہ خاک اڑا کے نہ چلا کے رو لیو
زانو پہ سر کو شرم سے نہوڑا کے رو لیو — قبرِ رسولِ پاک پہ ہاں جا کے رو لیو
لٹنے میں صبر شکر تباہی میں حیا چاہیئے
رونا بشر کو خوفِ الٰہی میں چاہیئے

مثال ۵ ـ حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے بھائی عباسؑ کے مرنے کی خبر سن کر رزمگاہ کو جاتے ہیں ـ ۵

دریا پہ سر برہنہ شہ بحر و بر چلے — صدمہ یہ تھا کہ ہاتھوں سے تھامے کمر چلے
اکبرؑ سنبھالے باپ کو با چشمِ تر چلے — یہ بھی اُدھر چلے شہ والا جدھر چلے
صدمہ ہے ضربِ غم سے دلِ پاش پاش پر
رونے کو بھائی جاتا ہے بھائی کی لاش پر

صورت یہ شاہ کی ہے کہ زلفوں پہ خاک ہے — آلودۂ غبارِ الم روئے پاک ہے
سوکھے لبوں پہ نالۂ روحی فداک ہے — اور تا کمر قبا کا گریبان چاک ہے
دستِ یسار بیٹے کی گردن میں ڈالے ہیں
شہ کو جھکے ہوئے علی اکبرؑ سنبھالے ہیں

جب پاؤں کانپتے تھے تو کہتے تھے رو کے شاہ — طاقت بدن کی لے گئے عباسؑ آہ آہ
دریا نہ اتنا دور تھا اے میرے رشکِ ماہ — رستہ غلط کیا ہے کہ کچھ بڑھ گئی ہے راہ
ہے دور یاں سے یا مرا بھائی قریب ہے
کہتے ہیں وہ "حضور ترائی قریب ہے"

القصہ لائے باپ کو اکبر ترائی میں — زخمی ملا وہ شیر دلاور ترائی میں
پانی جو بہہ رہا تھا خونِ برادر ترائی میں — لاشے کے پاس گر پڑے سرور ترائی میں
گذری تھی عمر ہاتھ جسے جوڑتے ہوئے
دیکھا اُسی کو خاک پہ دم توڑتے ہوئے

مُنہ رکھ کے منہ پہ بھائی نے بھائی کو دی صدا — اے شیر! اے دلیر! یہ بیکس ترے فدا
کیوں پتلیاں پھراتے ہو بھائی یہ کیا کیا — عباسؑ ابنِ حسینؑ ہوں دیکھو مجھے ذرا
میرا بھی حلق خشک ہے خنجر کے واسطے
بھائی کو چھوڑے جاتے ہو دم بھر کے واسطے

ٹھہرو عنانِ توسنِ عمرِ رواں نہ لو — سا تھی تھے کا ہوا ہے رہِ کارزار نہ لو
کروٹ کراہ کر مرے آرامِ جاں نہ لو — لگتی ہے چوٹ دل پہ مرے ہچکیاں نہ لو
مر جاؤں گا میں ساتھ اگر چھوٹ جائے گا
بھائی مرا تو رشتۂ جاں ٹوٹ جائے گا

بولے یہ آنکھ کھول کے عباسؑ نامدار — آقا ہزار جان گرامی ترے نثار
یہ موت زندگی ہے نہ ہے فخر و افتخار — نکلے جو گُل کے سامنے بلبل کی جان زار
دیدار دیکھنے میں نہ آتا تو موت تھی

پروانہ شمع کو جو نہ پاتا تو موت تھی

زانوئے پاک نورِ خدا اور سرِ حقیر — عالم کا بادشاہ کجا اور کجا فقیر
ذرّے کو مہر کر دیا اے آسماں سریر — تکیہ کسی کو بھی یہ ملا ہے دمِ اخیر
پایا یہ اوج ماں کی نہ بابا کی گود میں
معراج مل گئی شہِ والا کی گود میں

رحمت نے رخ کیا مری جانب حضور آئے — لیکر رسولؐ جامِ شرابِ طہور آئے
روشن ہو کیوں نہ چشم جو خالق کا نور آئے — ایسا نہ ہو سرور جو بالیں پہ حور آئے
عشاق مر کے بھی جاتے ہیں زخمی بھی ہوتے ہیں
ہیں اب تو تندرست ہوں کیوں آپ روتے ہیں

شہ نے کہا کہ لینے کو آئے ہیں تم کو سب — عباسؑ چھوڑ جاؤ گے اب ہم کو ہے غضب
سر خاک پر پٹکتے ہیں اولادِ بوطالبؑ — اے جانِ فاطمہؑ جگرِ سیدِ عرب
کس کس کو روکئے کہ یہ اللہ کے لئے ہیں
صدمہ بڑا یہی ہے کہ حضرت اکیلے ہیں

راحت کی راہ ہے سفرِ گلشنِ ارم — صدمہ مگر ہے روح پہ اے قبلۂ امم
اپنا تو لوگ کہتے مر گئے ہوتے تڑپ کے ہم — الفت ہے آپکی کہ اٹکا ہوا ہے دم
دنیا سے کوچ کرنے کو جی چاہتا نہیں
بے وفائی جان مرنے کو جی چاہتا نہیں

یہ کہہ کے چپ ہوئے تھے کہ اٹھا جگر میں درد — رخسارِ شہ رخ سرخ جو تھے ہو گئے وہ زرد
لیں کروٹیں تو سہہ گئی زخموں میں رات کی گرد — منہ رکھ کے شہ کے پاؤں پہ کھینچی اک آہِ سرد

دنیا سے انتقال علمدار ہو گیا
سردارِ فوج بے کس و بے یار ہو گیا

بھائی کے آگے بھائی تڑپ کر جو مر گیا — صدمہ غضب کا سبطِ نبیؐ پر گذر گیا
خنجر الم کا دل سے جگر تک اتر گیا — چلّاتے تھے کہ شیر ہمارا کدھر گیا
لیتے تھے بوسے جھک کے تنِ پاش پاش کے
اٹھ اٹھ کے گرد پھرتے تھے بھائی کی لاش کے

جھک کر پکارتے تھے کہ بھیّا صدا سناؤ — سر رکھ لو میرے زانو پہ گردن ذرا اٹھاؤ
زینبؑ تمھیں بلاتی ہیں خیمے کے در پہ جاؤ — کب سے بلک رہی ہے سکینہؑ کو دیکھ آؤ
باتوں میں پیار کی کہیں تم سے گلا نہ ہو
دریا پہ سو گئے ہو سکینہؑ خفا نہ ہو

کیا ہے جو آنکھ بند کیے ہو حیا سے تم — کیا کچھ خفا ہو سبطِ رسولِ خدا سے تم
اکثر ہمیں بچاتے تھے لو میں ہوا سے تم — ہم اٹ گئے ہیں گرد تو جھاڑو قبا سے تم
ہے دوپہر کا وقت برادر یہ دھوپ ہے
سایہ کرو علم کا مرے سر پہ دھوپ ہے

اکبرؑ نے رو کے عرض یہ کی اے شہِ زماں — رونے سے اب پلٹینگے نہ حضرت کے بھائی جاں
لے چلیئے گھر میں لاش علمدارِ نوجواں — ایسا نہ ہو نکل پڑیں خیمے سے بی بیاں
دریا پہ ننگے سر کہیں بنتِ علیؑ نہ آئے
فضّہ کو ساتھ لے کے سکینہؑ چلی نہ آئے

اکبرؑ نے عرض کی کہ چلیں اے شہِ زماں — رو کر امام بولے [illegible] کہاں

واں بھی مرے لئے وہی رونا ہے جو یہاں اپنا بھی گھر ہے اب وہی بھائی رہے جہاں
اٹھتے نہ تھے حسینؑ برادر کو چھوڑ کر
رکھا پسر نے پاؤں پہ سر ہاتھ جوڑ کر

فضہ کھڑی تھی خیمہ کے باہر جو بے خبر حضرت کو اس نے دور سے دیکھا برہنہ سر
پردہ الٹ کے خیمہ کا بولی وہ نوحہ گر سیدانیو اٹھو علم آتا ہے خوں میں تر
اکبرؑ علم لئے ہیں علیؑ کا نشاں نہیں
کوتل فرس تو آتا ہے وہ نوجواں نہیں

ناگاہ سب کو دور سے آیا نظر نشان تھا خاک سے بھرا ہوا وہ جلوہ گر نشان
گویا کہ تھا شبیہ الم سر بسر نشان ڈوبا تھا خوں میں پنجۂ پرنور اور نشان
چھپ جاتا تھا پھریرے میں یوں کانپ کانپ کے
روتا ہے جس طرح کوئی منہ ڈھانپ ڈھانپ کے

سمجھے یہ سب کہ بازوئے عباسؑ کٹ گئے سیدانیوں کے غم سے لہو اور گھٹ گئے
بچوں کے ننھے ننھے جگر غم سے پھٹ گئے رنگ اڑ گئے رخوں سے کلیجے الٹ گئے
ہر دل پہ برق رنج و غم و یاس گر پڑی
بچوں سمیت زوجۂ عباسؑ گر پڑی

اکبرؑ علم کو خیمے کے اندر جھکا کے لائے سر اپنا پیٹتے ہوئے گھر میں حسینؑ آئے
چلاتے تھے کہ بھائی کو بھائی کہاں سے پائے عاشق نے ساتھ چھوڑ دیا ہائے ہائے ہائے
چھینا اجل نے ہم سے ہمارے دلیر کو
[illegible]

دامن میں ہم کٹے ہوئے ہاتھوں کو لائیں گے

مثال ۲۶ ۔ علی اکبرؑ نزع کی حالت میں ہیں، اور امام حسین علیہ السّلام
اُن کے پاس جاتے ہیں ۔

جس دم سُنی حسینؑ نے یہ جانگزا صدا — صابر اگرچہ تھے پہ کلیجہ اُلٹ گیا
ہاتھوں سے دل کو تھام کے دوڑے برہنہ پا — نعرہ کیا کہ اے علی اکبرؑ کدھر گیا

ل کر غریب و بیکس و تنہا سے جدا ہو
آ لے ضعیف باپ کو دنیا سے جدا ہو

اے میرے شفیق پسر مہرباں پسر — خوش رُو پسر سعید پسر [illegible] پسر
مادر کا چین، باپ کا آرام جاں پسر — گم گشتہ پسر شہید پسر نوجواں پسر

مقتل کدھر ہے کوئی بتاتا نہیں مجھے
اے نورِ عین! کچھ نظر آتا نہیں مجھے

مجھکو غریب دشتِ بلا کہہ کے پھر پکار — اک بار بابا شاہ دوسرا کہہ کے پھر پکار
اے شیر سید الشہدا کہہ کے پھر پکار — صدقے ہو باپ بابا ابّا کہہ کے پھر پکار

میری بھی جان تن سے ترے ساتھ جائیگی
مر جاؤں گا کہیں جو یہ آواز آئے گی

کچھ ہوش دست و پا کا نہیں بدحواس ہوں — زخمی ہوں قلب کشتۂ اندوہ و یاس ہوں
غمگین ہوں مردہ دل ہوں حزیں ہوں اداس ہوں — دم توڑتے ہو تم تو غضب اور میں پاس ہوں

کیونکر قرار آئے دلِ ناصبور کو
لاؤں کہاں سے ڈھونڈھ کے آنکھوں کے نور کو

دوڑے یہ بات کہہ کے جو سلطانِ بحر و بر　　بیٹے کی لاش باپ نے دیکھی لہو میں تر
اٹھا یہ دل میں درد کہ خم ہو گئی کمر　　دیکھا جو زخم منہ کے قریب آگیا جگر
تڑپے جو گر کے اور تڑپ کر ٹھہر گئے
غل پڑ گیا صفوں میں کہ شبیرؑ مر گئے

ہوش آیا تین ساعت کامل کے بعد جب　　دیکھا کہ مٹ رہی ہے شبیہ رسولؐ رب
آنسو بہا کے رکھ دیے بیٹے کے لب پہ لب　　چلاتے تھے کہ چھوڑ چلے ہم کو ہے غضب
دل سے گلے لپٹنے کی حسرت نکال دو
باہیں اٹھا کے باپ کی گردن میں ڈال دو

اکبرؑ نے آنکھیں کھول کے دیکھا رخِ پدر　　گالوں پہ اشک آنکھوں سے ٹپکے ادھر ادھر
فرمایا شہ نے زانو پہ رکھ کر سر پسر　　روتے ہو کس کے واسطے اے غیرتِ قمر
یاں سے اٹھا کے آل پیمبر میں لے چلیں
غم ماں کا ہے تو آؤ تمھیں گھر میں لے چلیں

کی عرض مہلت اتنی کہاں اے شہِ امم　　اب کیجئے قبلہ رو کہ نکلتا ہے تن سے دم
دولت ملی کہ دیکھ لیے آپ کے قدم　　غیر از غمِ فراق مجھے کچھ نہیں ہے غم
ساتھ آئے تھے جو چاہنے والے وہ دور ہیں
روتا ہوں اس لئے کہ اکیلے حضور ہیں

شہ نے کہا مرے لئے بیٹا نہ رو بس　　ہو گا جہاں سے جانے میں تھوڑا سا پیش و پس
دنیا کی آرزو ہے نہ جینے کی کچھ ہوس　　میرے لئے ہے اب دمِ خنجر ہر اک نفس
اکبرؑ ترے الم سے جگر چاک چاک ہے

جب تو نہ ہو تو باپ کے جینے پہ خاک ہے

یہ بات حسن کے لینے لگا ہچکیاں پسر   سوکھی زباں دکھائی کہ پیاسا ہوں اے پدر
زردی اجل کی چھا گئی چہرے پہ سر بسر   دو بار لی کراہ کے کروٹ اِدھر اُدھر
دنیا سے انتقال ہوا نور عین کا
ہنگامِ ظہر تھا کہ لٹا گھر حسینؑ کا

نکلی اِدھر تو جسم سے اکبرؑ کی جانِ زار   یاں بیبیاں ہوئیں درِ خیمہ پہ بے قرار
فضہ پکاری ڈیوڑھی سے بڑھ کے یہ ایک بار   اکبرؑ پہ کیا گذر گئی اے شاہِ نامدار
چھریاں غم و الم کی کلیجے پہ چلتی ہیں
جلد آیئے کہ حضرتِ زینبؑ نکلتی ہیں

گھبرا کے شاہِ دیں نے اٹھائی پسر کی لاش   لپٹائے تھے کلیجے سے لختِ جگر کی لاش
لائے قریب خیمہ جو اُس سیمبر کی لاش   غل پڑ گیا کہ آتی ہے رشکِ قمر کی لاش
زہراؑ کی بیٹیاں جو کھلے سر نکل پڑیں
سب بیبیاں خیام سے باہر نکل پڑیں

سر ننگے لاشہ کے گرد تھیں سیدانیاں تمام   تھے بیچ میں شہید کا لاشہ لئے امام
بانوؑ پکارتی تھی کہ یا شاہِ تشنہ کام   جیتا ہے یا جہاں سے گیا میرا لالہ فام
منکا ڈھلا ہے ہونٹوں پہ سوکھی زبان ہے
اے جانِ فاطمہؑ مرے بچے میں جان ہے؟

زینبؑ تڑپ تڑپ کے یہ کہتی تھی بار بار   یہ لاش میری گود میں دیجے بہن نثار
طاقت نہیں ہے آپ میں یا شاہِ نامدار   صدمے گئی لرزتا ہے فاقوں سے جسمِ زار

شہ کہتے تھے یہ کام ہے مجھ خستہ جان کا
تجھ سے بہن اُٹھے گا نہ لاشہ جوان کا

لاشہ پسر کا خیمہ میں لائے امامِ پاک — مسندِ رسولِ حق کی بچھائی بروئے خاک
شہ نے لٹا کے لاش جو کی آہِ دردناک — دل بی بیوں کے ہو گئے سینے میں چاک چاک
پہلے گماں تھا غش میں ہیں وہ ناگہ آئے ہیں
آخر یقین سب کو ہوا مر کے آئے ہیں

لاشے کے پاس ہائے پسر کہہ کے ماں گری — ہاتھوں سے دل پکڑ کے پھوپھی نیم جاں گری
دل پر ہر اک کے برقِ غمِ نوجواں گری — غش ہو کے یاں گری کوئی اور کوئی واں گری
چھوٹی بہن جو لاشے سے آ کر لپٹ گئی
اک حشر ہو گیا صفِ ماتم الٹ گئی

مثال ۷ ۔ حضرت علی اکبرؑ نزع کی حالت میں امام حسین علیہ السلام کو پکارتے ہیں اور وہ بدحواس قتل گاہ کی طرف جاتے ہیں۔ اس وقت کی اضطرابی حرکات، اور باپ بیٹے کی گفتگو سے

سن کر یہ استغاثۂ فرزندِ خوش خصال — سید نے آہ کی کہ ہلا عرشِ ذوالجلال
کھولے جنابِ فاطمہؑ کی بیٹیوں نے بال — بابو پکاری خیر تو ہے اے علیؑ کے لال
ہے ہے پسر سے کون سی مادر بچھڑ گئی
صاحب تباہ کیا مری بستی اُجڑ گئی

نہر سے کس کے لال کا ہے زخمی ہوا جگر — کرتے ہیں کس کی لاش کو پامال اہلِ شر
کہتا ہے کون رن میں تڑپ کر پدر پدر — اب گھر سے میں نکلتی ہوں ہے کدھر مرا پسر

دوڑے کسی طرف تو کسی جا ٹھہر گئے تھالے ملے لہو کے برابر جدھر گئے
ٹپکا ہوا زمیں پہ جگر کا لہو ملا
لیکن کہیں نہ وہ پسر ماہرو ملا
جا کر صفوں کے پاس پکارے باشکِ آہ ہے کس طرف مرے علی اکبرؑ کی قتل گاہ
اے ظالمو یہ شب ہے کہ دن ہو گیا سیاہ کس ابر میں چھپا ہے مرا چودھویں کا ماہ
بتلاؤ جان ہے کہ نہیں جسمِ زار میں
زخمی پڑا ہے شیر مرا کس کچھار میں
لاشِ پسر کو ڈھونڈھتے تھے شاہِ بحر و بر سر پیٹنے کی جا ہے کہ ہنستے تھے اہلِ شر
کہتا تھا شمر اے پسرِ سید البشر کس کو حضور ڈھونڈھتے ہیں مر گیا پسر
خود ڈھونڈھ لیجیے جسدِ پاش پاش کو
بتلائیں گے نہ ہم علی اکبرؑ کی لاش کو
یہ سن کے کھینچ لی شہ والا نے ذوالفقار چمکی جو برقِ تیغ تو بھاگے ستم شعار
شہ کو نظر پڑا علی اکبرؑ کا راہوار چلائے اے عقاب کدھر ہے ترا سوار
دکھلا دے مجھ کو لاش مرے نورِ عین کی
کس دشت میں پڑی ہے بضاعت حسینؑ کی
ملنے دے ان رکابوں کے حلقوں سے چشمِ نم ہے ہے انہی میں تھے مرے فرزند کے قدم
بوسے تری لگام کے لوں میں اسیرِ غم اکبرؑ کے ہاتھ میں تھی یہی باگ ہے ستم
ہے ہے وہ ہاتھ پاؤں مرے آفتاب کے
قرباں تری لگام کے صدقے رکاب کے

گھوڑے نے ہنہنا کے سوئے دشت کی نظر یعنی کہ لاش آپ کے پیارے کی ہے ادھر
جاتا تھا آگے آگئے وہ تازی بچشم تر گھوڑے کے پیچھے پیچھے تھے سلطانِ بحر و بر
جنگل میں لاشۂ پسرِ نوجواں ملا
وہ مہ لقا ملا تو مگر نیم جاں ملا

دیکھی عجیب حالتِ فرزندِ نوجواں پیکاں گلے میں ہونٹوں پہ نکلی ہوئی زباں
تن پر جراحتِ تبر و خنجر و سناں گردن تھی کج پھری ہوئی آنکھوں میں پتلیاں
ٹاپوں سے مرکبوں کے جراحت پھٹے ہوئے
چہرہ سفید خاک میں گیسو اَٹے ہوئے

ہچکی کے ساتھ کہتے ہیں واکر کے چشم تر اے جانِ جسم زار میں اور ایک دم ٹھہر
اے موت بے وطن کی جوانی پہ رحم کر اے درد تھم ذرا کہ پھٹا جاتا ہے جگر
پھر ایک بار سیّدِ والا کو دیکھ لوں
مہلت بس اتنی دے کہ میں بابا کو دیکھ لوں

دشمن کو بھی نہ بیٹے کا لاشہ خدا دکھائے حضرت زمیں پہ گر کے پکارے کہ ہائے ہائے
زندہ رہے یہ پیر جواں یوں جہاں سے جائے اے لال تین روز کے فاقے میں زخم کھائے
شاید جگر کے زخم سے تم بے قرار ہو
زخمی تمھاری چھاتی پہ بابا نثار ہو

کیوں کھینچتے ہو پاؤں کو اے میرے گلعذار کیوں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے پٹکتے ہو بار بار
آنکھیں تو کھول دو کہ مرا دل ہے بیقرار بیٹا تمھاری ماں کو تمھارا ہے انتظار
بہنیں کھڑی ہیں در پہ بڑے اشتیاق میں

اکبرؑ تمھاری ماں نہ جئے گی فراق میں

غش میں سنا جو ہیں علی اکبرؑ نے ماں کا نام   کس یاس کی نگاہ سے دیکھا سوئے خیام
سوکھی زباں دکھا کے یہ بولا وہ تشنہ کام   شدت یہ پیاس کی ہے کہ دشوار ہے کلام
اب اور کوئی دم کا یہ مہمان ہے
امداد یا حسینؑ کہ پانی میں جان ہے

فرمایا شہ نے اے علی اکبرؑ میں کیا کروں   پانی نہیں ہے مجھکو میسر میں کیا کروں
گھیرے ہیں نہر کو یہ ستمگر میں کیا کروں   کچھ بس نہیں مرا مرے دلبر میں کیا کروں
اعدا نہ دیں گے بوند اگر لاکھ کد کریں
بیٹا تمھاری ساقیِ کوثر مدد کریں

حضرت یہ کہتے تھے کہ چلا خلق سے پسر   اتنی زباں ہلی کہ خدا حافظ اے پدر
ہچکی جو آئی تھام لیا ہاتھ سے جگر   انگڑائی لیکے رکھدیا شہ کے قدم پہ سر
آباد گھر لٹا شہ والا کے سامنے
بیٹے کا دم نکل گیا بابا کے سامنے

لکھتا ہے ایک راوی غمگین و پر ملال   یعنی ادھر ہوا علی اکبرؑ کا انتقال
نکلی حرم سے ایک زنِ فاطمہؑ جمال   گویا جناب سیدہؑ کھولے ہوئے تھیں بال
تھی اس طرح سے رخ پہ ضیا اُس جناب کے
حلقہ ہو جیسے نور کا گرد آفتاب کے

چلاتی تھی ارے مرا پیارا ہے کس طرف   اے آسماں وہ عرش کا تارا ہے کس طرف
اے ابر شام چاند ہمارا ہے کس طرف   اے ارض کربلا وہ سہارا ہے کس طرف

ہے ہے سناں سے جان گئی میہمان کی
میّت کدھر کو ہے مرے کڑیل جوان کی
اے میرے لمبے گیسوؤں والے کدھر ہے تو ہے ہے مرے غریبی کے پالے کدھر ہے تو
واری کہاں لگے تجھے بھالے کدھر ہے تو کیونکر پھوپھی جگر کو سنبھالے کدھر ہے تو
اٹھارواں برس تھا کہ موت آگئی تجھے
اے نورِ عین کس کی نظر کھا گئی تجھے
ہے ہے مرے سعید و رشید و متین جواں خوشرو جواں غریب جواں مہ جبیں جواں
صفدر جواں شکیل جواں نازنیں جواں کس نے تجھے مروڑ لیا اے حسیں جواں
آغاز تھیں مسیں ابھی ایسے سِن نہ تھے
بچّے مرے ابھی ترے مرنے کے دن نہ تھے
یہ بین کرتی جاتی تھی وہ سوختہ جگر سیدانیوں کا غول تھا پیچھے برہنہ سر
جاتی تھی بیچوں بیچ اِدھر سے وہ نوحہ گر آئے اُدھر سے لاش لئے شاہِ بحر و بر
دیکھا لہو رواں جو تنِ پاش پاش سے
سب بی بیاں لپٹ گئیں اکبرؑ کی لاش سے

مناظرِ قدرت

عربی اور فارسی میں مناظرِ قدرت پر بہت کم لکھا گیا ہے، اور اُردو میں تو گویا سرے سے اس کا وجود ہی نہ تھا، میر ضمیر نے سب سے

پہلے اس پر طبع آزمائی کی، لیکن وہ مضمون بندی اور استعارات کو کلام کا اصلی جوہر سمجھتے تھے، اس لئے اصلی حالت نہ ادا کر سکے، میر انیس نے اس صنف پر اگرچہ صرف دو تین مرثیئے لکھے ہیں، لیکن جو کچھ لکھا ہے، کمال کے درجہ پر پہنچا دیا ہے۔

صبح کا سماں

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح　　ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اختران صبح　　ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شب تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

خورشید نے جو رخ سے اٹھائی نقاب شب　　در کھل گیا سحر کا ہوا بند باب شب
انجم کی فرد فرد سے لے کر حساب شب　　دفتر کشائے صبح نے الٹی کتاب شب
گردوں پہ رنگ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطانِ غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے عیاں　　چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں　　مرجھا کے رہ گئے ثمر و شاخ کہکشاں
دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور　　یادِ خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا، وہ فضا وہ نور　　خنکی ہو جس سے چشم کو، اور قلب کو سرور

انساں زمیں پہ محو ملک آسماں پر
جاری تھا ذکر قدرتِ حق ہر زباں پر

وہ سُرخیِ شفق کی اُدھر چرخ پر بہار — وہ بارور درخت، وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کی وہ گلوں پہ گُہر ہائے آبدار — پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

تھی دشتِ کربلا کی زمیں رشکِ آسماں — تھا دور دور تک شبِ مہتاب کا سماں
چھٹکے ہوئے ستاروں کا ذرّوں پہ تھا گماں — نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں
ہر سبز جو درخت تھا وہ نخلِ طور تھا
صحرا کے ہر نہال کا سایہ بھی نور تھا

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں ؎

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح — گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح — سرگرم ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم — مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم — سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ صبح نور اور وہ صحرا وہ سبزہ زار ۔ تھے طائروں کے غول درختوں پہ بیشمار
چلنا نسیم صبح کا رہ رہ کے بار بار ۔ کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار

واتھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں ۔ تھا جسکی ضو سے وجد میں طاؤس آسماں
ذرّوں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں ۔ نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں

ہر نخل پر ضیائے سرِ کوہِ طور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد ۔ مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سبز و سرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد ۔ یہ خوف تھا کہ دامنِ گل پر پڑے نہ گرد

دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

ایک اور موقع پر بھی یہی سماں باندھتے ہیں ۔

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور ۔ دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوج طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور ۔ وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور

گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک ۔ شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک ۔ ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک

ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا — دراج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گُل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا — سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار — پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار — بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زیبِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دئے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم — کوکو کا شور، نالۂ حق سرہ کی دھوم
سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم — جاری تھے وہ جو ان کی عبادت کی تھی رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربِ علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی خاک اڑا کے یہ کہتی تھی بار بار — اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حی و یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار — تسبیح تھی کہیں، کہیں تہلیلِ کردگار
طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

گرمی کا سماں | گرمی کا سماں شعرائے فارس نے باندھا ہے، لیکن

نہایت مبالغہ اور دور از کار خیالات سے کام لیا ہے۔ طالب آملی کا ایک قصیدہ ہے جس میں قصیدہ کی تشبیب گرمی کے بیان سے شروع کی ہے ؎

چناں بخار زمیں تیرہ ساخت آب زلال
کہ قطرہ برلب جومی کند نیابت خال

ہوائے مہر ز تفسیدگی چناں گردید
کہ شعلہ راز نسیم است بیم اضمحلال

مرزا صائب ایک قصیدہ میں گرمی کی شدت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

نیست ایں فوارہ ہر سو جلوہ گر در حوض ہا
کردہ است از تشنگی بیروں زبان خویش آب

ایک اور شاعر نے فرضی توجیہہ خوب کی ہے ؎

گرد باد از پئے آں می جہد از جا کہ براہ
پائے می سوزدش از بسکہ زمیں شد سوزاں

میر انیس بھی اگرچہ رواج عام کے اثر سے نیچرل حالت سے جا بجا تجاوز کر گئے ہیں تاہم اُن کا اصلی جوہر بھی نمایاں ہے ؎

وہ لون، وہ آفتاب کی حدت، وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ، دھوپ سے دن کا مثال شب

خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب

اُڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

آبِ رواں سے منہ نہ اُٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر

مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر   خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار   ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گل نہ لہکتا تھا سبزہ زار   کانٹا ہوئی تھی پھول کی ہر شاخ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے   آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے   گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں   انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
مُنہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں   تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب   چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب   کافورِ صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

جو لوگ کہتے ہیں کہ میر انیس کے ہاں خیال آفرینی اور مضمون بندی نہیں ہے وہ ان اشعار میں سے اُن شعروں کو دیکھیں جہاں نیچرل حالت سے ہٹ کر، مبالغہ اور تکلف پیدا ہو گیا ہے۔

منظر

(یعنی سین)

کسی خاص واقعہ یا کسی خاص حالت کی تصویر کھینچنا جس کو انگریزی میں سین کہتے ہیں، واقعہ نگاری کی ایک قسم ہے۔

عام واقعہ نگاری اور سین میں یہ فرق ہے کہ واقعہ نگاری میں ہر واقعہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے، بخلاف اس کے سین اس کیفیت کا نام ہے جو متعدد واقعات یا واقعہ کے متعدد جزئیات کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہے، مثلاً اس شعر میں ؎

لوں چلتی ہے خاک اُڑتی ہے ہے ظہر کا ہنگام
تنہا یہ چلی آتی ہے اُمنڈی سیہ شام

لوں کا چلنا۔ خاک کا اڑنا۔ ظہر کا وقت ہونا، فوجوں کا اُمنڈنا ہر چیز کو الگ الگ لیا جائے تو واقعہ ہے اور ان سب کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو سین ہے۔

میر انیس نے شاعری کے اس صنف کو جس کمال تک پہنچایا اردو

کیا فارسی میں بھی اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں، ہم چند مثالیں ذیل میں درج کرتے ہیں۔

مثال ۱۔ حُر نزع کی حالت میں ہے، امام حسین علیہ السلام اُس کے سرہانے موجود ہیں، اُس وقت کی حالت اور گفتگو سنو

نزع کی حالت

قبلہ رو کیجئے لاشہ مرا اے قبلۂ دیں ۔۔۔ پڑھئے لٰیسین کہ اب ہے یہ دمِ بازپسیں
کوچ نزدیک ہے اے بادشہِ عرش نشیں ۔۔۔ لیجئے تن سے نکلتی ہے مری جانِ حزیں
بات بھی اب تو زباں سے نہیں کی جاتی ہے
کچھ اُٹھا دیجئے مولا مجھے نیند آتی ہے

کہہ کے یہ گود میں شبیرؑ کے لی انگڑائی ۔۔۔ آیا ماتھے پہ عرق چہرے پہ زردی چھائی
شہ نے فرمایا ہمیں چھوڑ چلے اے بھائی ۔۔۔ چل بسے حُرِّ جری پھر نہ کچھ آواز آئی
طائرِ روح نے پرواز کی طوبا کی طرف
پُتلیاں رہ گئیں پھر کر شہ والا کی طرف

مثال ۲۔

گرمی کی شدت میں لوگوں کی حالت

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت ۔۔۔ پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت ۔۔۔ سنولا گئے ہیں رنگِ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں
تولے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر ۔۔۔ صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر

رنج مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر لب برگِ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر
آتی ہے خاک اڑ کے یمین و یسار سے
گیسوے مشکبار اَٹے ہیں غبار سے
اہلِ حرم ہیں ہودج و محمل میں بے قرار معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار
بانوؑ پکارتی ہے کہ اے شاہِ نامدار گرمی سے جاں بلب ہے مرا طفلِ شیرخوار
کیونکر یہ دُکھ اُٹھے چھ مہینے کی جان سے
گرمی ہے یا برستی ہے آگ آسمان سے
چلّاتی ہے سکینہؑ کہ اچھے مرے چچا محمل میں گھٹ گئی مجھے پانی تو دو ذرا
بابا سے کہہ دو اب کہیں خیمہ کریں بپا ٹھنڈی ہوا میں لیکے چلو تم پہ میں فدا
سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ آب ہے
تم تو ہوا میں ہو مری حالت خراب ہے

مثال ۳۔

صغیر السن بچہ نزع کی حالت میں

راوی نے یہ لکھا ہے کہ اِس دم بہ حالِ زار لائے حسینؑ ہاتھوں پہ اک طفلِ شیرخوار
دن کو ہوا قرانِ مہ و مہرِ آتشکار مرجھا گیا تھا پیاس سے لیکن وہ گلعذار
تھا فرطِ غش سے ننھا سا منکا ڈھلا ہوا
باندھے ہوئے تھا مُٹھیاں اور مُنہ کھلا ہوا
چھوٹا سا ایک سبز عمامہ تھا دوش پر ماتھا جھنڈولے بالوں میں ہالے میں جوں قمر
جُٹی بھویں وہ جن پہ تصدق دل و جگر آنکھیں تو نرگسی پہ نقاہت زیادہ تر

سایہ میں دامنِ خلفِ بو تراب کے
رُخسار تھے کہ پھول کھلے تھے گلاب کے
پھیلا ہوا وہ آنکھوں میں کاجل اِدھر اُدھر خشکیدہ ہونٹھ ہوئے مژہ آنسوؤں سے تر
ہاتھوں سے ننھا منہ جیسے دودھ کا اثر ہاتھوں میں نیلے ڈورے تھے ہیکل تھی سینہ پر
ننھے سے دل کو ماں کے بچھڑنے کا درد تھا
رن کی ہوائے گرم سے جسم اُس کا سرد تھا
کُرتا بدن میں آتا تھا اِس رنگ سے نظر پڑتی ہے اوس پھولوں پہ جیسے دمِ سحر
سینہ تھا صاف صورتِ آئینۂ جلوہ گر گرمی سے ہو گیا تھا تلوکہ عرق میں تر
چھاتی میں دمبدم جو دم اُس کا اٹکتا تھا
گھبرا کے ننھے ہاتھوں کو دے دے پٹکتا تھا

مثال ۴۔

فوجوں کی آمد اور جنگ کی طیاری

ہے شور آمد آمدِ فوجِ فلک سریر فوجوں کی ہر طرف سے چلی آتی ہے بھیر
دعوت کے واسطے ہیں سنانیں لئے شریر حضرت کی پیشکش کو کمانیں ہیں اور تیر
پانی پہ چوکیاں ستم آرا بٹھاتے ہیں
دریا کے گھاٹ برچھیوں سے روکے جاتے ہیں
سقّے گئے ہیں شام کے حاکم کے جا بجا ہر پرگنہ سے ہے طلب لشکرِ جفا
آکر اُترتی جاتی ہیں فوجیں جُدا جُدا لیتا ہے جائزہ عمر سعد بے حیا
غل ہے کریں گے قتل جو زہرا کے ماہ کو

انعام میں ملے گا دو ماہہ سپاہ کو

تیغیں سلاح خانہ سے نکلی ہیں بے شمار   ہے جا بجا درستیٔ اسبابِ کارزار
ہوتے ہیں لیس تیروں کے دستے کئی ہزار   خنجر ہوئے ہیں ذبح کو پیاسوں کے آبدار
نوکیں نکالی جاتی ہیں تیروں کی سان پر
پھل برچھیوں پہ چڑھتے ہیں پرچم نشان پر

ولہ

نقارۂ وغا پہ لگی چوب یک بیک   اُٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگے فلک
شہپور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک   قرنا پھنکی کہ گونج اُٹھا دشت دور تک
شورِ دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

حد سے فزوں تھی کثرتِ افواجِ نابکار   نیزہ پہ نیزہ تیغ پہ تھی تیغ آبدار
ہر سمت تھی سناں پہ سناں مثلِ خارزار   ہر صف میں تھی سپر پہ سپر مثلِ لالہ زار
پیکاں بہم تھے جیسے ہوں گل بے کھلے ہوئے
گوشوں سے تھے کمانوں کے چلّے چڑھے ہوئے

اُمڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دل پہ دل   تھے برچھیوں کی صورتِ مقراض کھل کھل
خنجر وہ جنکی آب میں ہے تلخیٔ اجل   وہ گرز جن کے ڈر سے گرے دیو سر کے بل
دو دو تبر تھے پاس ہر اک خود پسند کے
حلقوں پہ تھے کھنچے ہوئے حلقے کمند کے

مثال ۵۔

سفر کی طیاری

آراستہ ہیں بہرِ سفر سرو قبا پوش   عمامے سروں پر ہیں، عبائیں بسرِ دوش
یارانِ وطن ہوتے ہیں آپس میں ہم آغوش   حیراں کوئی تصویر کی صورت کوئی خاموش
منہ ملتا ہے رو کر کوئی سرور کے قدم پر
گر پڑتا ہے کوئی علی اکبرؑ کے قدم پر

عباسؑ کا منہ دیکھ کے کہتا ہے کوئی آہ   اب آنکھوں سے چھپ جائیگی تصویر ید اللہ
کہتے ہیں گلے مل کے یہ قاسمؑ کے ہوا خواہ   واللہ دلوں پر ہے عجب صدمۂ جانکاہ
ہم لوگوں سے شیریں سخنی کون کرے گا
یہ اُنس یہ خُلقِ حسنی کون کرے گا

روتے ہیں وہ جو عونؑ و محمدؑ کے ہیں ہم سن   کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلیگا تم بن
اس داغ سے چین آئے ہمیں یہ نہیں ممکن   گرمی کا مہینہ ہے سفر کے یہ نہیں دن
تم حضرتِ شبیرؑ کے سایہ میں پلے ہو
کیوں دھوپ کی تکلیف اُٹھانے کو چلے ہو

ہمجولیوں سے کہتے ہیں وہ دونوں برادر   ہاں بھائیو تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر
پالا ہے ہمیں شاہ نے ہم جائیں نہ کیونکر   ماموں رہیں جنگل میں تو اپنا ہے وہی گھر
وہ دن ہو کہ ہم حقِ غلامی سے ادا ہوں
تم بھی یہ دعا مانگو کہ ہم شہ پہ فدا ہوں

رخصت کے لئے لوگ چلے آتے ہیں پیہم   ہر قلب حزیں ہے تو ہر اک چشم ہے پُرنم

ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم غل ہے کہ چلا دلبرِ مخدومۂ عالم
خدّام کھڑے پیٹتے ہیں قبرِ نبیؐ کے
روضہ پہ اداسی ہے رسولؐ عربی کے

تدبیرِ سفر میں ہے اُدھر سبطِ پیمبرؐ گھر میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں باہر
اسباب نکلواتے ہیں عباسؑ دلاور تقسیم سواری کے تردد میں ہیں اکبرؑ
ان کو جنھیں لیجانا ہے وہ پاتے ہیں گھوڑے
خالی ہوا اصطبل چلے آتے ہیں گھوڑے

حاضر درِ دولت پہ ہیں سب یاور و انصار کوئی تو کمر باندھتا ہے اور کوئی ہتھیار
ہودج بھی کسے جاتے ہیں محمل بھی ہیں تیار چلّاتے ہیں دربان کوئی آئے نہ خبردار
ہر محمل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قناتیں لئے فرّاش کھڑے ہیں

عوراتِ محلّہ چلی آتی ہیں بصد غم کہتی ہیں یہ دن رحلتِ زہراؑ سے نہیں کم
پُرسے کی طرح رونے کا غل ہوتا ہے ہر دم فرش اٹھتا ہے کیا بچھتی ہے گویا صفِ ماتم
غل ہوتا ہے ہر سمت جدا ہوتی ہے زینبؑ
ہر اک کے گلے ملتی ہے اور روتی ہے زینبؑ

لے لے کے بلائیں یہی سب کرتی ہیں تقریر اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیرؑ
سمجھاتی نہیں بھائی کو اے شاہ کی ہمشیر مسلمؑ کا خط آلے تو کریں کوچ کی تدبیر
للہ ابھی قبرِ پیمبرؐ کو نہ چھوڑیں
گھر فاطمہؑ زہراؑ کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

سفر کی تیاری اور سواری کی تقسیم

اُجڑے گا مدینہ جو یہ گھر ہووےگا خالی   بربادیٔ یثرب کی بنا چرخ نے ڈالی
کیا جائیں کہ پھر آئیں نہ آئیں شہ عالی   حضرت کے سوا کون ہے اس شہر کا والی

زہرا ہیں نہ حیدر نہ پیمبر نہ حسن ہیں
اب اُن کی جگہ آپ ہیں یا شاہِ زمن ہیں

گرمی کے یہ دن اور پہاڑوں کا سفر آہ   ان چھوٹے سے بچوں کا نگہبان ہے اللہ
رستے کی مشقت سے کہاں ہیں کبھی آگاہ   ان کو تو نہ لیجائیں سفر میں شہ ذیجاہ

قطرہ بھی دم تشنہ دہانی نہیں ملتا
کوسوں تلک اس راہ میں پانی نہیں ملتا

منہ دیکھ کے اصغر کا چلا آتا ہے رونا   آرام سے مادر کی کہاں گود میں سونا
جھولا یہ کہاں اور کہاں نرم بچھونا   لکھا تھا اسی سن میں مسافر انہیں ہونا

کیا ہوگا جو میداں میں ہوا گرم چلے گی
یہ پھول سے کمھلائینگے ماں ہاتھ ملے گی

اُن بیبیوں سے کہتی تھی یہ شاہ کی ہمشیر   بہنوں ہمیں یثرب سے لئے جاتی ہے تقدیر
اس شہر میں رہنا نہیں ملنا کسی تدبیر   یہ خط یہ خط آئے ہیں کہ مجبور ہیں شبیر

مجھ کو بھی ہے رنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی
بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی

مثال ۲۔

گرمی اور گرمی کی شدت میں زن و مرد اور بچوں کی حالت

تختی تھے شرر شدتِ گرما سے حجر میں   چلتی تھی یہ لو آگ بھڑکتی تھی جگر میں

جہاں نما ۱۹۶۷ء

نہ سحر میں راحت تھی کسی دل کو نہ بن میں جھیلوں میں نہ پانی تھا نہ پتے تھے شجر میں
پایاب تھے گرمی سے وہ دریا جو بڑے تھے
سوتیں بھی نہ آتی تھیں کنویں خشک پڑے تھے

پتھر کی چٹانوں سے نکلتے تھے شرارے ناری تھی ہوا سبز شجر زرد تھے سارے
ڈوبے تھے عرق میں اسداللہ کے پیارے دھڑکا تھا کہ یہ لوں کسی بچے کو نہ مارے
ہوش آتا نہ تھا اصغرؑ معصوم کو غش سے
اودے تھے لب لعل سکینہؑ کے عطش سے

تھا گرمی کی شدت سے یہ حال شہ ابرار ماتھے سے ٹپکتا تھا عرق سرخ تھے رخسار
تمجید میں جنباں تھے لب لعل گہربار بھر کر نفس سرد یہ فرماتے تھے ہر بار
اک پھول بھی زہراؑ کے چمن میں نہ ملے گا
کیا ہوگا جو پانی کسی بن میں نہ ملے گا

گرمی سے یہ تھا حضرت عباسؑ کا عالم منہ سرخ تھا اور ہانپتے تھے صورت ضیغم
چہرہ بھی عرق ناک تھا اور طبع بھی برہم فرماتے تھے اللہ کہ آنکھوں میں پھرا عالم
تم شیر ہو راحت تمھیں بھائی نہ ملے گی
جب تک کسی دریا کی ترائی نہ ملے گی

گرمی کی شدت سے ایک ایک شخص کی حالت

یوں اکبرؑ مہرو تھے پسینے میں نہائے جیسے تپ محرق میں جواں کو عرق آئے
جب جھکنے لگا دل تو سخن لب پہ یہ لائے رب وہ جہاں حشر کی گرمی سے بچائے
گزرے گا ہر اک دم تپش دل سے قلق میں
سب نانا کے ڈوبے ہوئے ہوں گے عرق میں

حضرت کو سکینہؑ یہ صدا دیتی تھی پیہم — محمل میں گھٹا جاتا ہے گرمی سے مرا دم
سب ڈوب گئی ہوں میں پسینے کا ہے عالم — برسے گی یوں ہی آگ تو جینے کے نہیں ہم
ہیں ابرِ کرم آپ کرم کیجئے بابا
سایہ کہیں مل جائے تو دم لیجئے بابا

سن کر یہ بھتیجی کی صدا حضرتِ عباسؑ — کہتے تھے چچا صدقے ہو روؤ نہ بصد یاس
لو پانی پیو تم کو لگی ہو جو بہت پیاس — دم گھٹتا ہے محمل میں تو آجاؤ مرے پاس
تکلیف تمہاری ہمیں منظور نہیں ہے
دن ڈھلتا ہے منزل بھی بس اب دور نہیں ہے

مشکیں لئے سقے جو سواری کے تھے ہمراہ — بھر لائے تھے پانی پئے فوجِ شہِ سجاد
جس طرح کہ پیاسوں کا ہو مجمع بہ سرِ راہ — پانی پہ گرے پڑتے تھے یوں تشنہ کے ہوا خواہ
جنگل میں عطش کا جو تھا صدمہ کہ و مہ پر
چہرہ پہ چھڑکتا تھا کوئی، کوئی زرہ پر

بھرتا تھا دمِ سرد پریشاں کوئی ہو کے — دامن سے ہوا دیتا تھا منہ کو کوئی دھو کے
بچتا تھا کوئی لوں سے ردا چہرہ پہ رو کے — رکھ لیتا تھا سر پر کوئی رومال بھگو کے
پڑتی تھیں جو چھینٹیں تو مزا دیتا تھا پانی
جھک کر کوئی چلوؤں سے پی لیتا تھا پانی

کہتے تھے قریں ناقوں کے آ کر تشنۂ ابرار — حاضر ہے جو پانی کسی بی بی کو ہو درکار
آندھی ہے گھٹا ٹوپ اڑے جاتے ہیں ہر بار — اے بنتِ ید اللہ سکینہؑ سے خبردار
رستہ یہ پہاڑوں کا ہے منزل یہ کڑی ہے

بچوں کو چھپائے رہو، لُوں آج بڑی ہے

محمل سے نظر کرکے یداللہ کی جائی　　کہتی تھی کہ اللہ نے یہ شکل دکھائی
جس دن سے چھٹا گھر کہیں راحت نہیں پائی　　فریاد بہن دھوپ میں سونلا گئی بھائی
کیا بن گئی جنگل میں امام دوسرا پر
سایہ بھی درختوں کا نہیں ظلِّ ہما پر

صدقے گئی جنگل کی نہ اب دھوپ میں چلیے　　دن کاٹیے سایہ میں کہیں رات کو چلیے
منہ دھوئیے دم لیجئے پوشاک بدلیے　　لوں چلتی ہے آفت کی پہاڑوں سے نکلیے
ناشاد بہن آپ کی غربت پہ فدا ہو
بچہ کوئی گر تونس کے مرجائے تو کیا ہو

مثال ۷

لڑائی کی طیاری

یہ ذکر تھا کہ بجنے لگا طبل اس طرف　　مشکل کشا کی فوج نے باندھی ادھر بھی صف
تیروں نے رخ کیا سوئے ابنِ شہِ نجف　　سینوں کو غازیوں نے ادھر کر دیا ہدف
تھا بسکہ شوقِ جنگ ہر ایک رشکِ ماہ کو
جوش آگیا وغا کا حسینی سپاہ کو

غصّے سے آفتاب ہوئے مہوشوں کے رنگ　　فوجوں پہ جا پڑیں یہ دلوں کو ہوئی اُمنگ
تن تن کے برچھیاں جو سنبھالیں برائے جنگ　　بیچین ہوگئے فرسِ ابلق و سرنگ
پاسِ ادب سے شاہ کی صف بڑھ کے تھم گئی
پٹری ہر اک سوار کی گھوڑے پہ جم گئی

منظرِ جنگ سے پہلے مجاہدوں کی کیا حالت ہوتی ہے۔

تنتنا ہوا بڑھا کوئی قبضہ کو چوم کے　　بھالا کسی نے رکھ لیا کاندھے پہ جھوم کے
بولا کوئی یہ غول ہیں کیا شام و روم کے　　ٹکڑے اڑائیں گے عمر و شمر شوم کے
نامرد جو ہیں آنکھ چراتے ہیں مرد سے
دونوں کو چار کر کے پھریں گے نبرد سے

دو لاکھ سے نظر کسی غازی کی لڑ گئی　　بل کھا کے زلف رخ پہ کسی کے اکڑ گئی
چتون کسی کی شور دہل سے بگڑ گئی　　منہ سرخ ہو گیا شکن ابرو پہ پڑ گئی
نکلا کوئی سمند کو رانوں میں داب کے
غصے سے رہ گیا کوئی ہونٹوں کو چاب کے

بڑھ کر کسی نے تیر ملایا کمان سے　　نیزہ کوئی ہلانے لگا آن بان سے
نعرہ کسی کا پار ہوا آسمان سے　　تلوار کھینچ لی کسی صفدر نے میان سے
اک شور تھا کہ تلخ کیا ہے حیات کو
لاشوں سے چل کے پاٹ دو نہر فرات کو

سنتے ہی یہ کلام جوانانِ نامور　　لڑکے اآگے کھڑے ہوئے غول اپنا باندھ کر
کہتے تھے پیچھے لیے وہ غیرتِ قمر　　یارب شکست کوفیوں کو دے ہمیں ظفر
سر کے نہ پھر وغا میں جو بڑھ کے قدم گڑے
جا کر درِ یزید پہ اپنا علم گڑے

مثال ۸۔

بیکسی اور تنہائی

حضرت پہ آدھر ہوئی ہے اعدا کی چڑھائی　　تنہا ہیں نہ بیٹا نہ بھتیجا ہے نہ بھائی

سیدانیاں دیتی ہیں محمدؐ کی دہائی — اعدا ہیں یہ غُل ہے کہ کرو فتح لڑائی
ڈوبے ہوئے خوں میں شہدا گرد پڑے ہیں
گھوڑے پہ اکیلے شہِ ابرار کھڑے ہیں

ہے تابشِ خور سے عرق افشاں رُخِ گلفام — لب خشک ہیں پانی کا میسر نہیں اک جام
لو چلتی ہے خاک اڑتی ہے ہے ظہر کا ہنگام — تنہا پہ چلی آتی ہے اُمنڈی سپہِ شام
یہ شوقِ شہادت ہے شہنشاہِ زمن کو
بوچھار سے تیروں کے بچاتے نہیں تن کو

ہیں آگے ہیں تیغوں کے کھڑے پر نہیں کچھ غم — اُمّت پہ نہ آنچ آئے دعا ہے یہی ہر دم
ہیں گرد بیاباں میں اَٹے گیسوئے پُرخم — نیلے ہیں لبِ لعل یہ ہے پیاس کا عالم
بو آتی ہے دریا سے برادر کے لہو کی
چھینٹیں ہیں قبا پہ علی اکبرؑ کے لہو کی

ذکرِ غمِ عباسؑ بھی اصلا نہیں کرتے — غیرت سے نظر جانبِ دریا نہیں کرتے
خونِ علی اکبرؑ کا بھی دعوا نہیں کرتے — اُمّت کے یہ ہیں ظلم پہ شکوا نہیں کرتے
پانی کے بھی طالب نہیں گو تشنہ دہن ہیں
کلمے ہیں نصیحت کے محبت کے سخن ہیں

مثال ۹ -

فوج کا داخلہ اور طیاری جنگ

خیمہ میں اُترے یاں تو شہِ عرش بارگاہ — آ آ کے اُس طرف بھی اُترنے لگی سپاہ
کوسوں علم کھلے تھے جدھر کیجیے نگاہ — یاں تک کہ بند ہو گئی چاروں طرف سے راہ

فوجوں سے تابہ صبح زمیں رن کی بھر گئی
اک رات میں چڑھی ہوئی ندی اتر گئی
اس کثرتِ سپاہ پہ ناگہ ہوئی یہ دھوم   آپہونچا شام سے پسرِ سعدِ نحس و شوم
جسکی جلو میں لاکھ سواروں کا ہے ہجوم   اکثر ہیں یکہ تازِ جوانانِ شام و روم
بس کھل گیا نہ طور صفائی کا ہوئے گا
اب کل سے بندوبست لڑائی کا ہوئیگا
یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوئے نشان   امڈا رہیں یہ ظلم کا دریائے بیکراں
موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش و پس رواں   لہراتے تھے ہوا سے علم مثلِ بادباں
ہلتا تھا دشت گین ڈہل اس طرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے
جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دل   خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار و اہلِ نار و دغا باز و پُر دغل   شکلیں مہیب دیو سے قد ابرِ دَل پہ دَل
بدخواہ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے چلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے
تلواریں کھینچے بڑھ کے جمے دو طرف سوار   غل ہوگیا سلامی کے باجوں کا ایک بار
ڈنکے کی دمبدم تھی صدا آسماں کے پار   "آگے بڑھے چلو" یہ نقیبوں کی تھی پکار
گھوڑوں کے گرد و پیش رئیسانِ شام تھے
زرّیں کمر جلو میں کئی سو غلام تھے
مثال ۱۰۔ حضرت عباس نہر سے مشک بھر چکے ہیں اور واپس

آنا چاہتے ہیں، دشمن یہ دیکھ کر ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں، حضرت عباسؑ
اس کشمکش میں ہیں کہ آپ کو بچائیں یا مشک کو سنبھالیں، اُس وقت کے
مضطربانہ حرکات کی تصویر۔ ــــ ۵

اک تشنہ کام لاکھوں میں کس کس کو دے جواب — شل ہو گیا تھا بازوئے فرزند بوتراب
کہتا تھا ہاتھ اُٹھنے کی مجھ میں نہیں ہے تاب — لڑنے میں فکر تھی کہ نہ ضائع ہو مشکِ آب
پروا نہ تھی جو بازوؤں پر تیر کھاتے تھے
لیکن سپر سے مشکِ سکینہؑ بچاتے تھے

برچھی سے چھد گیا کبھی دل اور جگر کبھی — اک شیر سے اِدھر کبھی جھپٹے اُدھر کبھی
چھاتی تلے تھی مشک کبھی دوش پر کبھی — سینہ کبھی تھا مشک کے اوپر سپر کبھی
رہوار پر سنبھلتے تھے جب جھوم جھوم کے
روتے تھے بازوؤں کو علیؑ چوم چوم کے

تکتے تھے مسکرا کے سوئے آسماں کبھی — ہونٹوں پہ پھیر لیتے تھے سوکھی زباں کبھی
لگتا تھا تن پہ تیر کبھی اور سناں کبھی — جھکتے تھے خود فرس سے کبھی اور نشاں کبھی
گھوڑے کو جب بڑھاتے تھے رانوں میں داب کے
قدموں سے نکلے جاتے تھے حلقے رکاب کے

چھینٹیں لہو کی اُڑ کے جو پڑتی تھیں مشک پر — دامن سے پونچھتے تھے علمدار نامور
یہ پاس تھا کہ تیغوں سے ٹکڑے ہو سراسر — شُقّہ تک علم کا لہو سے نہ ہوئے تر
اقبال بادشاہِ زمین و زماں رہے
دنیا میں میں رہوں نہ رہوں یہ نشان رہے

ولہ

گر گر کبھی اُٹھے کبھی رکھا زمیں پہ سر   اُبلا کبھی لہو تو سنبھالا کبھی جگر
حسرت سے کی خیام کی جانب کبھی نظر   کروٹ کبھی تڑپ کے اِدھر لی کبھی اُدھر

اُٹھ بیٹھے جب تو زخموں سے برچھی کے پھل گرے
تیر اور تن میں گڑ گئے اجب مُنہ کے بھل گرے

مثال ۱۱۔

پردہ کا اہتمام

بیت الشرفِ خاص سے نکلے شہ ابرار   روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترتِ اطہار
فرّاشوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار   پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار

باہر حرم آتے ہیں رسولؐ دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکے سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اُتر جائے   آتا ہو اِدھر جو وہ اُسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے   دیتے رہو آواز جہانتک کہ نظر جائے

مریم سے سوا حق نے شرف اِن کو دئے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کئے ہیں

آ پہونچی جو ناقہ کے قریں دخترِ حیدرؑ   خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبطِ پیمبرؐ
فضہ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشۂ چادر   تھے پردۂ محمل کو اُٹھائے علی اکبرؑ

فرزند کمر بستہ چپ و راست کھڑے تھے
نعلین اُٹھا لینے کو عباسؑ کھڑے تھے

مثال ۱۲۔

مستورات کا محمل سے اترنا

جمازۂ زینب جو قریں ڈیوڑھی کے پہنچا   کرسی سے اُٹھے آپ شہِ یثرب و بطحا
گرد آ کے کیا قاسم و عباسؑ نے پردا   محمل سے اترنے جو لگی دخترِ زہراؑ

اک ہاتھ علی اکبرؑ ذی جاہ نے تھاما
اک ہاتھ جگر بندِ یداللہ نے تھاما

چھاتی سے سکینہؑ کو لگائے ہوئے اتریں   آنسو رخِ انور پہ بہائے ہوئے اتریں
شہزادی کو چادر میں چھپائے ہوئے اتریں   پردا تھا مگر سر کو جھکائے ہوئے اتریں

مثال ۱۳۔ عونؑ و محمدؑ میدانِ جنگ میں لڑ رہے ہیں، سیدانیاں

دروازہ پر بدحواس کھڑی ہیں، حضرت زینبؑ فضہ سے پوچھتی ہیں کہ میرے بچے کیا کر رہے ہیں؟ وہ جواب دیتی ہے ؎

سیدانیاں دروازہ پہ تھیں کھولے ہوئے سر   اصغر کو لیے کانپتی تھی بانوئے بے پر
فضہ تھی پریشان کیے مو خیمے کے اندر   پردہ سے لگی کہتی تھی یہ شاہ کی خواہر

بتلا مجھے بچے مرے کیا کرتے ہیں دونوں
وہ کہتی تھی لاکھوں سے وغا کرتے ہیں دونوں

وہ رخ پہ نظر آتے ہیں اڑتے ہوئے گیسو   وہ تیغیں بجلی کی طرح گرتے ہیں ہر سو
ڈھالیں لیے وہ بھاگتے پھرتے ہیں جفاجو   وہ ابر میں چھپ چھپ کے نکل آتے ہیں مہ رو

بہتا ہے لہو چھاتیوں سے، چور ہیں دونوں
کس طرح پکاروں کہ بہت دور ہیں دونوں

مثال ۱۴۔ حضرت عباسؑ نہر کے کنارے پہنچے ہیں۔ گھوڑا کئی دن کا پیاسا تھا۔ پانی دیکھ کر بیتاب ہو گیا ہے، لیکن چونکہ تمام قافلہ پیاسا ہے، حضرت عباسؑ اُس کو پانی پینے سے روکتے ہیں۔ اُس وقت گھوڑے کی حالت ؎

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند	دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند	چمکارتے تھے حضرت عباسؑ ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

مثال ۱۵۔ حضرت امام حسین علیہ السّلام کا میدان کربلا میں داخلہ، رُفقا سے خطاب، اور نوجوانوں کی سیر و تفریح ؎

اُترا یہ کہہ کے کشتیِ اُمت کا ناخدا	جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
حضرت نے مسکرا کے ہر اک سے کہا	دیکھو تو، کیا ترائی ہے؟ کیا نہر؟ کیا فضا
اکبرؑ شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباسؑ جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر
بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہِ سربلند	کیوں یہ مقام ہے تمھیں شاید بہت پسند
کی مسکرا کے عرض کہ اے شاہِ ارجمند	بس یاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند
سیراب یہیں رہیں گے عنایت جو رب کی ہے
میں کیا کہوں حضورؑ، ترائی غضب کی ہے
روتے ہوئے وہاں سے بڑھے آپ چند گام	گویا زمیں کی سیر کو اُترا مہِ تمام

انجم کی طرح گرد تھے حیدرؑ کے لالہ فام　　تشکلیں وہ نور کی وہ تجمّل وہ احتشام
زلفیں ہوا میں اڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

مثال ۱۶-

تمام رفقا کی شہادت کے بعد حضرت امام حسینؑ کی بیکسی اور دشمنوں کا نرغہ

مومنو خانۂ زہراؑ پہ تباہی ہے آج　　گھر پہ سادات کے پانی کی مناہی ہے آج
تنِ تنہا خلفِ شیرِ الٰہی ہے آج　　خلق سے سبطِ نبیؐ خلد کو راہی ہے آج
قتل کی بیکس و مظلوم کی تدبیریں ہیں
اک نبیؐ زادہ ہے اور سیکڑوں شمشیریں ہیں

تیر سے تانے ہوئے امڈے چلے آتے ہیں سوار　　ہیں کماندار پرا باندھے ہوئے تیس ہزار
تیغیں کھینچے ہوئے ہو گرد کھڑے ہیں جو سوار　　غل ہے مہلت نہ ملے سبطِ نبیؐ کو زنہار
برقِ شمشیر ہر اک جا پہ چمک جاتی ہے
جس طرف دیکھتے ہیں موت نظر آتی ہے

نہ ہے غمخوار نہ ہمدرد نہ یاور کوئی　　نہ بھتیجا ہے نہ بیٹا نہ برادر کوئی
نہیں اتنا ہے خبر پوچھے جو آکر کوئی　　ایک اللہ تو ہے اور نہیں سر پر کوئی
تھے جو غمخوار وہ ریتی پہ پڑے سوتے ہیں
اپنی تنہائی پہ شاہِ دو جہاں روتے ہیں

جسم پر تیغ لگاتا ہے کوئی اور کوئی تیر　　خوں میں سر تا بقدم تر ہیں جنابِ شبیرؑ
رو کے فرماتے ہیں اللہ اسے کرلے تو تم شریر　　کیا گنہ ہے مجھے کیوں مارتے ہو بے تقصیر

یوں سناؤ نہ کہ میں مرگ پہ آمادہ ہوں
رحم لازم ہے کہ سید ہوں نبیؐ زادہ ہوں

کوئی سنتا نہیں فریاد امام عالی　　برچھیاں چلتی ہیں اور ہوتے ہیں ترکش خالی
ماہِ زہراؑ پہ فلک نے یہ مصیبت ڈالی　　خوں ہیں تر زلفیں ہیں یا نتک ہے پریشاں حالی
زخم تلواروں کے خاموش کھڑے کھاتے ہیں
غش میں جھکتے ہیں کبھی گاہ سنبھل جاتے ہیں

لاشۂ اکبرؑ و عباسؑ جو آتا ہے نظر　　تھام لیتے ہیں کلیجہ کبھی اور گاہ جگر
رو کے فرماتے ہیں بیٹے سے کہ اے جانِ پدر　　ایسے غافل ہو کہ لیتے نہیں بابا کی خبر
مرے پیارے مرے جائے مرے دلبر اٹھو
ہم پہ تنہائی ہے اٹھو علی اکبرؑ اٹھو

لاشِ عباسؑ سے کرتے ہیں بصد یاس بیاں　　اے مرے یار وفادار مرے شیر جواں
وقتِ امداد و اعانت ہے برادر قرباں　　چھوڑ کر ہمکو لعینوں میں سدھارے ہو کہاں
لاکھ ملعونوں نے میداں میں ہمیں گھیرا ہے
تم نے بھائی سے عجب وقت میں منہ پھیرا ہے

کہتے تھے اہلِ ستم حال سناتے ہو کسے　　مر گئے اکبرؑ و عباسؑ بلاتے ہو کسے
کون ہے بیکس و مظلوم دکھاتے ہو کسے　　چونکتے ہیں کہیں مردے بھی جگاتے ہو کسے
حلق پر خنجرِ خونخوار پھرا دیتے ہیں
اب تمہیں بھی اسی مقتل میں گرا دیتے ہیں

رو کے فرماتے ہیں یہ فوجِ ستمگار سے شاہ　　ذبح ہونگے مجھے عبد ہو خالق ہے گواہ

غم میں ہیں اپنوں کے کیونکر نہ کروں نالۂ آہ   اُنکو رؤونگا میں جبتک کہ جیونگا واللہ
بھولتا ہے کوئی اس طرح کے غمخواروں کو
یاد کرتے ہیں وفادار وفاداروں کو

دشت میں جلتی ہیں لوں دھوپ کی شدت ہے کمال   جیٹھ بیساکھ کے ایام ہیں اور وقت زوال
سُرخ ہیں خوں سے قبا دھوپ سے رخسار ہے لال   نکلی آتی ہے زباں منہ سے یہ ہے پیاس کا حال
تن جلا جاتا ہے جب گرم ہوا آتی ہے
ریت اُڑ اُڑ کے ہر اک زخم میں بھر جاتی ہے

تیر بیٹھا ہے جو اُس چاند سی پیشانی پر   خوں کی چادر سی ہے اک چہرۂ نورانی پر
ہے عجب بیکسی اُس فاطمہؑ کے جانی پر   کبھی اعدا پہ نظر ہے تو کبھی پانی پر
تیغیں کھا کھا کے لبِ خشک جو دکھلاتے ہیں
تیر اُدھر سے عوض جرعۂ آب آتے ہیں

جوں کماں کٹ کے لٹک آئے ہیں ابرو خمدار   ہیں لہو رونے سے وہ نرگسی آنکھیں گلنار
بوسے جن ہونٹوں کے لیتے تھے رسول مختار   پیاس سے سوکھ گئے ہیں وہ لبِ گوہر بار
چاند شرمندہ تھا جن پھول سے رخساروں سے
چاک ہیں مثل کتان ظلم کی تلواروں سے

زخمی ہیں ابن یداللہ کے دونوں بازو   ہاتھ یہ ہیہات کہ یکدست ہیں اب بے قابو
تیغ تھامنے پہ کبھی لگتی ہے ساعد پہ کبھو   انگلیاں ایسی ہیں زخمی کہ ٹپکتا ہے لہو
پر یہ ہے اُمتِ محبوبِ خدا کی خاطر
زخمی ہاتھوں کو اُٹھائے ہیں دعا کی خاطر

سخت آفت میں ہے وہ پشت و پناہِ عالم　　کمرِ پاک ہے بارِ غمِ عباسؑ سے خم
علی اکبرؑ کی جوانی کا ہے جانکاہ الم　　زانو پہ مارتے ہیں دستِ تاسف ہر دم
وار سے تیغوں کے اعضائے بدن کٹتے ہیں
کھیت سے پر کہیں شیروں کے قدم ہٹتے ہیں

ساتھ اسوار کے زخمی ہے سراپا رہوار　　کئی سو تیر ہیں گردن سے کبھی پہلو سے کبھی پار
بال سے خوں کی بوندیں ہیں ٹپکتی ہر بار　　نہ کھڑے رہنے کی طاقت ہے نہ تابِ رفتار
تیر جب لگتا ہے کچھ کہہ تو نہیں سکتا ہے
پھیر کر منہ شہِ والا کی طرف تکتا ہے

شاہ فرماتے ہیں اے میرے رفیق و ہمدم　　ہے مجھے اپنے عزیزوں کے برابر ترا غم
ہم سے تو چھٹتا ہے اب تجھ سے جدا ہوتے ہیں ہم　　مر کے بھی تجھکو نہ بھولوں گا ہیں خالق کی قسم
خلق سے سوئے عدم کوچ کی طیاری ہے
آخری اب ترے آقا کی یہ اسواری ہے

دیکھ لے تیری طرح میں بھی ہوں زخمی واللہ　　فاقہ مجھ کو بھی ہے اور تو بھی ہے بے دانہ و کاہ
ہے اگر تشنہ دہانی سے ترا حال تباہ　　تین دن گزرے ہیں پانی سے نہیں ہوں آگاہ
تو زباں خشک جو منہ پھیر کے دکھلاتا ہے
پسرِ ساقیِ کوثر کو حجاب آتا ہے

مثال ۱۷ - اس سین کو ایک دوسرے موقع پر دکھایا ہے ؎

آج شبیرؑ پہ کیا عالمِ تنہائی ہے　　ظلم کی چاند پہ زہراؑ کے گھٹا چھائی ہے

اُس طرف لشکر اعدا میں صف آرائی ہے ... یاں نہ بیٹا نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے

برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں

مارلو پیاسے کو ہے شور ستمگاروں میں

زخمی بازو ہیں کمر خم ہے بدن میں نہیں تاب ... ڈگمگاتے ہیں نکل جاتی ہے قدموں سے رکاب

پیاس کا غلبہ ہے لب خشک ہیں آنکھیں ہیں پُرآب ... تیغ سے دیتے ہیں ہر وار کا اعدا کو جواب

شدتِ ضعف میں جس جا پہ ٹھہر جاتے ہیں

سیکڑوں تیرِ ستم تن سے گزر جاتے ہیں

گیسو آلودۂ خوں لپٹے ہیں رخساروں سے ... شانے کٹ کٹ کے لٹک آئے ہیں تلواروں سے

تیر پیوست ہیں خوں بہتا ہے سوفاروں سے ... لاکھ آفت میں ہے اک جان دل آزاروں سے

فکر ہے سجدۂ معبود میں سر دینے کی

وار سے تیغوں کے فرصت نہیں دم لینے کی

خوں میں تر پیچ عمامے کے ہیں سر زخمی ہے ... ہے جبیں چاند سی پُرنور مگر زخمی ہے

سینہ سب برچھیوں سے تابہ کمر زخمی ہے ... تیر بیداد سے دل زخمی جگر زخمی ہے

ضربِ شمشیر سے بیکار ہیں بازو دونوں

ظلم کے تیروں سے مجروح ہیں پہلو دونوں

برچھی آکر کوئی پہلو پہ لگا جاتا ہے ... مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آجاتا ہے

بڑھتے ہیں زخم بدن زور گھٹا جاتا ہے ... بند آنکھیں ہیں سر پاک جھکا جاتا ہے

گرد زہرا و علی گریہ کناں پھرتے ہیں

غل ہے گھوڑے سے امام دوجہاں گرتے ہیں

گرتے ہیں قطرۂ خوں زخمِ جبیں سے پیہم — دستِ مجروح سے کھینچ سکتے نہیں تیرِ ستم
فکر ہے بخششِ امت کی کچھ اپنا نہیں غم — کرتے ہیں حمدِ خدا خشک زباں سے ہر دم
ہے عبا تیروں سے غربال قبا گلگوں ہے
ہونٹ یاقوت سے زخمی ہیں دہن پُر خوں ہے

زیں سے ہوتا ہے جدا دوشِ محمدؐ کا مکیں — چمنِ فاطمہؑ کا سرو ہے مائل بہ زمیں
برچھیاں گرد ہیں اور بیچ میں ہے سرورِ دیں — ہے یہ نزدیک گرے مہرِ نبوت کا نگیں
پاؤں ہر بار رکابوں سے نکل جاتے ہیں
یا علیؑ کہتی ہے زینبؑ تو سنبھل جاتے ہیں

لاکھ شمشیریں ہیں اور ایک تنِ اطہر ہے — ایک مظلوم ہے اور ظالموں کا لشکر ہے
سیکڑوں خنجرِ فولاد ہیں اور اک سر ہے — نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ کوئی یاور ہے
باگ گھوڑے کی لٹکتی ہے اٹھا سکتے نہیں
سامنے اہلِ حرم روتے ہیں جا سکتے نہیں

کوئی سید کا نہیں آہ بچانے والا — حربے لاکھوں ہیں اور اک زخم اٹھانے والا
پیاس میں کوئی نہیں پانی پلانے والا — سنبھلے کس طرح بھلا برچھیاں کھانے والا
چرخ سے آگ برستی ہے زمیں جلتی ہے
مارے گرمی کے زباں خشک ہے لو چلتی ہے

کہیں دم لینے کو سایہ نہیں ہے وقتِ زوال — اینٹھی جاتی ہے زباں پیاس کی شدت ہے کمال
کبھی زینبؑ کا ہے غم گاہ سکینہؑ کا خیال — دل جو ڈھلتا ہے تو حضرت ہوئے جاتے ہیں نڈھال
مثلِ خورشید بدن ضعف سے تھراتا ہے

نیرِ برجِ امامت پہ زوال آتا ہے

کہتے ہیں ظالموں سے خشک زباں دکھلاکر   بھر حق پانی کا اک جام پلا دو لاکر
اہلِ کیں کہتے ہیں یہ تیغِ ستم چمکاکر   آپ شمشیر پیو برچھیوں کے پھل کھاکر
یہ سخن سُن کے بھی غصّہ نہیں فرماتے ہیں
یاس سے سوئے فلک دیکھ کے رہ جاتے ہیں

عرض کرتے ہیں یہ خالق سے کہ اے ربِّ غفور   تو ہے عالم کہ نہیں کچھ ترے بندہ کا قصور
کرتے ہیں یہ مجھے بجرم و خطا تیغوں سے چور   ہاتھ اُمت پہ اٹھانا نہیں مجھ کو منظور
جانتے ہیں کہ محمدؐ کا نواسا ہوں میں
پانی دیتے نہیں دو روز کا پیاسا ہوں میں

واقعہ نگاری

اُردو زبان کا ایک مشہور انشا پرداز لکھتا ہے۔

”فارسی میں صدہا نظم و نثر کی کتابیں ہیں، جن کے خیالات باریکی اور نازکی عبارات میں، جگنو سے اُڑتے نظر آتے ہیں لیکن کیا حاصل؟ اس انداز میں اصلی ماجرا ادا کرنا چاہو تو ممکن نہیں، ایسی ماں کا دودھ پی کر اُردو نے پرورش پائی تو اس کا کیا حال ہوگا۔

فارسی کے متعلق تو یہ الزام تسلیم نہیں کیا جا سکتا، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اُردو میں جس چیز کی بڑی کمی ہے وہ یہی واقعہ نگاری ہے، شاعری کی

جو صنفیں اُردو میں آئیں وہ قصیدہ اور غزل تھی اِن دونوں کو واقعہ طرازی سے کوئی نسبت نہ تھی، مثنویاں جو لکھی گئیں وہ مورخانہ نہیں بلکہ عاشقانہ تھیں، اس لئے اصلی واقعات کے اظہار کی چنداں ضرورت پیش نہیں آئی، اُردو زبان کی نسبت جو کم مائگی کی شکایت ہے وہ زیادہ تر اسی لحاظ سے ہے کہ وہ ہر قسم کے واقعات، معاملات، کاروبار، معاشرت کے جزئیات کے ادا کرنے پر قادر نہیں، اسی بنا پر اگر اُردو نظم میں کوئی تاریخ کی کتاب لکھنا چاہیں تو نہیں لکھ سکتے۔

واقعہ نگاری کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) واقعہ نگار کسی تاریخی واقعہ کو بے کم و کاست نظم کر دے، اسکے لئے صرف زبان پر قدرت درکار ہے، شاعری کی چنداں ضرورت نہیں۔

(۲) واقعہ اجمالاً معلوم ہے، لیکن واقعہ نگار، واقعہ کے تمام جزئیات اور حالات اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہے، وہ واقعہ کی نوعیت کو دیکھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اس قسم کے موقع پر فطرت کا اقتضا کیا ہے۔ اِن تمام چیزوں کو وہ موجود فرض کر لیتا ہے اور اُن کو ادا کرتا ہے۔

اس قسم کی واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے بالکل بیان واقعی ہو اور تمام واقعات میں اس قسم کا تناسب، ربط اور موزونی ہو کہ کسی واقعہ کی نسبت شک کا احتمال بھی نہ آنے پائے۔ اس قسم کی واقعہ نگاری کے لئے صرف قدرتِ زبان کافی نہیں، بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا درکار ہے۔

مثلاً شاعر احباب کی جدائی کا واقعہ لکھنا چاہتا ہے تو اُس کو اُن تمام جُزئی کیفیتوں پر نظر ہونی چاہیئے جو اس حالت میں پیش آتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس حالت میں ایک دوسرے کو کس حسرت آمیز نگاہ سے دیکھتا ہے؟ کس قسم کی باتیں کرتا ہے؟ کن باتوں سے دل کو تسلی دیتا ہے؟ رخصت کے وقت بے اختیار کیا حرکات صادر ہوتے ہیں؟ آغاز کی کیفیت، کس طرح بتدریج ترقی کرتی جاتی ہے؟ حاضرین پر اُن سے کیا اثر پڑتا ہے؟ پھر جدائی جدائی میں بھی فرق ہے، باپ بیٹے کی جدائی، بھائی بھائی کی جدائی، زن وشو کی جدائی، احباب کی جدائی، اِن میں سے ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات ہیں، اِن مختلف اور کثیر الانواع خصوصیات کا احاطہ کرنا، اور ان کو مؤثر پیرایہ میں ادا کرنا، شاعرانہ واقعہ نگاری ہے۔

اسی طرح لشکرکشی، معرکہ آرائی، فتح و شکست، سفر وحضر، بیماری و موت، قید و بند، دشت نوردی و بادیہ پیمائی، سیکڑوں ہزاروں واقعات ہیں، اور ہر واقعہ کی سیکڑوں جزئیات ہیں، اُن تمام کا احاطہ کرنا، اور اُن کو ہو بہو ادا کرسکنا کمالِ شاعری ہے۔

اُردو زبان میں چونکہ ایک مدت تک بیہودہ مبالغہ اور خیال بندی کی گرم بازاری رہی، اس لئے واقعات کے ادا کرنے کے لئے جو الفاظ، ترکیبیں، اصطلاحات مقرر ہیں، استعمال میں نہیں آئیں۔ اس لئے آج نئے سرے سے اُن کو استعمال کیا جائے تو یا ابتذال یعنی عامیانہ پن، یا غرابت یعنی روکھاپن پیدا ہوجاتا ہے، نظیر اکبر آبادی کے کلام میں جو سوقیانہ پن

ہے، اس کا یہی راز ہے۔ میر حسن نے اپنی مثنوی میں اکثر واقعات کا سماں دکھانا چاہا ہے اور یہ اُن کی صحیح المذاقی کا نتیجہ ہے، لیکن اکثر جگہ ابتذال پیدا ہوگیا ہے۔ ع کپڑے کو کپڑے سے بجاتی چلی، اگر واقعہ نگاری ہے تو شعرا نے اچھا کیا کہ واقعہ نگاری سے الگ رہے۔

واقعہ نگاری جب کمال کے درجہ تک پہونچ جاتی ہے تو اُس کو مرقّع نگاری کہتے ہیں، جس کو آج کل کی زبان میں کسی چیز کا سماں دکھانا، یا سین دکھانا کہتے ہیں۔

میر انیس نے، واقعہ نگاری کو جس کمال کے درجہ تک پہنچایا ہے، اُردو کیا فارسی میں بھی اُس کی نظیریں مشکل سے مل سکتی ہیں، اُن کے کمال کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

(۱) ہر قسم کے واقعات و معاملات و حالات اس کثرت سے نظم کیے ہیں کہ واقعہ نگاری کی کوئی صنف باقی نہیں رہی جو اُن کے کلام میں نہ پائی جاتی ہو۔

(۲) کوئی واقعہ جب سامنے آتا ہے تو عام نگاہیں صرف نمایاں باتوں پر پڑتی ہیں اور اس لیے جب لوگ اُن کو بیان کرنا چاہتے ہیں، تو انھیں نمایاں باتوں کو بیان کرتے ہیں، لیکن ایک دقیق النظر اُن تمام جزئیات پر بھی نظر ڈالتا ہے، اور اُن کو ظاہر کرتا ہے، یہ جزئیات جب ادا کیے جاتے ہیں تو سامعین پر اس طرح کا اثر پڑتا ہے۔ گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی، اس کے علاوہ واقعہ کی پوری تصویر کھینچنے سے دل پر ایک خاص

اثر پڑتا ہے، یہ جزئیات، اکثر شعرا نظر انداز کر جاتے ہیں جس کی وجہ اکثر تو یہ ہوتی ہے کہ اُن پر عام نگاہیں پڑ نہیں سکتیں، اور زیادہ تر یہ کہ ہر شخص اُن کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتا، لیکن میر انیس چونکہ فطرت اور معاشرت انسانی کے بہت بڑے راز داں ہیں، اس لئے دقیق سے دقیق اور چھوٹے سے چھوٹا نکتہ بھی اُن کی نظر سے بچ نہیں سکتا، اس کے ساتھ زبان پر یہ قدرت ہے کہ کہیں اُن کو دقت پیش نہیں آتی۔

مثلاً ایک مقام پر گھوڑے کی تیز روی کو لکھا ہے۔ قاعدہ ہے کہ گھوڑا جب حد سے زیادہ تیز دوڑتا ہے تو اُس کی دونوں کنوتیاں کھڑی ہوکر مل جاتی ہیں، اُس کو بعینہ اس طرح ادا کیا ہے، ع

دونوں کنوتیاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

حضرت عباسؑ جب نہر کے پاس پہنچے ہیں، تو گھوڑا جو کئی دن کا پیاسا تھا، پانی دیکھ کر بیتاب ہو گیا ہے، لیکن حضرت عباسؑ اُس کو پانی پینے سے روکتے ہیں، اس موقع پر واقعہ کی اصلی صورت کھینچنے کے لئے یہ ضرور ہے، کہ اس کشمکش کے موقع پر جو اضطرابی حالت پیش آ سکتی تھی، وہ دکھائی جائے چنانچہ میر انیس کہتے ہیں ؎

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند — دریا کو بہتا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند — چمکارتے تھے، حضرت عباسؑ ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

یا مثلاً حضرت امام حسینؑ کے سامنے اُن کے ترسانے کو جب عمر بن سعد نے پانی منگوا کر پیا ہے، اُس موقع پر کہتے ہیں ۔

ع ظالم نے ڈگڈگا کے پیا سامنے جو آپ،

ڈگڈگا کے پانی پینا، ایک معمولی اور غیر مہتم بالشان واقعہ ہے لیکن ایک تشنہ لب کے ترسانے کے مضمون میں اس کا اظہار حسنِ بلاغت کا ایک بڑا ضروری نکتہ ہے ۔

یا مثلاً ایک موقع پر گھوڑے پر سوار ہونے کی حالت کو لکھا ہے ۔

ع وہ ہاتھ ہٹ کے آپ نے رکھا ایال پر،

گھوڑے سے ذرا ہٹ کر ایال پر ہاتھ رکھنا اور سوار ہونا، سواری کی مخصوص حالت ہے، اس لیے واقعہ کی تصویر کھینچنے کے لئے اس حالت کا دکھانا ضروری ہے ۔

یا مثلاً حضرت شہر بانوؑ جب اپنی بیٹی صغراؑ سے رخصت ہونے لگی ہیں تو اصغرؑ کی طرف سے جو صرف چھ مہینے کے تھے، رخصت کے معمولات ادا کرائے ہیں۔ اس موقع پر اکثر مستورات کا دستور ہے کہ بچّے کا ہاتھ اُس کی پیشانی پر رکھ کر کہتی ہیں کہ دیکھو یہ تمھیں سلام کرتے ہیں، اُس حالت کو بعینہٖ ادا کیا ہے ؎

بانوؑ نے کہا دستِ پسر ماتھے پہ رکھ کر
لو آخری تسلیم بجا لاتے ہیں اصغرؑ

یا مثلاً جوانانِ اہلبیتؑ کی سیر و خوش خرامی کے موقع پر لکھتے

ہیں ؎

زلفیں ہوا میں اُڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

یا مثلاً جب رفقائے امام علیہ السّلام صفِ نماز سے لڑائی کے لئے اُٹھے ہیں، اُس موقع پر لکھتے ہیں ؎

طیار جان دینے پہ چھوٹے بڑے ہوئے
تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے

یا مثلاً حضرت عباسؑ، جب گھوڑا اُڑاتے ہوئے نہر کی طرف گئے ہیں، تو دریا کے نگہبانوں سے جو نشیب میں تھے، اُس وقت آنکھ چار ہو جاتی تھی، جب گھوڑا زیادہ اونچا اُڑ جاتا تھا، اُس حالت کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

برچھیوں اُڑتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے
آنکھ لڑ جاتی تھی، دریا کے نگہبانوں سے

یا مثلاً سکینہؑ جب قید خانہ میں دربانوں سے اپنا حال کہنے گئی ہیں وہاں لکھا ہے ؎

بولا نہ جب کوئی تو ہوا غم زیادہ تر   دیوار پکڑے پکڑے گئی وہ قریب در
پٹ کو ہلا ہلا کے پکاری وہ نوحہ گر   دربانوں اجاگتے ہو کہ سوتے ہو بے خبر
بیکس ہوں، تشنہ لب ہوں، فلک کی ستائی ہوں
کچھ تم سے اپنا حال میں کہنے کو آئی ہوں

دو حریفوں کی معرکہ آرائی کو جہاں مرزا دبیر وغیرہ لکھتے ہیں، صرف
عام طرح پر اوپری اوپری باتیں لکھ دیتے ہیں، یہ مطلق پتہ نہیں چلتا کہ
دونوں نے فنِ جنگ کے کیا کیا ہنر دکھائے، لیکن میر انیس اکثر جگہ
اُن خصوصیات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں، اور یہ اُن کی قدرتِ زبان
کی سب سے بڑی دلیل ہے، مثالیں رزمیہ کے عنوان میں آئیں گی
اب ہم ہر قسم کی واقعہ نگاری کی چند مثالیں درج کرتے ہیں،
ا۔ حضرت امام حسینؑ کا کربلا میں داخلہ، دشمنوں کی روک ٹوک،
رفقائے امامؑ کی برہمی، امام علیہ السّلام کی صلح پسندی اور درگذر وغیرہ
وغیرہ سے

اُترا یہ کہہ کے کشتیِ اُمت کا ناخدا　　جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا　　دیکھو تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا
اکبرؑ شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباسؑ جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہِ سر بلند　　کیوں یہ مقام ہے تمہیں شاید بہت پسند
کی مسکرا کے عرض کہ یا شاہِ ارجمند　　بس ہاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند
ٹھیرا ہیں یہیں رہینگے عنایت جو رب کی ہے
بس کیا کہوں حضور ترائی غضب کی ہے

روتے ہوئے وہاں سے بڑھے آپ چند گام　　گویا زمیں کی سیر کو اُترا مہ تمام
انجم کی طرح گرد تھے حیدر کے لالہ فام　　شکلیں وہ نور کی وہ تجمّل وہ احتشام

زلفیں ہوا میں اڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

تکنے لگے پہاڑوں کو مسلمؑ کے دونوں لال پھولوں سے کھیلنے لگے زینبؑ کے نونہال
سبزے سے واں کے ابن حسنؑ خوش ہوئے کمال کی عرض اس زمیں کا ہر اک گل ہے بے مثال
اے خسروِ زمیں یہ جگہ ہے جلوس کی
خوشبو ہے یاں کی خاک میں عطرِ عروس کی

صحرا سے آئے پھر سوئے دریا شہِ امم الیاس شاد ہو کے پکارے بصد حشم
اچھلیں درود پڑھتی ہوئی مچھلیاں بہم بولے حباب آنکھوں پہ شاہا اترے قدم
پانی میں روشنی ہوئی حسن حضور سے
لے لیں بلائیں پنجۂ مرجاں نے دور سے

ٹھہرے کنارِ نہر جوانان ماہرو دھویا کسی نے رخ کسی نے کیا وضو
گھوڑے جو آئے پیاس بجھانے کنارِ جو بھر لائے اشک آنکھوں میں شبیرؑ نیکخو
کھینچی اک آہ سرد ترائی کو دیکھ کر
ہاتھوں سے دل پکڑ لیا بھائی کو دیکھ کر

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباسؑ نامور خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہِ بحر و بر
ایذا پہنچے ملوں میں بہت اہلِ بیت پر بچے ہیں نازکی میں گلوں سے زیادہ تر
کب سے عماریوں کے ہیں پردے چھٹے ہوئے
گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے رکے ہوئے

کچھ سوچ کر امامِ دو عالم نے یہ کہا زینبؑ جہاں کہیں وہیں خیمہ کر و بپا

پیچھے ہٹے یہ سنتے ہی عباسِؑ باوفا　　جاکر قریب محملِ زینبؑ یہ دی صدا
حاضر ہے جاں نثار امامِ غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا

بولی یہ سن کے دخترِ خاتونِ روزگار　　اس امر میں بھلا مجھے کیا دخل ہیں نثار
خشکی ہو یا ترائی چمن ہو کہ سبزہ زار　　ہر جا مسافروں کا نگہباں ہے کردگار
مختارِ کائنات کے تم نورِ عین ہو
اترو وہاں جہاں مرے بھائی کو چین ہو

آرام کو ترس گئے جب سے چھٹا ہے گھر　　کن آفتوں میں پانچ مہینے ہوئے بسر
یہ آندھیاں یہ گرمی کے ایام یہ سفر　　دن بھر چلے ہیں دھوپ میں جاگے ہیں رات بھر
گرمی سے کھیت خشک تھے جنگل اجاڑ تھا
ایک ایک کوس راہ جبل میں پہاڑ تھا

آج اس زمین پر ہمیں لایا ہے آسماں　　اب دیکھئے دکھاتی ہے تقدیر کیا یہاں
آقا کی خیریت کی دعا مانگو بھائی جاں　　یارب مسافروں کو مبارک ہو یہ مکاں
دشمن بہت ہیں بادشۂ خوش خصال کے
بھائی بہن نثار ذرا دیکھ بھال کے

بھائی سے اس زمیں کی سنی ہو بہت صفت　　ہے وہ امام واقفِ اسرارِ شش جہت
جو جو سخن ہیں ان سے بھی لازم ہے مشورت　　صدقے گئی حبیب سے بھی کر لو مشورت
ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو
بھیّا مجھے یہ ڈر ہے کہ ردّ و بدل نہ ہو

وستِ ادب کو جوڑ کے اُس شیر نے کہا تشویش کچھ نہ کیجیے اے بنتِ مرتضیٰ
ہر چند مصلحت مری کیا اور عقل کیا لیکن ترائی سے کوئی بہتر نہیں ہے جا
جو مہر فاطمہؑ میں ہے یہ وہ فرات ہے
گرمی میں قربِ نہر کا آبِ حیات ہے

حضرت کے حکم کا متردد ہو جاں نثار ارشاد یہ ہوا کہ دیا تم کو اختیار
آیا حضورِ سبطِ پیمبرؐ وہ ذی وقار کی عرض خیمہ نہر پہ کرتا ہے خاکسار
اتریں یہیں یہ مرضیٔ آلِ رسول ہے
بولا وہ بحرِ فیض کہ اچھا قبول ہے

یہ سن کے خادموں کو پکارا وہ مہ جبیں فراش آ کے جلد مصفّا کریں زمیں
حاضر ہوں آپ پاش محل و پرکاہیں یاں ہوگا خیمۂ حرمِ بادشاہِ دیں
جلد اُن کو بھیجو لوگ ہیں جو کاروبار کے
لے آؤ اُشتروں سے قناتیں اُتار کے

بولے زہیرِ قین کہ حاضر ہیں سب غلام بڑھ کر حبیب بھی ہوئے مصروفِ اہتمام
کرسی منگا کے بیٹھ گئے اک طرف امام رتبے میں ہوگئی وہ زمیں عرش احتشام
پرتو فگن تھا نور رسالت مآبؐ کا
سر پہ لگا تھا چتر زری آفتاب کا

تھا فکر میں خموش دو عالم کا تاجدار کھلوا رہے تھے خیموں کو عباسؑ ذی وقار
ناگہ اٹھا شمال کی جانب سے اک غبار رایت سیاہ و سرخ نظر آئے تین چار
مڑ کر کہا حبیب نے کچھ رنگ اور ہے

بولا کوئی یہ شام کے لشکر کا طور ہے

یہ ذکر تھا کہ بن میں سیاہی سی چھا گئی ڈنکے کی دشت ظلم سے کوسوں صدا گئی
گھوڑوں کے دوڑنے سے زمیں تھرتھرا گئی جنگی سپاہ گھاٹ کے نزدیک آ گئی
اک ایک پیل زور تہمتن شکوہ تھا
ابن رکاب سبز قدم سرگروہ تھا

بولے ملازموں سے یہ عباسؑ باوفا دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے ان کا کیا؟
آنے ہی سرکشی یہ طریقہ ہے کون سا؟ کہدو کہ اہل بیت کے خیمہ کی ہے یہ جا
لازم رسول زادیوں کا احترام ہے
اتریں الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے

کرسی نشین ہے لخت دل سید البشرؐ آئین خسروی سے یہ واقف نہیں مگر
آتی ہے اڑ کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد ادھر کیا ہے جو روکتے نہیں باگیں یہ خیرہ سر
بھولے ہوئے ہیں اس پہ کہ ہم خاکسار ہیں
شاید ہوا کے گھوڑوں پہ ظالم سوار ہیں

اس فوج کے رئیس نے بڑھ کر کیا کلام حکم امیر ہے یہیں اتریں سپاہ شام
چھوڑینگے ہم اسے کہ جو راحت کا ہو مقام؟ دریا سے ہٹ کے آپ بپا کیجیے خیام
لشکر کشی ہے بادشہ کائنات پر
کل مورچے سپاہ کے ہوں گے فرات پر

کوفے سے کل جواں ادھر آئے ہیں دس ہزار رستے ہیں شام کے ابھی فوجیں ہیں بیشمار
خالی ہیں منزلیں نہ بیاباں نہ کوہسار شہروں سے پرگنوں سے چلے آتے ہیں سوار

لاکھوں میں کوئی قبل کوئی بعد آئے گا
گیتی ہلے گی جب پسر سعد آئے گا

فوجوں کو جائزہ تھا وہاں ہم چلے تھے جب — گردے ہیں بیس کوس کے لشکر پڑا تھا سب
دستوں کی روم و شام کے آمد ہے روز و شب — اس ارض پر نہ ہو جو سمائی تو کیا عجب
کیجئے مقام گر کوئی گوشہ جدا ملے
ممکن نہیں کہ نہر پہ خیمے کی جا ملے

ہم گھاٹ روکنے کے لئے آئے ہیں ادھر — ہے آج شب کو واحد شمر کی خبر
سنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیر نر — تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضہ پہ کی نظر
کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم شکار سے

غصے میں رکھ کے دوش پہ شمشیر برق دم — نعرہ کیا اسد نے کہ تم سے ہٹیں گے ہم
گر فوج قاہرہ کی ہے آمد تو کیا ہے غم — گرتا ہے کٹ کے سر وہیں جس جا جمے قدم
بپھریں جو شیر سامنے آتا نہیں کوئی
یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی

تم کون ہو حسین ہے مختار خشک و تر — ان کے سوا ہے کون شہنشاہ بحر و بر
دیکھو فساد ہوگا بڑھو گے اگر ادھر — شیروں کا یاں عمل ہے تمہیں کیا نہیں خبر
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہہ دیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

ظالم بگڑ بگڑ کے بڑھے ایک بار سب — بلوہ جو ہو گیا سمٹ آئے سوار سب

نیزے علم کیے ہوئے تھے نیزہ دار سب　　باندھے تھے ایک غول ضلالت شعار سب
لیکن ملا نہ سکتے تھے آنکھ اُس دلیر سے
ایک شور تھا کہ چھین لو دریا کو شیر سے

بگڑے ابو ثمامہ و سعدِ فلک سریر　　تولی زہیر قین نے شمشیر بے نظیر
جوڑا کماں میں ابن مظاہر نے ایک تیر　　بولے اسد کہ جبر کے قابل ہیں یہ شریر
عابس کو غیظ لشکرِ بد خو پہ آگیا
غصّے سے بل ہلال کے ابرو پہ آگیا

اُلٹی جناب قاسم ذیشاں نے آستیں　　قبضے پہ ہاتھ رکھ کے بڑھے اکبر حسین
بولے پکڑ کے نیمچے زینب کے مہ جبیں　　شیروں سے کیا ترائی کو لینگے یہ اہل کیں؟
کہیئے تو نیزہ بازوں کو ہم دیکھ بھال لیں،
تیوری کوئی چڑھائے تو آنکھیں نکال لیں

آگے تھے سب کے حضرت عباس ذی حشم　　بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دمبدم
تیغیں جو تولتے تھے اِدھر بانیِ ستم　　کہتے تھے سر نہ ہوگا بڑھایا اگر قدم
لرزہ تھا رعبِ حق سے ہر اک نابکار کو
روکے تھا ایک شیر جری دس ہزار کو

بڑھتا تھا جھومتا ہوا جب ارم وہ شیر نر　　گرتا تھا کوئی ڈر کے اِدھر اور کوئی اُدھر
تیغیں جو کھنچ گئیں تو ہوا اور شور و شر　　گھبرائے اہل بیت شہنشاہِ بحر و بر
آغوش میں پھوپی کے سکینہ دہل گئی
غل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی

چلّائی رو کے زینبؑ ناشاد و نامراد — ہے ہے خبر تو لو کہ یہ کس سے ہوا فساد
غربت زدوں سے کیا سبب کینہ و عناد — دیکھے کوئی کدھر ہیں شہنشاہِ خوش نہاد
ہمشیر کو نثار امامؑ اُمم کرو
لوگو! دعائیں اکبرؑ مہرو پہ دم کرو

محمل سے منہ نکال کے فضّہ نے یہ کہا — بلوہ کنارِ نہر ہے اے بنتِ مرتضےٰ
نیزے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے ہیں اشقیا — قبضے پہ ہاتھ رکھے ہیں عباسؑ باوفا
کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے یہ غصّہ ہے شیر کو

زینبؑ پکاریں پیٹ کے زانو بصد ملال — ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انھیں جلال
کہدے کوئی کہ اے اسدِ کبریا کے لال — غربت پہ ابن فاطمہؑ کی تم کرو خیال
قربان ہو گئی نہ لڑائی کا نام لو
ہیں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصّے کو تھام لو

یہ بات کہہ کے رونے لگی خواہرِ امام — عباسؑ ادھر غضب میں بڑھے سوئے فوجِ شام
کرسی سے جلد اُٹھ کے پکارے شہِ انام — بھیا ہمارے سر کی قسم روک لو حسام
یکساں ہے برّ و بحر ہماری نگاہ میں
غیظ و غضب کو دخل نہ دو حق کی راہ میں

آؤ تمھیں قسم ہے جناب امیرؑ کی — بگڑو نہ سرکشی پہ سپاہِ شریر کی
ہمراہ بیٹیاں ہیں شہِ قلعہ گیرؑ کی — سب سے جدا ہی چاہئے منزل فقیر کی
کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے

یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے؟

آقا نے دی جو اپنے سر پاک کی قسم　　بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحب کرم
پرتھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم　　چپ ہو گئے قریب جب آئے شہ امم

گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

تیغ و سپر کو پھینک کے بولا وہ نامور　　کہہ دیجئے اُن سے کاٹ کے لیجائیں میرا سر
حکم خدا ہے حکم شہنشاہ بحر و بر　　اب کچھ کہوں زبان سے کیا تاب کیا جگر

میں ہوں غلام آپ کے ادنیٰ غلام کا
آقا مجھے خیال تھا بابا کے نام کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا　　کیوں کانپتے ہو غیظ سے بھائی یہ کیا یہ کیا
لو اب اُٹھا لو تیغ و سپر تم پہ میں فدا　　دریا کو تم تو لے چکے اے میرے مہ لقا

وہ شیر ہو کہ دھاک ہے ساری خدائی میں
دیکھو! کوئی تمھارے سوا ہے ترائی میں

۳۔ حضرت عباس علیہ السّلام جب میدان جنگ میں گئے ہیں۔ تو شمر نے یہ ترغیب دی کہ ناحق آپ اپنی جان کیوں گنواتے ہیں؟ اُدھر سے ٹوٹ کر ہماری طرف آجایئے تو منصب اور جاگیر اور کیا کچھ نہ ملے گا؛ حضرت عباسؑ نے نہایت برہم ہو کر، اُس کی درخواست کو رد کیا، یہ سوال و جواب ہو رہے تھے کہ دشمنوں نے یہ خبر اڑا دی کہ عباسؑ ہماری طرف آ گئے اہل بیت اور خاص کر حضرت عباسؑ کی بیوی پر اُس وقت جو اثر ہوا

اور جو باتیں ہوئیں اُن کو کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

واں شمر و علمدار میں ہوتی تھی یہ تقریر یاں خیمے کی ڈیوڑھی پہ کھڑے تھے شہ دلگیر
خیمے کے قریب آن کے اک ظالم بے پیر چلّا یا کہ لو لوٹ گئے بازوئے شبیرؑ
اس فوج میں فرزند امیر نجف آیا
عباسؑ علمدار ہماری طرف آیا

اکبرؑ سے یہ بولا پسر حیدر صادق کاذب ہیں جفاکار ہیں مفسد ہیں یہ فاسق
یہ بات نہیں رتبۂ عباسؑ کے لائق وہ ہے مرا شیدا مرا یاور مرا عاشق
بھائی سے کنارا کبھی بھائی نہ کرے گا
عباسؑ علی مجھ سے بُرائی نہ کرے گا

ناموس نبیؐ میں کبھی یہ چرچا ہوا اک بار زینبؑ نے کہا یہ تو نہ مانوں گی میں زنہار
کہنے لگی تب زوجۂ عباسؑ علمدار کیا ماجرا ہے بی بیو مجھ سے کرو اظہار
ہے ڈیوڑھی سے اک شور بپا لشکر کیں میں
وارث مرا کیا قید ہوا لشکر کیں میں

سلہ یہاں عجب بلاغت کا اظہار کیا ہے، حضرت عباسؑ کی بیوی لوگوں سے واقعہ کو تحقیق کرنا چاہتی ہیں، لیکن یہ اُن کی زبان سے نہیں نکل سکتا کہ "کیا درحقیقت عباسؑ دشمنوں سے مل گئے" اس لیے انھوں نے اس پیرایہ میں سوال کیا کہ کیا دشمنوں نے اُن کو قید کر لیا، یعنی اگر وہ دشمنوں کے مجمع میں چلے بھی گئے تو قید ہو کر گئے ہوں گے ورنہ یہ امر بالکل ناممکن ہے کہ وہ دشمنوں سے جا کر مل جائیں ۱۲ منہ

بولی یہ سکینہؑ[۲۵] کہ چچی تم سے کہوں کیا — روتے ہیں کمر پکڑے ہوئے ہاتھوں سے بابا
اور کہتے ہیں آپس میں خوشی ہوکے یہ اعدا — عباسؑ ملا ہم سے شہ دیں ہوئے تنہا
اس صدمے سے ننھا سا کلیجہ مرا شق ہے
ہیں پیاس بھی بھولی ہوں یہ عمو کا قلق ہے

چپکے سے سکینہؑ نے کہا جب یہ بصد یاس — غرقِ عرقِ شرم ہوئی زوجۂ عباسؑ
گھبرائی ہوئی خیمے کی ڈیوڑھی کے گئی پاس — پھر سوچ کے کہتی تھی کہ بیجا ہے یہ وسواس
قوت شہ والا کی انھیں سے تو فقط ہے
عباسؑ پھرے شہ سے؟ نہ مانوں گی غلط ہے

بھائی کو وہ پیارے ہیں انھیں بھائی ہے پیارا — عاشق کہیں معشوق سے کرتے ہیں کنارا
یہ ننگ علمدار کو ہوگا نہ گوارا — قسمت ہی الٹ جائے تو اسکا نہیں چارا
لیکن فلک اس طرح سے گرتے نہیں دیکھا
بھائی کو کبھی بھائی سے پھرتے نہیں دیکھا

اس سوچ میں پھرتی تھی سراسیمہ و مضطر — اسکا بھی نہ تھا ہوش کہ کب گر گئی چادر
رخ زرد تھا دل کانپتا تھا سینہ کے اندر — دھڑکا تھا کہ اب کیا کہینگے آن کے سرور
یارب نہ سنوں میں کہ جدا ہو گئے عباسؑ
یہ غل ہو کہ بھائی پہ فدا ہو گئے عباسؑ

---

۲۵ اس بلاغت کو دیکھو کہ اہلِ حرم سے کسی نے اس جھوٹی خبر کا زبان پر لانا بھی نہ چاہا لیکن سکینہؑ بالکل بچی تھیں، اس لئے انھوں نے جو سنا تھا بیان کردیا۔

آخر کہا بیٹے سے کہ واری اِدھر آؤ   باندھو کمر اور جنگ کے ہتھیار لگاؤ
تم شبیر کے فرزند ہو میدان میں جاؤ   بیتاب ہوں اے لال خبر باپ کی لاؤ
تھے پانی کو دریا کے کنارے گئے عباسؑ
دیکھ آؤ تو لڑتے ہیں کہ مارے گئے عباسؑ
غیرت سے ہوئی جاتی ہوں میں بیکس و ناچار   کہتے ہیں عدو پھر گیا بھائی سے علمدارؑ
صدقے گئی کہیو مری جانب سے بتکرار   کیا قہر ہے تم شمر سے کیوں کرتے ہو گفتار
وہ تفرقہ انداز ہے مردودِ خدا ہے
شبیرؑ کے دشمن سے علاقہ تمھیں کیا ہے

۳۳- ابن سعد کربلا میں داخل ہوتا ہے، اور خولی سے حالات دریافت کرتا ہے، خولی ایک ایک چیز کی تفصیل بیان کرتا ہے ؎

یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوئے نشاں   اُمڈا زمیں پہ ظلم کا دریائے بیکراں
موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پشت پیل رواں   لہراتے تھے ہوا سے علم مثلِ بادباں
ہلتا تھا دشت کہیں دُہل اس طرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے
جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دل   خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکّار و اہلِ نار و دغا باز و پُر دغل   شکلیں مہیب دیو سے قد ابروؤں پہ بل
بدخواہ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے
تلواریں کھینچے بڑھ کے جیسے دو طرف سوار   غل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایک بار

ڈنکے کی دمبدم تھی صدا آسماں کے پار "آگے بڑھے چلو" یہ نقیبوں کی تھی پکار

گھوڑوں پہ گرد و پیش رئیسانِ شام تھے

زریں کمر جلو میں کئی سو غلام تھے

اُترا قریب خیمہ فرس سے وہ خیرہ سر سر پر لگایا دوڑ کے خادم نے چترِ زر

پہلے تو اپنی فوج پہ ظالم نے کی نظر بولا کسی سے پھر وہ سوئے نہر دیکھ کر

خیمہ ہے کس طرف کو شۂ خوشخصال کا

دریا پہ تو عمل نہیں زہرؑا کے لال کا

خولی نے تب کہا کہ ہماری طرف ہے نہر آئے تھے یاں اُترنے کی خاطر امامِ دہر

فرماتے تھے یہ نہر تو ہے میری ماں کا مہر ہمنے اُٹھا دیا انھیں لیکن بجبر و قہر

عباسؑ مستعد تھے سبھوں سے لڑائی کو

شبیرؑ پھیر لے گئے سمجھا کے بھائی کو

وہ دھوپ میں ہو خیمۂ زنگاریِ حسینؑ راحت نہ رات کو ہے کوئی دم نہ دن کو چین

پھروں علیؑ کی بیٹیاں روتی ہیں کر کے بین آفت میں مبتلا ہے محمدؐ کا نورِ عین

بچّوں کی مارے پیاس کے حالت عجیب ہے

خیمہ نہ سایہ میں ہے نہ دریا قریب ہے

بولا شقی کہ کتنی ہے فوجِ شہِ اُمم سُنتے تھے واں سپاہِ حسینیؑ کی دھوم ہم

اُس نے کہا حسینؑ کے یاور بہت ہیں کم فاقوں کے مارے دم میں کسی کے نہیں ہے دم

ایسی نہ فوج کچھ ہے نہ ایسے نشان ہیں

ہم نے تو خود گنا ہے بہتّر جوان ہیں

ہے ایک علم یہ قلتِ لشکر کا ہے نشاں　　یہ حال ہے لٹا ہوا جیسے ہو کارواں
اُردو میں جنسِ غم کے سوا جنس ہو گراں　　غلّہ کی یہ کمی ہے کہ ہے قحطِ آب و ناں
اسوار بھی قلیل پیادے بھی تھوڑے ہیں
کل سترہ تو اونٹ ہیں اور بیس گھوڑے ہیں

مطبخ ہے سرد آگ کا آسمیں نہیں ہے نام　　بچے ہوائے گرم سے بیتاب ہیں تمام
خاک آبدار خانے میں اڑتی ہے صبح و شام　　کیونکر لڑینگے بیکس و مظلوم و تشنہ کام
یاں سیکڑوں کمانیں ہاں فوج اسیر میں
دو دو گرینگے خاک پہ ایک ایک تیر میں

یہ سب غلط تھا کہ ہے لشکرِ کثیر　　کچھ نوجواں ہیں طفل ہیں کچھ اور کچھ ہیں پیر
ہیں ان میں سات آٹھ تو لڑکے کئی صغیر　　پس جائینگے وہ ٹاپوں سے ہنگام دار و گیر
کیا چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طاقت دکھائینگے
ان سے تو نیمچے بھی سنبھالے نہ جائینگے

کیا جانے دل میں سوچے تھے کیا شاہِ کربلا　　مقتل میں کھینچکر انھیں لے آئی ہے قضا
لشکر تو یہ قلیل اور اس فوج سے وغا　　عمریں ہیں چھوٹی چھوٹی بھلا وہ لڑینگے کیا
کچھ آزمودہ کار نہیں کچھ مُسن نہیں
ان کے ابھی تو گھر سے نکلنے کے دن نہیں

ہمشکل مصطفےٰ کو تو اٹھارواں ہے سال　　تیرہ برس کا ہے ابھی شبّر کا نونہال
نو دس برس کے ہونگے زینبؑ کے دو نو لال　　ہاں اک جواں ہیں حضرت عباسؑ خوشخصال
چھوٹے ہیں اور سب کوئی ان میں جواں نہیں

خط اک طرف مسیں بھی کسی کی عیاں نہیں

سُنتا ہوں اس میں ہیں دو پسر شاہ نامدار — بیمار اُن میں ایک ہے اور ایک شیر خوار
زینبؑ کے دو ہیں تین حسنؑ کے ہیں گلعذار — دس ہیں عقیلؑ و مسلمؑ و حیدرؑ کے یادگار
زہراؑ کے جان و دل ہیں محمدؐ کے پیارے ہیں
یہ لشکرہ تو چاند ہیں باقی ستارے ہیں

بتیس سب سوار شہ دیں کے پاس ہیں — اب رہ گئے پیادے سو دو کم پچاس ہیں
آفت میں مبتلا ہیں مگر با حواس ہیں — غازی ہیں سرفروش ہیں اور حق شناس ہیں
کھانے کا ہے خیال نہ پانی کی فکر ہے
سجدے ہیں اور دعائیں ہیں اور حق کا ذکر ہے

بولا وہ تب کہ ہونگے جواں یاں کے کئے ہزار — خولی نے کی یہ عرض کہ ممکن نہیں شمار
ہیں تین چار کوس کے گردے ہیں سب سوار — اک اک جواں ہے رستمِ میدانِ کارزار
کیا کوئی لڑ سکے گا قیامت کی فوج ہے
لشکر کی ہیں صفیں کہ سمندر کی موج ہے

پیدل ہیں اک طرف تو رسالے ہیں اک طرف — خنجر ہیں ایک سمت تو بھالے ہیں اک طرف
جانباز ہاتھ قبضوں پہ ڈالے ہیں اک طرف — اور دس ہزار برچھیوں والے ہیں اک طرف
سب لوگ فکر قتلِ شہنشاہِ دیں میں ہیں
کھینچے ہوئے کمانوں کو سرکش کمیں میں ہیں

ہاتھوں میں پہلوانوں کے ہیں گرزِ گاوسر — ضربت سے جنکے ٹوٹتی ہے کوہ کی کمر
ہر جا کھچی ہوئی ہیں کمندیں ادھر ادھر — کالی گھٹا سی چھائی ہے ڈھالوں کی نہر پہ

سب لوگ جا بجا پئے قتل و ستیز ہیں
تیغیں بھی ہیں آبی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

بھالا ہلا کے کوئی یہ کہتا ہے بار بار   نوک اسکی سینۂ علی اکبرؑ کے ہوگی پار
کہتا ہے کس غرور سے اک شام کا سوار   آئے تو رن میں حضرت شبیرؑ کا یادگار
اب کوئی دم میں گھر کے حسنؑ کی صفائی ہے
تلوار آج زہر میں میں نے بجھائی ہے

۴۔ فوج آراستہ ہو رہی ہے، اور علم لا کر رکھا گیا ہے۔ عون و محمد جو امام علیہ السّلام کے بھانجے اور حضرت زینبؑ کے صاحبزادے ہیں علم کے استحقاق کے دعویدار ہیں اور چاہتے ہیں کہ امام علیہ السّلام سے اس منصب کی درخواست کریں۔ اُس وقت کی گفتگو، حضرت زینبؑ کی آزردگی، اور فہمایش اور دیگر واقعات۔

زینبؑ کے پسر مشورہ کرتے تھے یہ باہم   کیوں بھائی علم لینے کو ماموں سے کہیں ہم!
تائید خدا چاہیئے گو عمر میں ہیں کم   عہدہ تو ہمارا ہے یہ آگاہ ہے عالم
واقف ہیں سبھی حیدر و جعفرؑ کے شرف سے
حق پوچھو تو حقدار ہیں ہم دونوں طرف سے

دادا بھی علمدار رہے نانا بھی علمدار   ہم اپنے بزرگوں کے ہیں منصب کے طلبگار
کہتا تھا بڑا عرض کا موقع نہیں زنہار   ہیں بادشہ کون و مکاں مالک و مختار
عہدہ تو بڑا یہ ہے کہ ماموں پہ فدا ہوں
چپکے رہو اماں نہ کہیں سن کے خفا ہوں

مطلب نہ علم سے نہ حشم سے ہمیں کچھ کام　　مٹ جائیں نشاں بس یہی عہدہ یہی نام
یہ سر ہوں نثارِ قدمِ شاہِ خوش انجام　　عزت رہے بھائی یہ دعا ہے سحر و شام
آقا جسے چاہیں علمِ فوجِ خدا دیں
مشتاقِ اجل ہیں ہمیں مرنے کی رضا دیں

روتی تھی جو پردے کے قریں زینبِ دلگیر　　سب اس نے مفصل یہ سنی بیٹوں کی تقریر
غصّہ سے یہ کہنے لگی وہ صاحبِ توقیر　　دونوں کو اشارے سے بلانے کی تدبیر
کچھ کہتا ہے سن لیں اسے فرصت انھیں گر ہو
عباسؑ نہ دیکھیں نہ شہِ دیں کو خبر ہو

یہ کہتی تھی زینبؑ کہ خود آئے وہ نکوکار　　چھوٹے سے یہ فرمانے لگیں زینبِ ناچار
کیا باتیں ابھی بھائی سے تھیں اے مرے دلدار　　اس وقت میں ہو کون سے منصب کے طلبگار
سمجھے نہ کہ مادر عقبِ پردہ کھڑی ہے
گھر لٹتا ہے میرا تمھیں منصب کی پڑی ہے

اللہ بڑا عزم کیا باندھ کے تلوار　　بچو تمھیں ایسا نہ سمجھتی تھی میں زنہار
دیکھو ابھی تم دونوں سے ہو جاؤں گی بیزار　　کچھ کہیو نہ ماموں سے خبردار خبردار
کیا دخل تمھیں امر میں سلطانِ اُمم کے
دیکھوں گی نہ پھر منہ جو گئے پاس علم کے

کچھ اور ہی تیور ہیں علم نکلا ہے جب سے　　تم کون ہو جو آگے بڑھے جاتے ہو سب سے
استادہ ہو جا کر عقبِ شاہ ادب سے　　عہدہ ہے یہ جس کا مجھے معلوم ہے شب سے
اس امر میں خاطر نہ کریں اور کسی کی

میں خوش ہوں بجا لائیں وصیت کو علیؑ کی

مانا کہ پہونچتا ہے تمہیں منصبِ جعفرؑ — آقا کی غلامی سے ہے عہدہ کوئی بڑھ کر
چھوٹا مرا بھائی بھی ہے بیٹوں کے برابر — عاشق کا تو عاشق ہے برادر کا برادر
بگڑوں گی گلہ گر کسی اسلوب کرو گے
عباسؑ سے کیا تم مجھے محجوب کرو گے

زینبؑ نے عتابانہ جو کی اُن سے یہ گفتار — یوں کہنے لگے جوڑ کے ہاتھوں کو وہ دلدار
شاہوں سے غلاموں نے بھی کی ہو کبھی تکرار — مالک ہیں جسے چاہیں علم دیں شہِ ابرار
رخصت کے لئے تیغ و سپر باندھے ہوئے ہیں
ہم صبح سے مرنے پہ کمر باندھے ہوئے ہیں

زینبؑ نے کہا لیکے بلائیں کہ سدھارو — بس اب مرا دل شاد ہوا اے مرے پیارو
ماں صدقے گئی سر قدمِ شاہ پہ وارو — ہو عید مجھے گر عمر و شمر کو مارو
یہ وقت ہے امدادِ امامِ ازلی کا
دے چھوٹے سے ہاتھوں میں خدا زور علیؑ کا

۵۔ حضرت علی اکبرؑ میدانِ جنگ میں جانے کے لئے پھوپی اور اماں سے اجازت طلب کرتے ہیں، اُن دونوں کا اضطراب۔ اور سوال و جواب ؎

خیمے میں آئے روتے ہوئے اکبرؑ حزیں — چھاتی لگایا ماں نے پھوپی نے بلائیں لیں
اک آہ سرد بھر کے یہ بولا وہ مہ جبیں — نرغے میں ظالموں کے اکیلے ہیں شاہِ دیں
روتے ہیں غیر سیّدِ والا کے حال پر

آماں مقام رحم ہے بابا کے حال پر

اعدا کا ظلم بھائی کا غم تین دن کی پیاس بازو شکستہ ضعفِ بصارت ہجومِ یاس
اب میں ہوں اور کوئی نہیں شاہِ دیں کے پاس اس پر بھی اضطراب نہیں کچھ رہے حواس
گھیرے ہیں سب امامِ غریب الدیار کو
تنہا کھڑے ہیں تولے ہوئے ذوالفقار کو

تنہا کہاں امام کہاں وہ ہجومِ عام میں یاں ہوں اب تو اور بڑھی ہوگی فوجِ شام
فریاد ہے کوئی نہیں آتا ہمارے کام مٹتا ہے صفحۂ دو جہاں سے پدر کا نام
مظلوم باپ آنکھوں کے آگے ہلاک ہو
بیٹا جوان ہم سا نہ پیوندِ خاک ہو

تقدیر نے کیا نہ شہادت سے بہرہ یاب اچھا مریں گے بعد شہِ آسماں جناب
ہم بھی نہیں اگر نہیں فرزندِ بوتراب ذرہ کہاں ہے غروب ہوا جب کہ آفتاب
دنیا کا نور نیرِ اعظم کے ساتھ ہے
اپنی تو زندگی شہِ عالم کے ساتھ ہے

مجھکو تو آرزو ہے کہ سر کو فدا کروں راہِ خدا میں فوج سے تنہا وغا کروں
سر سے حقوقِ والد ماجد ادا کروں مالک مرے اگر نہ رضا دیں تو کیا کروں
واں اقتلوا[1] الحسینؑ کا اعدا میں شور ہے
پر کچھ ہمارا پالنے والوں سے زور ہے

تم دونوں صاحبوں سے مرے اب ہیں دو سوال اول تو یہ کہ دیجے مجھے رخصتِ جدال

---

[1] یعنی قتل کرو تم سب حسین کو ۱۲

رکھ لیجے آبروے پسر بہرِ ذوالجلال   آگے مرے شہید نہ ہو فاطمہؑ کا لال
للہ ہاتھ اُٹھائیے اب نورِ عین سے
اماں ہمیں عزیز نہ کیجے حسینؑ سے

ہے دوسری یہ عرض جو رخصت نہیں قبول   جلدی ہو کربلا سے روانہ بہ دلِ ملول
یثرب سے کیا علاقہ ہے بطحا سے کیا حصول   نہ جائینگے نجف نہ سوئے روضۂ رسولؐ
جنگل کی راہ لینگے گریباں کو پھاڑ کے
کافی ہیں منہ چھپانے کو دامن پہاڑ کے

پوچھیں جو دوستانِ مدینہ مری خبر   کہدیجئے نہ آئینگے اب وہ کبھی اِدھر
صدقے امامِ دیں پہ ہوئے سارے نامور   کچھ اُن سے ہو سکی نہ مددگاریِ پسر
بستی بسا کے رن میں شہِ کربلا رہے
کنبہ سے منہ چھپا کے وہ جنگل میں جا رہے

رونے لگا یہ کہکے جو وہ چودھویں کا ماہ   بنتِ علیؑ کی آنکھوں میں دنیا ہوئی سیاہ
بھاوج کے منہ پہ یاس سے زینبؑ نے کی نگاہ   گردن ہلا کے ماں نے بھری ایک سرد آہ
بنتِ علیؑ تو خاک پہ تھرا کے گر پڑی
بانوؑ پسر کے پاؤں پہ غش کھا کے گر پڑی

ماں کو اُٹھا کے خاک سے رونے لگا پسر   بیٹے کے گرد پھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر
مجھ کو بھی لے لو ساتھ جو منظور ہے سفر   زینبؑ پکاریں چھوڑ کے ہمکو چلے کدھر
اچھا رضا حسینؑ سے لے لو تو جائیو
کاندھا مرے جنازے کو دے لو تو جائیو

اک دن وہ تھا کہ سوتے تھے چھاتی پہ رات بھر
کرتہ وہ پہنے دوڑتے پھرنا اِدھر اُدھر
یاد آتی ہیں وہ ہنسلیاں وہ کان کے گُہر
یا آج تیغ ہاتھ میں ہے دوش پر سپر
غازی ہو صف شکن ہو سعادت نشان ہو
کیا کام ہم سے نامِ خدا اب جوان ہو

دادا کا مرتبہ تمھیں دے ربِّ ذوالجلال
قائم تمھارے سر پہ رہے فاطمہؑ کا لال
قابل ہو رحم کرنے کے واری ہمارا حال
بچپن کی دائیوں کا بھی رکھیے ذرا خیال
کس سے ہو پھر اُمید اگر تم سے یاس ہو
اب تو تمھیں ہمارے بڑھاپے کی آس ہو

قوت تمھیں ہو دل کی تمھیں پارۂ جگر
یہ بھی خبر نہیں مجھے کب مر گئے پسر
لاشیں کبھی گھر میں آئیں تو بیٹا نہیں ہے گھر
میں کہتی تھی جیے یہ مرا غیرتِ قمر
اکبر تو ہے اگر مرے پیارے نہیں نہیں
روشن ہے گھر میں چاند ستارے نہیں نہیں

باتیں یہ کہہ کے منہ پہ لیا گوشۂ ردا
سر جیب سے پٹک کے کہا وا محمدا
بس گر پڑا پھوپی کے قدم پر وہ مہ لقا
کی عرض رو کے اے پھوپی اماں کروں میں کیا
میں بے وفا نہیں ہوں یہ روشن ہے آپ پر
نرغہ ہے فوج کا مرے مظلوم باپ پر

منہ سے ہٹائیے تو ردا بہرِ کردگار
اچھا نہ جائینگے سوئے میدان کارزار
چادر ہٹا کے منہ سے یہ بولی وہ دلفگار
میں کون ہوں صدقے جاؤں تمھیں کو ہے اختیار
اصغرؑ ہو یا کہ تم ہو مجھے سب سے پاس ہے

رخصت گلا کٹانے کی دو ماں تو پاس ہے

اکبرؑ نے ماں کے چہرۂ اقدس پہ کی نظر — ماں نے کیا اشارہ کہ اے غیرتِ قمر
تم سے پھوپھی خفا ہیں جھکا دو قدم پہ سر — قربان جاؤں عذر کرو ہاتھ باندھ کر
سر کی نہ کچھ خبر ہے نہ چادر کا ہوش ہے
واری یہ پالنے کی محبت کا جوش ہے

جلدی سے ہاتھ جوڑ کے بولا وہ لالہ فام — تقصیر عفو کیجئے اے خواہرِ امام
بس اب زباں سے کچھ نہیں کہنے کا یہ غلام — میری تو ماں ہیں آپ مجھے کیا کسی سے کام
بندے پہ کی ہے ماں نے یہ شفقت نہ باپ نے
راتوں کو جاگ کر مجھے پالا ہے آپ نے

اکبرؑ نے یہ کلام کئے جب بصد ادب — الفت کا جوش آگیا زینبؑ علیؑ کو تب
لیکر بلائیں چہرے کی بولی وہ تشنہ لب — گریاں ہوئے ہو کس لئے میں تمہیں روکتی ہوں کب
سچ ہے جہاں میں تم سا کوئی باوفا نہیں
واری تمہارے سر کی قسم میں خفا نہیں

کیوں کانپتے ہو اشک ہیں آنکھوں سے کیوں رواں — تم راست گو ہو سچ ہے تمہارا یہ سب بیاں
لو میں نے دی رضا تمہیں اے میرے نوجواں — تم جاؤ آگے صدقے گئی اور تمہاری ماں
یوں تو تمام گھر کو محبت ہے آپ سے
کچھ ماں کا حق بھی کم نہیں ہوتا ہے باپ سے

آنکھیں بچھائیں ماں نے جو تم گھٹنیوں چلے — تلوؤں سے اُس نے دیدۂ حق بیں سدا ملے
نازوں سے منتوں سے مرادوں سے تم پلے — صدقے ہوئی کبھی تو لگایا کبھی گلے

مادر نے اپنی عمر مصیبت میں کھوئی ہے

برسوں سے بی بی ایک ہی کروٹ سے سوئی ہے

بانوؑ نے ہاتھ جوڑ کے زینبؑ سے یہ کہا　　صدقے گئی کنیز کی خدمت کا ذکر کیا

اس قافلہ میں آپ ہیں اب فاطمہؑ کی جا　　ہم نے بھی دی جو آپ نے بیٹے کو دی رضا

صدقے ہے یہ بھی صورت پروانہ آپ پر

پر کیا کرے کہ آج مصیبت ہے باپ پر

یہ ذکر تھا کہ آئے شہنشاہ بحر و بر　　لے لیں بلائیں بھائی کی زینبؑ نے دوڑ کر

بانوؑ بھی روئی شہ کے قدم پر جھکا کے سر　　بولی لپٹ کے بالی سکینہؑ کہ اے پدر

سنتی تھی میں کہ رن سے علمدار آتے ہیں

لو اب تو گھر سے نہر پہ بھیا بھی جاتے ہیں

بانوؑ کے منہ کو دیکھ کے حضرتؑ نے یہ کہا　　کیوں سچ ہے تم نے بیٹے کو مرنے کی دی رضا

وہ چپ ہوئی تو بولے بہن سے شہ ہدا　　کہئے پھوپھی بھتیجوں میں کیا فیصلہ ہوا

راہیں سب اُن کے روکنے کی بند ہو گئیں

سنتا ہوں میں کہ تم بھی رضامند ہو گئیں

ہاتھوں کو جوڑ کر علی اکبرؑ نے عرض کی　　اماں نے بھی رضا ہمیں دی اور پھوپھی نے بھی

زہراؑ کی وہ بہو ہیں تو یہ دختر علیؑ　　آقا سوال رد نہیں کرتے کبھی سخی

رویا جو میں تو ماں نے گلے سے لگا لیا

مرنے کا اذن دے کے پھوپھی نے جلا لیا

ماں نے کہا پسر کی فصاحت تو دیکھئے　　نام خدا زبان کی طلاقت تو دیکھئے

زینبؑ یہ بولیں بہن کی جودت تو دیکھئے — ہر بات میں ثبوتِ اجازت تو دیکھئے
کیا بات بھائی ان کی بھلا بول چال کی
گویا زباں ہے مصحفِ ناطق کے لال کی

رومال رکھ کے آنکھوں پہ بولے امامؑ دیں — تم دوگی رخصت اُن کو مجھے یہ نہ تھا یقیں
سچ ہے اجل سے کچھ کسی انساں کا بس نہیں — آیا تھا اتنی عمر ہی لے کر یہ مہ جبیں
بیجا ہے روکنا جو یہ طالب رضا کے ہیں
اے بنتِ فاطمہؑ یہ کرشمے قضا کے ہیں

۷۔ عونؑ اور محمدؑ زخمی ہو کر قریب المرگ ہیں، حضرت علی اکبرؑ اُن کی لاش اُٹھانے کے لیے جانا چاہتے ہیں، حضرت زینبؑ (عونؑ و محمدؑ کی ماں) اُن کو روکتی ہیں، لاشیں گھر میں آتی ہیں، حضرت زینبؑ لوگوں کو رونے سے منع کرتی ہیں، لیکن آخر ضبط نہیں ہو سکتا، اور خود بین کرتی ہیں ؎

گھبرا کے درِ خیمہ سے زینبؑ یہ پکاری — سر ننگے میں نکلوں گی جو تم جاؤ گے واری
اولاد مجھے تم سے زیادہ نہیں پیاری — نہلاؤ تو میں اُنکی ہوں عاشق کہ تمھاری
میداں کی طرف قاسمؑ بے پر بھی نہ جائیں
تلواروں میں عباسؑ دلاور بھی نہ جائیں

بیٹوں سے ہوئی گر تو ہوئی آج جدائی — سر پر مرے دنیا میں سلامت رہیں بھائی
اک دولتِ اولاد لٹائی تو لٹائی — کیا لُٹ گیا وہ کون سی ایسی تھی کمائی
کیوں روؤں میں دنیا میں جو دلبند نہیں ہیں

کیا اکبر و اصغر مرے فرزند نہیں ہیں

یہ ذکر ابھی تھا کہ ستمگار پکارے — لو شاہ کی ہمشیر کے بیٹے گئے مارے
ٹکڑے کیا معصوموں کو تلواروں کے مارے — وہ لوٹتے ہیں خاک پہ دو عرش کے تارے
پامالی کو ان دونوں کے اسوار بڑھیں گے
نیزوں کے سر اب کٹ کے نشانوں پہ چڑھیں گے

یہ سنتے ہی تھرانے لگے حضرت عباس — گھبرا کے اٹھے خاک سے شبیر بصد یاس
سر کھولے نکل آئیں بہنیں پھوپھی کے جو تھیں پاس — سب نے کہا تو شہ کی بہن ہو گئی بے آس
لوٹا ہے فلک بیت شہنشاہ نجف پر
زینب کو چلو لے کے بس اب بانی صف پر

ہے ہے یہ کہا جو اک شور ہوا گھر میں بپا — زینب بھی اٹھی چھوڑ کے دروازے کا پردا
چلائی ارے چپکے رہو غل ہے یہ کیسا — بھائی ہیں سلامت مجھے کیوں دیتے ہو پرسا
ہے ہے نہ کرو جا کے جو گھبرائیں گے شبیر
پھر کون ہے زینب کا جو مر جائیں گے شبیر

باتیں یہ کہیں سب سے پھٹا ماں کا دل زار — تڑپا جو کلیجہ کہ گری خاک پہ اک بار
واں لاشوں پہ روتے ہوئے پہنچے شہ ابرار — مہماں کوئی ساعت کے ملے وہ جگر افگار
کس عمر میں ہستی کا چمن چھوڑ رہے تھے
گودی کے پلے خاک پہ دم توڑ رہے تھے

رخ زرد تھے اور خاک میں آلودہ تھے گیسو — جھک آئے تھے کٹ کٹ کے سر نو سے وہ ابرو
تلواروں سے ٹکڑے تھے وہ بلور سے بازو — مہتاب سی وہ چھاتیاں اور سینہ سے پہلو

پھُکتا تھا جگر آنکھ نہ کھُل سکتی تھی غش سے
ہونٹوں پہ زبانیں نکل آئی تھیں عطش سے

ٹکڑے ہوا سینہ میں دلِ سبطِ پیمبرؐ ہے ہے کہا اور لاشوں سے لپٹے شہ صفدر
چھوٹے سے بڑے نے یہ کہا ہوش میں آ کر بالیں پہ حضور آئے ہیں چونکو تو برادر
مشتاق تھے تم سیدِ ذیجاہ کو دیکھو
مرتے ہوئے دیدارِ شہنشاہ کو دیکھو

سُن کر یہ صدا غش سے چونکا دلِ افگار دونوں نے رکھا سر قدمِ شاہ پہ اک بار
اکبرؑ سے یہ کی عرض کہ اے شاہ کی دلدار دشمن ہیں بہت قبلۂ عالم سے خبردار
ہم دونوں غلاموں کا نہ غم کھائیو بھائی
سر پیٹیں جو اماں انھیں سمجھائیو بھائی

حضرت کے جو رونے کی صدا خیمہ میں آئی رانڈوں نے اُدھر ماتمی صف گھر میں بچھائی
زینبؑ نے کہا ہائے غضب روتے ہیں بھائی فضہ یہ پکاری کہ دُہائی ہے دہائی
لو چاک گریباں کئے آتے ہیں شبیرؑ
معصوموں کی لاشوں کو لئے آتے ہیں شبیرؑ

بیٹھی صفِ ماتم پہ اِدھر شاہ کی خواہر سیدانیوں نے اُٹھ کے اُدھر کھول دیئے سر
لاشوں کو لئے آئے جو گھر میں شہِ صفدر زینبؑ کے قریں بیٹھ گئے سر کو جھکا کر
فرمایا کہ لو لختِ جگر آئے تمھارے
لو دودھ انھیں بخشو پسر آئے تمھارے

دیکھا جو لہو بچوں کا چھاتی اُمنڈ آئی نزدیک تھا مر جائے ید اللہ کی جائی

ہر فاطمہ کے صبر کی شان اُسنے دکھائی   سب سے یہ کہا نیک لگی میری کمائی
بچے مرے قرباں ہوئے احسان خدا کا
اے بیبیو صدقہ ہے یہ شاہِ شہدا کا

رو کر شہ والا نے کہا صدقے میں تم پر   دم بھر انھیں رو لو یہ مہماں ہیں خواہر
بانو نے اشارا کیا اے سبطِ پیمبرؐ   قربان گئی آپ بس اب جایئے باہر
گر ضبط اسی طرح سے فرمائیں گی زینبؑ
یہ ماتم اولاد ہے مرجائیں گی زینبؑ

روتے ہوئے خیمہ سے جو ڈیوڑھی پہ گئے شاہ   فرزندوں کو چلّانے لگی زینبِؑ ناشاد
یہ نیند ہے کیسی کہ خبر تم کو نہیں آہ   صدقے گئی جاؤ شہ کونین کے ہمراہ
زخمی ہوئے شبیرؑ تو جاں اپنی میں دوں گی
اچھا میں تمھیں دونوں سے ماں جائے کو لونگی

لو بیچے کاندھوں پہ دھروائے مرے پیارو   نکلتے ہوئے شبیرؑ کے ہمراہ سدھارو
گو پیاسے ہو دو دن کے یہ ہمت کو نہ ہارو   یہ خون میں ڈوبے ہوئے کپڑے تو اتارو
اٹھ بیٹھو میں صدقے گئی اتنا نہیں سوتے
اس طرح تو بیاہے گئے ہوئے دولہا نہیں سوتے

سوتا ہے لڑائی کے دن ایسا کوئی غافل   بچو تمھیں کیا سن کے کہینگے شہ عادل
دیکھو کہ تڑپتی ہے یہ ماں صورتِ بسمل   سلجھاؤ یہ زلفیں کہ اُلجھتا ہے مرا دل
کیا غش لیے ہیں ہو یہ سونے کا نقشا نہیں ہوتا

لہ یہ اشعار جذبات کے عنوان میں بھی داخل ہو سکتے ہیں۔

ایسا تو کوئی نیند کا ماتا نہیں سوتا

مثال ۱۸۔ شیریں کو خبر ہوئی ہے کہ امام حسین علیہ السلام مع تمام خاندان کے اُس کے گھر تشریف لاتے ہیں، اور وہ مہمانی کا سامان کرتی ہے اور اپنے عزیزوں کو خوشخبری دیتی ہے۔

یہ کہہ کے اُس نے فرش کیا گھر میں سر بسر — مومن کے دل کی طرح مصفا ہوا وہ گھر
مسند بچھائی بہر شہنشاہ بحر و بر — تکیوں کو صاف کرکے لگایا اِدھر اُدھر
کہتی تھی میرے گھر میں ابھی جلوۂ نور ہے
یہ آمد امام زمن کا ظہور ہے

دالان ہے یہ شاہ کی خواہر کے واسطے — یہ نرم فرش ہے علی اکبر کے واسطے
جھولے کی جا یہ ہے علی اصغر کے واسطے — یہ گھر ہے شاہ دیں کے برادر کے واسطے
راحت سے شہ نشین پہ امام زمن رہیں
حجرہ یہ اس لئے ہے کہ دولہا دلہن رہیں

کرسی کو لاکے جلد کسی جا بچھاتی تھی — تختوں کو کشتیوں میں کبھی وہ لگاتی تھی
سجدے میں بہر شکر کبھی سر جھکاتی تھی — گھبرا کے صحن سے کبھی ڈیوڑھی پہ جاتی تھی
چہرے پہ اک خوشی تھی پہ دل بے قرار تھا
فرزند فاطمہ کا اسے انتظار تھا

جا کر کبھی خواصوں سے کرتی تھی یہ کلام — کہنا پکار کے جا کر کہ آتے ہیں اب امام
سمجھ کے آب سرد کے رکھ دو ہوا میں جام — لبریز آب گرم سے کر دو سبو تمام
پردیسیوں کو خیر سے جب گھر میں لاؤں گی

ہاتھوں سے اپنے پاؤں سبھوں کے دھلاؤنگی

ہمسائیوں سے کہتی تھی ہنس ہنس کے باربار — اب کیجیو زیارت سلطان نامدار
ہے باغِ فاطمہؑ پہ عجب حسن کی بہار — رشکِ ریاضِ خلد ہے ایک ایک گلعذار
سب نونہالِ گلشنِ دیں لاجواب ہیں
قد سرو باغِ حسن ہیں رُخ آفتاب ہیں

شمشادِ بوستانِ پیمبرؐ کو دیکھیو — سروِ ریاضِ حضرتِ شبیرؑ کو دیکھیو
کیا نوجواں ہیں شہ کے برادر کو دیکھیو — سب ایک سمت تم علی اکبرؑ کو دیکھیو
ہوگا کبھی یہ حسن ملک کا نہ حور کا
جلوہ ہے اس جری میں محمدؐ کے نور کا

خالق رکھے اسے صد و سی سال برقرار — نامِ خدا ہے شادی کے قابل وہ گلعذار
بہنیں فدا ہیں باپ تصدق ہے ماں نثار — سر پہ پھوپی نے پیارے گیسو رکھے ہیں چار
چہرے کے آگے نیّرِ تاباں بھی ماند ہے
عالم کی روشنی ہے اندھیرے کا چاند ہے

اب خیریت سے گذریگا اٹھارواں جو سال — شادی کرینگی بیٹے کی بانوئے خوشخصال
زینبؑ کو اسکے بیاہ کا ارمان ہے کمال — ہر دم یہی دعا ہے کہ دولہا بنے یہ لال
آتی ہیں نسبتیں حلب و شام و روم سے
شادی خدا جو چاہے تو ہوویگی دھوم سے

جب ڈھل گئی اسے انھیں باتوں میں دوپہر — شوہر سے پھر یہ کہنے لگی وہ نکوسیر
اب تک نہ آئے گھر میں شہنشاہ بحر و بر — اترے کہاں کسی نے مفصل سنی خبر

بستی سے ساتھ لے کے ہر اک اپنے بھائی کو
جا پیشوائے خلق کی تو پیشوائی کو

کہیو مری طرف سے یہ تو چوم کر قدم   لونڈی کو سرفراز کرو بادشاہِ اُمم
کرتے ہیں اغنیا غربا پر سوا کرم   اب بے حضور چین نہیں مجھکو ایک دم
کچھ آج ہے تپش سی دلِ بے قرار میں
آنکھیں سپید ہو گئی ہیں انتظار میں

قربان ہو گئی مرا گھر کچھ نہیں ہے دور   خاصہ تمنا ول آن کے اس جا کریں حضور
ہملوگ مشت خاک ہیں حضرت خدا کے نور   ہوگا یہ کوہ آپ کے آنے سے رشکِ طور
کہنا حضور راہِ ہدایت کی شمع ہیں
پروانے یاں سحر سے زیارت کو جمع ہیں

عرصہ ابھی ہے آپ کے آنے میں کچھ اگر   آنے میں کیوں حرم کے ہوئی دیر اسقدر
ڈیوڑھی پہ بندوبست ہے بادشاہِ بحر و بر   گڑوا رکھی ہیں میں نے قناتیں ادھر ادھر
محمل میں گھٹتی ہوونگی زہراؑ کی پیاریاں
عباسؑ لے کے آئیں زنانی سواریاں

رزمیہ

رزمیہ شاعری اگرچہ واقعہ نگاری ہی کی ایک قسم ہے، لیکن وسعت اور اہمیت کے لحاظ سے اس کے لئے بھی جداگانہ عنوان درکار ہے۔

اردو بلکہ عربی میں بھی رزمیہ شاعری کو چنداں ترقی نہیں ہوئی، عربی میں مثنوی سرے سے مفقود ہے، اور مسلسل واقعات مثنوی کے سوا اور کسی صنف میں ادا ہی نہیں ہو سکتے، شعرائے جاہلیت لڑائی کے جستہ جستہ واقعات، قصائد میں ادا کر لیا کرتے تھے، لیکن اس تمام شاعری میں، کوئی مسلسل رزمیہ نظم ۵۰ شعروں کی بھی نہیں مل سکتی۔

فارسی میں شاہنامہ اور سکندر نامہ کو الگ کر لیا جائے، تو کچھ باقی نہیں رہتا، لیکن ایک شاہنامہ ہزار کتابوں پر بھاری ہے، اس لئے فارسی شاعری کا رتبہ اس حیثیت میں عربی سے بڑھا رہا۔ اور اس کو خود زباندانانِ عرب نے تسلیم کیا، چنانچہ ابن الاثیر نے مثل السائر میں صاف لکھ دیا ہے کہ عربی زبان باوجود اس قدر وسعت اور مایہ داری کے شاہنامہ کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔

اردو میں لے دے کر، میر تقی مرحوم کے چند اشعار ہیں، جو نوفل اور لیلیٰ کے قبیلہ کی لڑائی کے موقع پر لکھے ہیں، اس کا نمونہ یہ

ہے ؎

شانوں سے گذر کے رمح چالاک — تھے ہوش رُبائے مارِ ضحاک

مرثیہ میں میر ضمیر نے رزمیہ کی ابتدا کی، لیکن وہ بالکل نقشِ اولین تھا، میر انیس نے جس طرح اِس صنعت کو کمال کے درجہ تک پہونچایا اُس کے لحاظ سے اُردو شاعری، گو فارسی کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتی لیکن عربی سے کسی طرح پیچھے نہیں۔

رزمیہ شاعری کا کمال اُمورِ ذیل پر موقوف ہے۔ سب سے پہلے لڑائی کی طیاری، معرکہ کا زور شور، تلاطم، ہنگامہ خیزی، ہل چل، شور و غل، نقاروں کی گونج، ٹاپوں کی آواز، ہتھیاروں کی جھنکار، تلواروں کی چمک دمک، نیزوں کی لچک، کمانوں کا کڑکنا، نقیبوں کا گرجنا، اِن چیزوں کا اس طرح بیان کیا جائے کہ آنکھوں کے سامنے معرکہ جنگ کا سماں چھا جائے، پھر بہادروں کا میدانِ جنگ میں جانا، مبارز طلب ہونا، باہم معرکہ آرائی کرنا، لڑائی کے داؤں پیچ دکھانا، ان سب کا بیان کیا جائے، اس کے ساتھ اسلحۂ جنگ، اور دیگر سامانِ جنگ کی الگ الگ تصویر کھینچی جائے، پھر فتح یا شکست کا بیان کیا جائے۔ اور اس طرح کیا جائے کہ دل دہل جائیں یا طبیعتوں پر اداسی اور غم کا عالم چھا جائے۔

فردوسی کے ہاں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں، مثلاً وہ معرکہ جنگ کا سماں اس طرح کھینچتا ہے ؎

جہاں لرزلرزاں شد و دشت و کوہ — زمیں شد ز نعلِ ستوراں ستوہ
(گھوڑے) (عاجز)

برآمد ز ہر سو ز لشکر خروش — ہمی پیل رازاں بدرید گوش

ز بس نیزہ و گرز و گوپال و تیغ — تو گفتی ہمہ ژالہ بارد ز میغ
بلند آسماں چوں زمیں شد ز خاک — ز ہر سو ہمی بر شدہ چاک چاک
درخشیدنِ تیغہائے بنفش — ازاں سایۂ کاویانی درفش
تو گفتی کہ اندر شبِ تیرہ چہر — ستارہ ہمی برفشاند سپہر
سیہ شد ز گردِ سپہ آفتاب — ز پیکانِ پولاد و پرِ عقاب
دل کوہ گفتی بدرد ہمی — زمیں با سواراں بپرد ہمی
تو گفتی کہ ابرے بر آمد سیاہ — بہارید خوں اندراں رزمگاہ
ز گردِ سپہ روشنائی نماند — ز خورشید شب را جدائی نماند
ز جوشِ سواران و زخمِ تبر — و گر کوہِ خارا بہ آورد سر
زمیں شد ز نعلِ ستوراں ستوہ — جہاں کوہ دریا شد و دشت کوہ
ز بس نعرہ و نالۂ کرّنائے — ہمی آسماں اندر آمد ز جائے
سناں ہائے رخشان و تیغ سراں — درفش از بر و زیر گرزِ گراں
بجوشید دشت و بجنبید کوہ — ز بانگِ سواراں ہر دو گروہ
ز آہن زمیں بود و از گرز میغ — ستارہ سناں بود و خورشید تیغ
زمیں لالہ گوں شد ہوا نیلگوں — بر آمد ہمی موج دریائے خوں

اس کے مقابلہ میں میر انیس کا رزمیہ دیکھو:-

ہنگامۂ جنگ

نقارۂ دغا پہ لگی چوب یک بیک — اٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
شیپور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک — قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت دور تک

شورِ دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مُردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

گھوڑوں سے گونجتا تھا وہ سب وادیِ نبرد　　گردوں میں مثلِ شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
تھا چرخِ چارمین پہ بھی آفتاب زرد　　ڈر تھا گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد
گرمیِ ہجومِ فوج سے وہ چند ہوگئی
خاک اس قدر اُڑی کہ ہوا بند ہوگئی

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخِ لاجورد　　مانندِ کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اُٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلے میں گرد　　تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد
گرمی سے رن کے ہوش اُڑے وحش و طیر کے
شیر اُس طرف اُتر گئے دریا کو پیر کے

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در　　جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جنّات کانپ کانپ کے کہتے تھے الحذر　　دنیا میں خاک اُڑتی ہے اب جائیں ہم کدھر
اندھیر ہے، اُٹھی برکت اب جہان سے
لو مل گیا زمیں کا طبق آسمان سے

تھرّا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد　　ہلتے تھے کوہ، کانپتا تھا وادیِ نبرد
تھا دن بھی زرد دھوپ بھی زرد اور زمیں بھی زرد　　خورشید چھپ گیا، یہ اُٹھی کربلا میں گرد
اک تیرگی غبار سے تھی چشمِ مہر میں
ٹاپو پڑے ہوئے تھے محیطِ سپہر میں

فوجوں کی تیاری اور سامان

اُمڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دل پہ دل　　تھے برچھیوں کی صورتِ مقراض پھل پہ پھل
خنجر وہ جنکی آب میں تھی تلخیٔ اجل　　وہ گُرز جنکے ڈر سے گرے دیو مُنہ کے بل
دو دو تبر تھے پاس ہر اک خود پسند کے
حلقوں پہ تھے کھنچے ہوئے حلقے کمند کے

وہ دھوم طبلِ جنگ کی وہ بوق کا خروش　　کر ہوگئے تھے شور سے کرّوبیوں کے گوش
تھرّائی یوں زمیں کہ اُڑے آسماں کے ہوش　　نیزے ہلا کے نکلے سوارانِ درع پوش
ڈھالیں تھیں یوں سروں پہ سوارانِ شوم کے
صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے

حد سے فزوں ہے کثرتِ افواجِ نابکار　　نیزہ بہ نیزہ تیغ بہ ہے تیغ آبدار
ہر سمت ہے سناں پہ سناں مثلِ کارزار　　ہر صف میں ہے سپر پہ سپر مثلِ لالہ زار
پیکاں بہم ہیں جیسے ہوں گُل بے کھلے ہوئے
گوشوں سے ہیں کمانوں کے گوشے ملے ہوئے

دریا کی طرح لشکرِ کیں مارتا ہے جوش　　نیزے ہلا رہے ہیں جوانانِ درع پوش
ھل من مبارز کا ہر اک صف میں ہے خروش　　چلّے کھنچے ہوئے ہیں کمانوں کے تا بگوش

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں لچکتی ہیں　　نوکیں وہ تیز ہیں کہ دلوں میں کھٹکتی ہیں
نیزے تُلے ہوئے ہیں سنانیں چمکتی ہیں　　ترکش کھلے ہوئے ہیں کمانیں کڑکتی ہیں
سنگیں دلوں نے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے ہیں
تیغوں کے ساتھ گرزِ گراں سر اٹھائے ہیں

سپاہیوں کی آمادگیٔ جنگ

تنتا ہوا بڑھا کوئی قبضہ کو چوم کے　　بھالا کسی نے رکھ لیا کاندھے پہ جھوم کے
چتون کسی کی شورِ دہل سے بگڑ گئی　　ولہ منہ سرخ ہو گیا شکن ابرو پہ پڑ گئی
نکلا کوئی سمند کو زانو میں داب کے　　ولہ غصہ سے رہ گیا کوئی ہونٹوں کو چاب کے
پاسِ ادب شاہ سے صف بڑھ کے تھم گئی　　ولہ پٹری ہر اک سوار کے گھوڑے پہ جم گئی

حملہ کا زور شور اور فوجوں کی ہلچل

نکلی جو رن میں تیغ حسینی غلاف سے　　اڑنے لگے شرر دم خار انشگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشتِ مصاف سے　　صاف آئی الاماں کی صدا کوہ قاف سے
طبقے فلک کے صورت گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے ہل گئے

لرزہ تھا تخت و فوق و جنوب و شمال میں　　سکانِ غرب و شرق تھے بیم زوال میں
مضطر تھے شش جہت کے مکیں ایک حال میں　　غل تھا کہ گھر گئے غضبِ ذوالجلال میں
شہ کا غضب نمونۂ قہر الٰہ تھا
تلوار کیا علم تھی کہ عالم تباہ تھا

جنگل میں تھی علم جو وہ تیغ شرر فشاں　　تھرا کے آسمان میں چھپتا تھا آسماں
غاروں سے دوڑ کے چھٹ گئے شیروں نے نیستاں　　برپا تھا بر و بحر میں اک شور الاماں
مانند موج مچھلیوں میں اضطراب تھا
زہرہ ہر ایک سنگ کا پانی میں آب تھا

اٹھا جو الحفیظ کا روحانیوں میں شور　　مردے قبل کے چونک پڑے سب میانِ گور

چلائے گرگ و شیر و غزالان و مار و مور — ہے بازوئے حسینؑ میں دستِ خدا کا زور

آلٹے ہیں مثلِ شیرِ خدا آستین کو

اے کردگارِ عرش بچا لے زمین کو

تھا فوجِ قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر — تھیں موج کی طرح سب اُدھر کی صفیں اِدھر

چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور — پانی میں تھے نہنگ اُبھرتے نہ تھے مگر

فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ موڑ موڑ کے

دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارہ کو چھوڑ کے

تھا شور شش جہت میں غُل کہ یہ ہے روزِ انقلاب — اُلٹے گا اس زمیں کا ورق ابنِ بوتراب

اس شیر پر نہ ہوگی کوئی فوج فتحیاب — بس اب بنائے عالمِ امکاں ہوئی خراب

حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا

لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا

ماہی تھی جائے امن نہ زیرِ فلک کہیں — غُل تھا کہ مل نہ جائے سما سے سمک کہیں

جنبش سے بے حواس کہیں تھے ملک کہیں — سایہ کہیں تھا تیغ کہیں تھی چمک کہیں

پانی سے جل بجھا تھا کوئی کوئی نار سے

گرتی تھیں تین بجلیاں اک ذوالفقار سے

پریوں سے قاف چھوٹ گیا دیووں سے گھر — شیروں سے دشت گرگ سے بن اژدروں سے در

شاہین و کبک چھپ گئے اک جا ملا کے سر — اُڑ کر گرے جزیروں میں جنگل کے جانور

بیٹھے پہاڑ منہ کو جو دامن سے ڈھانپ کے

سیمرغ نے گرا دیے پر کانپ کانپ کے

فوجوں کی ابتری اور ہل چل

گرتی تھی برق تیغ جو ہر چل اِدھر اُدھر — سمٹے ہوئے تھے ڈھالوں کے بادل اِدھر اُدھر
شبدیز تھا کہ پھر رہی تھی کل اِدھر اُدھر — بھاگڑ تھی قلبِ فوج میں ہل چل اِدھر اُدھر
ہر جا تنوں کے ڈھیر سروں سے بلند تھے
بھاگیں کہاں گریز کے کوچے تو بند تھے

تیغیں سپر کے ساتھ کٹیں خود سر کے ساتھ — سینہ کمر کے ساتھ کٹا۔ دل جگر کے ساتھ
ہل چل پہ تھی کہ باپ نہ ٹھہرا پسر کے ساتھ — اس معرکہ میں چھوٹ گئے عمر بھر کے ساتھ
بھاگے شریر خلعت و منصب کو چھوڑ کر
جانیں روانہ ہو گئیں قالب کو چھوڑ کر

سرہنگ شام ٹھوکریں کھا کھا کے مر گئے — جو بچ گئے اِدھر سے اُدھر جا کے مر گئے
کتنے جواں سُموں کے تلے آ کے مر گئے — پس پس کے سرمہ ہو گئے ٹکرا کے مر گئے
ہل چل نے استخوانِ بدن چور کر دیے
بیٹوں نے پانوں باپ کی چھاتی پہ دھر دیے

تھا الاماں کا شور پریشاں تھے اہلِ شر — تیغوں کے پیچھے ڈر کے چھپی تھی ہر اک سپر
ماتھے علم رگڑتے تھے جھک جھک کے خاک پر — پرچم نے بال کھولے تھے فریادیوں نے سر
دانتوں میں خس ہراس سے تھے ہر جوان کے
چادر ہلا رہے تھے پھریرے نشان کے

بے زہ کمانیں تیروں سے چلّے کماں سے دور — مرغانِ تیر سہمے ہوئے آشیاں سے دور
برچھے سے پھل گرے ہوئے نیزے سناں سے دور — پیروں سے عقل دور تہوّر جواں سے دور

تیغوں کی کچھ خبر تھی، نہ ڈھالوں کا ہوش تھا
نیزہ ہر اک سوار کو اک بارِ دوش تھا

درپے تھی سرکشوں کی جو وہ تیغ جاں ستاں   گوشوں سے تھی بلند صدائے اماں اماں
ترکش سے تیر بھاگتے تھے تیر سے کماں   گردن سے سر رگوں سے لہو اور تنوں سے جاں
یارا عقاب تیر کو پرواز کا نہ تھا
رن میں کہیں نشان قدر انداز کا نہ تھا

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں   چلے کہیں تھے شست کہیں تھی کماں کہیں
نیزے کہیں، تھے ڈانڈ کہیں تھی سناں کہیں   جمدھر کہیں کمند کہیں، برچھیاں کہیں
اک اک سپاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

وہ گھاٹ بارِ حد اور وہ اسکی چمک دمک   کانپی کبھی زمیں کبھی تھرا گئے فلک
شعلے میں یہ چمک تھی نہ بجلی میں یہ لپک   ہر ضرب میں سما سے تلاطم تھا تا سمک
کونین میں حواس بجا تھے نہ ایک کے
گاوِ زمیں سمٹتی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

ڈر ڈر کے پچھلے پاؤں سپاہِ لعیں ہٹی   یہ صف سوئے یسار، وہ سوئے یمیں ہٹی
سہمے جبال، نہر کہیں سے کہیں ہٹی   دہشت سے آسماں ہوا اونچا زمیں ہٹی
بھاگڑ پڑی کہ ایک سے ایک آگے بڑھ گیا
دریا لہو کا کشتیِ گردوں پہ چڑھ گیا

نعرہ جدا، صدائے گیر و بدہ جدا   گوشے کماں سے دور تھے گوشوں سے زہ جدا

بکتر جدا زمین پہ ٹکڑے، زرہ جدا نیزوں کو دیکھیے تو گرہ سے گرہ جدا
اللہ رے فرق، گردن و سر بھی بہم نہ تھے
کشتوں کا ذکر کیا ہے کہ تیغوں میں دم نہ تھے

مغفر نہ سر کے پاس، نہ خنجر کمر کے پاس بیٹے کے پاس باپ نہ بیٹا پدر کے پاس
قبضے کے پاس تیغ، نہ دستہ سپر کے پاس کڑیاں زرہ کے پاس نہ دامن سپر کے پاس
نیزے نہ تھے سناں پہ، نہ پرچم نشان پہ
پیکاں نہ تیر پر تھا، نہ چلہ کمان پہ

معرکہ آرائی اور فنون جنگ کا اظہار | قدیم زمانہ میں جنگ کا دستور تھا کہ عام لڑائی سے پہلے دونوں طرف سے پہلے ایک ایک شخص میدان میں نکل کر حریف سے معرکہ آرا ہوتا تھا، اس بنا پر تمام مرثیہ گویوں نے اس قسم کی معرکہ آرائیاں بیان کی ہیں۔ لیکن مرزا دبیر وغیرہ یہ واقعہ اس طرح لکھتے ہیں کہ یہ نہیں اندازہ ہوتا کہ حریفوں نے فن جنگ کے کیا کیا ہنر دکھائے۔ بخلاف اس کے میر انیس اس کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ گویا فن جنگ کا بڑا ماہر، لڑائی کے تمام داؤں پیچ بتا رہا ہے۔ چونکہ عرب میں سب سے پہلے لڑائی کی ابتدا رجز سے ہوتی تھی، اس لئے پہلے ہم رجز کا انداز دکھاتے ہیں۔

رجز | عرب میں سب سے پہلے حریف میدان میں نکل کر رجز پڑھتا تھا یعنی اپنی شجاعت اور دلیری کا خود اظہار کرتا تھا، اس بنا پر میر انیس نے جا بجا رجز لکھا ہے لیکن چونکہ امام حسین علیہ السلام کی زبان سے

پہلوانی کا اظہار، اُن کے مرتبہ کے شایاں نہ تھا، اس لئے اکثر رجزوں میں پہلوانی اور بہادری کے بجائے فضیلت اور شرف کا اظہار کیا ہے، مثلاً

ع

میں ہوں سردار شباب چمن خلد بریں — میں ہوں انگشتر پیغمبر خاتم کا نگیں
میں ہوں خالق کی قسم دوش محمدؐ کا مکیں — مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منوّر ہے زمیں
ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
محفل عالم امکاں میں اندھیرا ہو جائے

پھر یہ بیان کرکے کہ جناب رسول اللہ صلعم اور جناب امیرؑ و حمزہ سیّد الشہدا کے تمام تبرکات مجھی کو وراثت میں ملے ہیں، فرماتے ہیں ع

یہ قبا کس کی ہے تبلاؤ یہ کس کی دستار — یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جو میں سینہ فگار
بر میں کس کا ہے یہ چار آئینہ جوہر دار — کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پر ہوں سوار
کس کا یہ خود ہے، یہ تیغ دو سر کس کی ہے
کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کی ہے

لیکن عام رجز کے قاعدہ کے لحاظ سے، بعض بعض جگہ شجاعت اور زور و قوت کا بھی اظہار کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں ع

بخشا ہے مجھکو حق نے شہ لافتیٰ کا زور — اس دست مرتعش میں ہے دست خدا کا زور
ہے انگلیوں کے بند میں خیبر کشا کا زور — پانی ہے میرے زور کے آگے ہوا کا زور
الٹوں فلک کو یوں، جو ہو قصد انقلاب کا

جس طرح ٹوٹ جاتا ہے ساغرِ حباب کا

آگے بڑھوں جو تیر کو چلّہ میں جوڑ کے | بھاگیں خطا شعار کمانوں کو چھوڑ کے
بیکار کر دوں شیر کا پنجہ مروڑ کے | پٹکوں زمین پر درِ خیبر کو توڑ کے

الٹوں طبق زمین کے یوں جھک کے زین سے
جس طرح جھاڑ دیتے ہیں گرد آستین سے

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں | آئے غضب خدا کا اُدھر رُخ جدھر کروں
بے جبرئیل کار قضا و قدر کروں | انگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآبؐ کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

یہ تیغ سر پہ گر کے ٹھہرتی ہے زین پر | جب ہاتھ اُٹھائے برق گری ہو زمین پر
خیبر میں کیا گذر گئی روح الامین پر | کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر

گھوڑے پر سوار ہونا

لو اب سوار ہوتے ہیں عباسؑ نامور | لو دامنِ قبا نے لیا بوسۂ کمر
لو ہٹ کے ہاتھ آپ نے رکھا یال پر | لو آفتاب خانۂ زیں میں ہے جلوہ گر

برچھا لیا سمند کو زانو میں داب کے
لو دو ہلال بن گئے حلقے رکاب کے

دو حریفوں کی معرکہ آرائی اور فنونِ جنگ

فردوسی کا یہ بڑا کمال خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لڑائی کے تمام جزئیات داؤں پیچ، اور فنونِ جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ سرسری اور معمولی باتوں کے

سوا، لڑائی کے ہر قسم کے تمام کرتب نہیں دکھاتا، سب سے بڑا سین جو اُس نے دکھایا ہے وہ رستم اور اشکبوس کا معرکہ ہے' اس موقع کے چند اشعار یہ ہیں ؎

خدنگی برآورد پیکاں چو آب | نہادہ برو چار پر عقاب
بمالید چاچی کماں را بدست | بچرم گوزن اندر آمد شکست
ستوں کرد چپ را و خم کرد راست | خروش از خم چرخ چاچی بخاست
چو زد تیر بر سینۂ اشکبوس | سپہر آں زماں دست اودا بوس
چو پیکاں بوسید انگشت اوے | گذر کرد از مہرۂ پشت اوے

اِن اشعار میں تیر اندازی کا وہی معمولی طریقہ ادا کیا ہے، البتہ نہایت شاندار اور پُرزور الفاظ میں ادا کیا ہے۔ لیکن میر انیس لڑائی کے ہر قسم کے کرتب اور ہنر اس تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ عربی اور فارسی میں اُس کی نظیر نہیں مل سکتی' ملاحظہ ہو ؎

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزہ کو دی کماں | چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
اک بندھ باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں | ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

جھنجلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر | قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ مارا بچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر | جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا

دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور پہ جھٹکا اٹھا کے جب   قبضہ میں لی کمان کیانی بصد غضب
چلّہ میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب   تیوری چڑھائی قاسم نوشاہ نے بھی تب
تیرِ نگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلّہ اُتر گیا

ہر بار جانبین سے ہوتے تھے وار د   تھا حرب و ضرب میں وہ شقی بھی بلائے بد
جب بڑھ کے وار کرتا تھا وہ بانیٔ حسد   کہتا تھا بازوے شہ دیں یا علیؑ مدد
یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغ جہول کو
جس طرح روک لے کوئی شہ زور پھول کو

لایا جو حرفِ سخت زباں پر وہ بد خصال   جھپٹا مثالِ شیر درندہ حسنؑ کا لال
گھوڑے سے بس ملا دیا گھوڑا بصد جلال   اتنے بڑھے کہ گڑ گئی اسکی سپر سے ڈھال
او جھڑ لگی کہ ہوش اُڑے خود پسند کے
گھوڑے نے پاؤں رکھ دیے سر پر سمند کے

عباسؑ نامدار نے پہلو سے دی صدا   ہاں اب نہ جانے دیجیو احسنت مرحبا
دشمن کے مار ڈالنے کی بس یہی ہے جا   سنتے ہی یہ فرس سے فرس کو کیا جدا
گھوڑا کبھی اس طرف کو، ادھر ہو کے پھر پڑا
مارا کمر پہ ہات، کہ وہ ہو کے گر پڑا

ایک اور موقع سے

نیزے ہلے وہ چل گئیں چھریں کہ الاماں   ہر طعن تھر کی تھی قیامت کی سر تکاں

چنگاریاں اڑیں جو سناں سے لڑی سناں   دو اژدہے گتھے تھے نکالے ہوئے زباں
پھیلے شرر پرندوں کی جانیں ہوا ہوئیں
شمعوں کی تھیں لویں کہ ملیں اور جدا ہوئیں

ان کا نہ ایک وار، نہ اُس کے ہزار بند   بڑھ بڑھ کے کھول دینا تھا شہسوار بند
کیا نیزہ بازی میں تھا بار بار بند   چوٹوں سے نیلگوں تھے جفا جو کے چار بند
خالی گئی نہ فرق کی نہ دست و پا کی چوٹ
کُھلتی بھی ہو بندھی ہوئی تشت کالکشا کی چوٹ

ڈولی گرہ میں نیزۂ ظالم کی جب سناں   گھوڑا اُڑا کے ہاتھ کو اکبرؑ نے دی تکاں
اللہ رے زور اٹھ گیا گھوڑے سے پہلواں   دستِ شقی سے چھوٹ گئی ڈانڈ نا گہاں
نیزہ کے ساتھ شور اُٹھا اُس گروہ سے
لو اژدہے کو لے گیا سیمرغ کوہ سے

ظالم نے ڈھال دوش سے لی اور کمر سے تیغ   مارا تھا اُس نے ٹھاٹ کہ چمکی اُدھر سے تیغ
دو چار بار ڈوب کے نکلی سپر سے تیغ   چلنے میں گھٹتی بڑھتی کس کس ہنر سے تیغ

ولہ

چمکی سپر کے پاس کبھی برق کی مثال   شانے پہ آئی سینہ پہ لی جب شقی نے ڈھال
سر کو بنا کے کاٹ گئی، وہ زرہ کا جال   چوٹیں کڑی پڑی تھیں کہ مضطر تھا بد خصال
روکے کیسے؟ جواب کیسے دے؟ کدھر پھرے؟
بجلی کے ساتھ ساتھ کہاں تک سپر پھرے

چمکی جو تیغ، ڈھال وہ لایا قریبِ سر   اک برق سی گری کہ دو پارہ ہوئی سپر

مغفر سے سر میں تھی کبھی سر گردن سے صدر پر — سینہ سے جب بڑھی تو ہوا تب وہ باخبر
سب نشۂ غرور جوانی اُتر گیا
تلوار تھی کہ حلق سے پانی اُتر گیا

ایک اور موقع سے

تولا شقی نے سنتے ہی یہ گُرز گاؤ سر — اکبرؑ نے دونوں پاک سے لی ہاتھ میں سپر
آیا اُدھر سے گرز اِدھر سے چلا تبر — دو ہو گیا عمود مثالِ خیارِ تر
گرز اس طرح نکل گیا پنجے سے چھوٹ کے
سمجھے یہ سب زمیں پہ گرا ہاتھ ٹوٹ کے

بھالا سنبھالا دشمنِ ایماں نے مل کے ہاتھ — نیزے کے چار پانچ نکالے سنبھل کے ہاتھ
پہلے ہی بک چکا تھا ستمگر اجل کے ہاتھ — بڑھتا نہ تھا جو پاؤں تو رکتا تھا چل کے ہاتھ
کم تھے نہ یہ بھی زور میں گر وہ زیاد تھا
نیزے کے بند بند کا توڑ اُن کو یاد تھا

رکھ کے تبر نیام سے لی تیغ شعلہ ور — تھرا کے خود اماں نے صدا دی کہ الحذر
بھالے کے ہاتھ بھول گیا سب وہ خیرہ سر — یہ بھی اُدھر تھے پھرتا تھا نیزہ جدھر جدھر
چاہا کدھر یہ تیغ سے جائے اماں نہ تھی
دیکھا جو غور سے تو سناں کی زباں نہ تھی

بالائے سر جو ڈانڈ کو لایا وہ خود پسند — کھولے تمام نیزۂ بیداد گر کے بند
پھینکی شقی نے فرق پہ جھنجلا کے پھر کمند — سر کو بچا کے شیر نے تلوار کی بلند
گردش تھی ہاتھ کی نہ بڑھے کچھ نہ ہٹ گئے

حلقے کھلے تھے جو وہ اشارے ہیں کٹ گئے

ہٹ کر خطا شعار نے جوڑا کماں میں تیر　　　تیر افگنی میں شہرۂ آفاق تھا شریر
سرکش خدنگ مرگ سے کیونکر ہو گوشہ گیر　　　چلّہ کٹا کماں کا زہے تیغ بے نظیر

قربان زور ضربت نصرت نشان کے
کھل کر قضا پہ بندھ گئے بازو کماں کے

خادم نے تیر جوڑ کے دی دوسری کماں　　　نیزہ اٹھا کے شیر نے آواز دی کہ ہاں
سپر ادھر اٹھی تھی کہ چمکی ادھر سناں　　　بھالے کی نوک جھوک نئی تھی نئی تکاں

سہما یہ دل کہ بن گئی موذی کی جان پر
ناوک زمیں پہ تھا تو کماں آسمان پر

ایک اور موقع سے

پیہم ہوئیں تکاں پہ تکائیں جو یکدگر　　　ظالم کبھی ادھر تھا تو حضرت کبھی ادھر
کس نوک جھوک سے وہیں نیزے کو پھیر کر　　　فرزند شیر حق نے دکھایا عجب ہنر

ظالم پہ آسماں سے بلا ناگہاں گری
دو نیم نیزہ اڑ کے زمیں پر سناں گری

چلّہ میں رکھ کے تیر بڑھے قبلۂ امم　　　اک ہاتھ راست کر کے کیا دوسرے کو خم
کچھ کہہ کے گوشِ شہ میں چلا تیر تیز دم　　　آواز دی کماں نے زہے شاہِ باکرم

چلّہ تو شستِ شاہِ زمن سے نکل گیا
واں تیر دل کو توڑ کے سن سے نکل گیا

گھوڑا | فردوسی کے ہاں گھوڑے کی تعریف میں جستہ جستہ دو چار شعر

پائے جاتے ہیں، لیکن متاخرین نے اس مضمون کو بہت وسعت دی، اور مبالغہ کو حد سے بڑھا دیا، سب سے پہلے عبدالواسع جبلی نے ایک قصیدہ کی تشبیب، گھوڑے کی مدح سے کی ہے

اے بہ بالا ہمچو آتش وے بسوے پستی چو آب | خاک وصفی در درنگ، و باد رنگی در شتاب
گر کنی پویہ نباشد ابر باتو ہم عنان | گر بری حملہ نباشد برق باتو ہم رکاب

مبالغہ ملاحظہ ہو ع

از جبل پنہاں نشوی در سایۂ پر پشہ
وز ہنر جولاں کنی، در گوشۂ چشم ذباب

"ایک شعر کے بعد لکھتے ہیں کہ جب تو بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے، یا پستی سے بلندی پر چڑھتا ہے تو ع

نسبتی داری ہمانا با قضائے آسماں
قربتی داری ہمانا با دعائے مستجاب

عُرفی نے بھی ایک قصیدہ گھوڑے کی مدح میں لکھا ہے ع

اے طعن فلک نوشتہ بر سُم | وے زلف صبا بریدہ از دُم
بر غنچہ شبک روی بد انساں | کش خندہ نزاید از تبسّم
تازی بہ لب فسانہ پرداز | زاں گو نہ کہ نشکنی تکلّم

ایک اور قصیدہ میں لکھتا ہے ع

آں شبک سیر کہ گر گرم عنانش سازی | از ازل سوے ابد وز ابد آید بہ ازل
قطرہ با کش دم رفتن چکد از پیشانی | شبنم آسائش نشیند گہ رجعت بہ کفل

گر سر خصم تو بند ند بہ پایش دم تزع　　تا قیامت بہ گلو یش نرسد دست اجل

زلالی لکھتا ہے ؂

زجستن جستن او سایہ در دشت
چو زاغ آشیاں گم کردہ می گشت

یعنی گھوڑا اس طرح جنگل میں اڑتا پھرتا تھا کہ خود اس کا سایہ اس کو یوں ڈھونڈھتا پھرتا تھا جس طرح کوا اپنے گھونسلے کو ڈھونڈھتا پھرے

اُردو میں مرزا سودا نے کہا ؂

روبرو سے اگر آئینہ کے اس گلگوں کو
پھینکدے لیکے کبھی شرق سے تو غرب تلک
اتنے عرصہ میں پھر آئے تو اُسے باور کر
عکس بھی آئینہ سے ہونے نہ پائے منفک

مرزا دبیر صاحب فرماتے ہیں۔

ع　سرعت کا یہ عالم ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا

ان تمام اشعار کے نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ فارسی اور اُردو میں جو کچھ گھوڑے کی مدح میں لکھا گیا، وہ صرف ناممکنات کے افسانے تھے کسی نے یہ نہیں کیا کہ گھوڑے کا اصلی خد و خال، ڈیل ڈول، چہرہ مہرہ چل پھر، آؤ جاؤ کا نقشہ دکھاتا،

میر انیس صاحب بھی اگرچہ مذاق عام کی پیروی سے اکثر بہکے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں۔

ع آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو ؎

تنگی سے آسماں کی خفا یہ سمند ہے
کیونکر اُڑے، پری ہے کہ شیشہ میں بند ہے

تاہم اِن کا اصلی جوہر بھی ہر جگہ نمایاں ہے، ملاحظہ ہو ؎

باریک جلد وہ کہ نظر آئے تن کا خون — گنڈے کو دیکھ کر مہ نو ہووے سرنگوں
رفتار میں وہ سحر کہ پریوں کو ہو جنوں — غنچے بھی کچھ بڑے ہیں کنوتی کو کیا کہوں

قربان ہزار جان فرس بے نظیر پر
پیکان دو چڑھے ہوئے ہیں ایک تیر پر

نازک مزاج، خوش قد و طناز و سر بلند — وہ پیش و پس، وہ سم وہ کنوتی، وہ جوڑ بند

ولہ

کوتاہ، وگرد و صاف، کنوتی، کمر، کفل — کیا خوشنما کشادگی سینہ و بغل

ولہ

وہ تھوتھنی، وہ اُبلی ہوئی انکھڑیاں وہ بال — گویا کھلے تھے، حور کے گیسو پری کے بال

ولہ

وہ جلد، وہ دماغ، وہ سینہ وہ سم وہ چال — دم میں کبھی ہما کبھی ضیغم کبھی غزال

وہ قصر آسماں پہ بھی جانے میں طاق تھا
دو پر خدا اگر اُسے دیتا براق تھا

وہ جستیاں وہ تیزی و سرعت وہ چالاکی سمند — سانچے ہیں تھے ڈھلے ہوئے سب اسکے جوڑ بند
سم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند — نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سر بلند

چمکی جدھر سوار نے پھیری وہ مڑ گیا
اترا براق بن کے پری ہو کے اڑ گیا

جرأت میں رشکِ شیر تو ہیکل میں پیلتن　　پھرتی کے وقت کبکِ دری جست میں ہرن
بجلی کسی جگہ تو کہیں ابرِ قطرہ زن　　بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن
سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

افزوں ہے زلفِ حور سے خوشبو ایال کی　　دیکھیں تو لیں بلائیں سدا بال بال کی
پریاں خرامِ ناز میں شاگرد چال کی　　غصہ میں جست شیر کی شوخی غزال کی
وہ حسنِ تن پہ ساز کا جوبن براق کا
دلدل کے ہاتھ پاؤں تو چہرہ براق کا

غصے میں انکھڑیاں کے ابلنے کو دیکھئے　　جوبن میں جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھئے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھئے　　تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھئے
وہ تھوتھنی کہ غنچۂ سوسن سے تنگ تر
وہ انکھڑیاں خجل ہوں ہرن جس کو دیکھ کر

ع　وہ شوخیاں فرس کی، وہ سرعت، وہ آؤ جاؤ،

گھوڑے کے غیظ کی تصویر

مانندِ شیر غیظ میں آیا وہ پیل تن　　آنکھیں ابل پڑیں صفتِ آہوئے ختن
ماری زمیں پہ ٹاپ کہ لرزا تمام بن　　غل پڑ گیا کہ گھوڑے پہ بھی لو چڑھا ہے رن
مینخیں زمیں کی اسکی تگاپو سے ہل گئیں

دونوں کنوتیاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

گھوڑے کی تیزروی اور چل پھر

سمٹا، جما، اڑا، ادھر آیا اُدھر گیا چمکا، پھرا، جہاں دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اُڑکے برچھیوں میں بچ کے گیا برہم کیا صفوں کو، پرے سے گذر گیا
گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اُسکے فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سرو ہی کا وار تھا

پھرتا تھا کیا صفوں میں فرس جھوم جھوم کے سرعت بلائیں لیتی تھی منہ چوم چوم کے
پامال تھے پرے سپہ شام و روم کے غل تھا یہ فوج میں پسرِ سعدِ شوم کے
رخش ایسا روم و رے میں نہیں شام میں نہیں
یہ شوخیاں تو ابلقِ ایام میں نہیں

آہو کی جست شیر کی آمد پری کی چال کبکِ دری تجل، دل طاوس پائمال
سبزہ شتاب روی میں قدم کے تلے نہال اِک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال
جو آگیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا، کبھی رہوار بن گیا آیا عرق تو ابرِ گہر بار بن گیا
گہ قطب، گاہ گنبد دوار بن گیا نقطہ کبھی بنا، کبھی پرکار بن گیا
حیراں تھے اسکے گشت پہ لوگ اُس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

تلوار | مرثیہ گویوں کا سب سے بڑا موضوع شاعری یہی ہے، اور مرزا دبیر صاحب

تو اس عالم میں لامکاں تک پہنچ جاتے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سب کچھ کہتے ہیں اور غور سے دیکھئے تو (تلوار کے متعلق) کچھ نہیں کہتے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

مرزا دبیر

مدِّ نگہِ چشم نیام اوج پہ آیا اور صاف ہر اک فرد بشر کو نظر آیا
خط کھینچنے کو کلک دوات ظفر آیا ولہ یا دوڑ کے ظلمت کے گلے سے خضر آیا
ظلمات میں یہ فتح پہ قبضے کئے پھری ولہ یونس کو جیسے بطن میں ماہی لئے پھری
مثل ہوا سروں میں سمائی چلی گئی ولہ بو کی طرح دماغوں میں آئی چلی گئی
ذات اک طرف مٹا دیا اُس نے صفات کو ولہ کیسی زبان، زباں ہیں یہ کاٹ آئی بات کو
کاف خشگاف بن کے درون جگر گئی ولہ مانند میم مرگ، میان کمر گئی
نقطۂ شکم میں دینے کو زیر و زبر گئی ولہ مانند پیش ہر جزو کل سے گذر گئی
تلواروں پر وہ سیف جو شعلہ فشاں ہوئی ولہ جل جھن کے آب تیغوں کی رن میں دھواں ہوئی
گیا جو فوق سے تحت الثریٰ کو آب حسام ولہ بنا خزانۂ قاروں خزانۂ حمام
فلک نے تختۂ یوناں رکھا زمیں کا نام ہوا رطوبت اطراف سے زمیں کو زکام

دماغ خاک پہ نزلہ بصد و فور گرا
کیا جو عطسہ تو قاروں نکل کے دور گرا

خود انصاف کرو، یہ تلوار کی تعریف ہے یا ہوائی طلسم ہے۔

میر انیس صاحب بھی اگرچہ سامعین کی بد مذاقی کے اثر سے کہیں کہیں، بے راہ نکل جاتے ہیں، تاہم واقعیت اور اصلیت کا جوہر ہر

جگہ نمایاں رہتا ہے، سب سے پہلے دیکھو تلوار کا سراپا کس طرح کھینچتے ہیں

ے

پتلہ وہ اس کا اور وہ باریکیِ خمیر   کس بل میں بے مثال اصالت میں بے نظیر

ولہ

دلسوز، شعلہ خو، شرر انداز و جاں گداز   لشکر کش و شکست رساں و ظفر نواز
خونخوار و کج ادا و دل آزار و سرفراز   حاضر جواب، تیز طبیعت، زباں دراز

سچ اس کی ہے پسند جہاں گو سچی نہ ہو
معشوق پھر نہیں کہ جو اتنی کجی نہ ہو

ذوالفقار سے تشبیہ ے

جوہر وہی، برش کا وہی طور، خم وہی   تیزی وہی، غضب کی وہی گھاٹ، دم وہی
چلنا اسی طرح کا، چمک دا سبدم وہی   رنگت زمردی وہی، پانی میں سم وہی

تلوار کا کاٹ اور اسکی تعریف

چمکی، گری، اٹھی، ادھر آئی ادھر گئی   خالی کیے پرے، تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم، کبھی بالائے سر گئی   ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی

اک شور تھا یہ کیا ہے جو قہرِ صمد نہیں
ایسا تو رود نیل میں بھی جذر و مد نہیں

بجلی گری کہ فوج پہ تیغِ دو سر گری   کٹ کر کسی کی تیغ کسی کی سپر گری
چمکی کبھی فلک پہ، کبھی فرق پر گری   سر کاٹ کر ادھر سے جو اٹھی ادھر گری

زرہیں تنوں میں مثلِ کفن چاک ہو گئیں

اِک آن میں صفیں کی صفیں خاک ہو گئیں

اک شور تھا کہ تیغ ہے یا یہ خدا کا قہر　　بہتی ہے جسکی آگ سے کوسوں لہو کی نہر
ناگن ہے یہ کہ کاٹے کی جسکے نہیں ہے لہر　　اُتری گلے سے چڑھ گیا سارے بدن میں زہر
زخموں سے جسم ڈر سے کلیجے فگار ہیں
جوہر نہیں ہیں تیغ میں، دندانِ مار ہیں

یکتا بُرش میں جوہرِ ذاتی میں قادر ہیں　　چمکی احد میں خیبر و خندق میں بدر میں
تیزی وہی تھی سان کی اس آشوبِ غدر میں　　بڑھ کر سپر سے سر میں گئی سر سے صدر میں
کھنچتی ہوئی سپر سے نیا رنگ ڈھنگ تھا
اِک تھا نہ فرس تھا نہ زیں تھا نہ تنگ تھا

غُل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی، یہ گری　　برچھی سے اُڑ گئی وہ سناں، یہ گرہ گری
ترکش کٹا، کمان کیانی سے زہ گری　　یہ سر اُڑا، وہ خود اُڑا، یہ زرہ گری
آتی ہے لشکروں پہ تباہی اسی طرح
گرتی ہے برق قہر الٰہی اسی طرح

سر لوٹتے تھے برچھیوں والوں کے ہر طرف　　ٹکڑے پڑے تھے دشت میں بھالوں کے ہر طرف
پامال تھے سوار رسالوں کے ہر طرف　　پر کالے اُڑتے پھرتے تھے ڈھالوں کے ہر طرف
خاطر نشاں نہ تھی کسی آفت نشان کی
انبار تھیں کٹی ہوئی نشانیں کمان کی

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے　　تنتی تھی بس تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پیے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے　　دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے

کیا جانیے ملا تھا مزا کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

ہر ہات میں اڑا کے کلائی نکل گئی　　کوندی، گری، زمیں میں سمائی نکل گئی
کاٹی زرہ دکھا کے صفائی نکل گئی　　مچھلی تھی اک کہ دام میں آئی نکل گئی
چار آئینہ کے پار تھی اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر　　پہنچوں سے ہات، شانوں سے بازو، تنوں سے سر
قبضہ سے تیغ، بر سے زرہ، ہات سے سپر　　برچھی سے پھل، کمان سے زہ، زین سے تبر
ترکش کہیں پڑے تھے نشان زری کہیں
پیکاں کہیں تھی، شست کہیں تھی، سری کہیں

جب صف پہ وار کرتے تھے سلطان بحر و بر　　اڑتی تھی کٹ کے صورت کاغذ ہر اک سپر
چھپتی تھیں، بھاگی جاتی تھیں، گرتے تھے خاک پر　　قبضوں سے تیغیں جسم سے روحیں تنوں سے سر
بے تھے قدم اگر یز کے کوچے بھی بند تھے
شعلہ وہ تیغ تھی سر اعدا سپند تھے

چھپتے تھے یوں وہ دیکھ کے اس تیغ کی چمک　　بھاگے شعاع مہر سے جس طرح شپرک
اوج سما سے زلزلہ برپا تھا تا سمک　　چمکی وہ جب تو کانپ گئے چرخ پیر ملک
ہر شے تھی خوف جاں سے خضوع و خشوع میں
سجدے میں تھی زمیں تو فلک تھا رکوع میں

جوشن کو کاٹ جاتی تھی یوں آ کے اوج سے　　پیراک جس طرح نکل آتا ہے موج سے

چمکی جو برق سی تو نکل آئی تنگ سے ۔ رکتی تھی نہ سپر سے نہ آہن نہ سنگ سے
خالق نے منہ دیا تھا عجب آب و تاب کا
خود اس کے سامنے تھا پھپولا حباب کا

چم خم وہ تیغ کا وہ لگاوٹ وہ آب و تاب ۔ آتش کسی جگہ کہیں بجلی کہیں سحاب
سیلی تھی اک پری کے شکم پر کہ اسکی تاب ۔ تیزی زباں میں وہ کہ فرشتوں کو دے جواب
جوہر سے اس کا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

پیاسی بھی خون فوج کی اور آبدار بھی ۔ غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی
بجلی بھی ابر تر بھی خزاں بھی بہار بھی ۔ تلوار بھی چھری بھی سپر بھی کٹار بھی
پانی نے اس کے آگ لگا دی زمانے میں
اک آفتِ جہاں تھی لگانے بجھانے میں

نیزے کے بند بند قلم برچھیاں دو نیم ۔ مثلِ قلم زبانِ درازِ سناں دو نیم
چار آئینہ کٹے ہوئے گرزِ گراں دو نیم ۔ مغفر سے تا کمر جسدِ پہلواں دو نیم
سالم تھا پیشِ آئینۂ تیغ جو نہ تھا
لشکر میں کونسا تھا وہ یکتا جو دو نہ تھا

وہ تیغ جب بڑھی صفِ کفار ہٹ گئی ۔ چمکی جو برق ڈھالوں کی بدلی سمٹ گئی
دم بھر میں یوں صفوں کو الٹ کر پلٹ گئی ۔ رن کی زمیں لہو کے ڈبڑوں سے کٹ گئی
دریا بھی آبِ تیغ سے بے آبرو ہوا
غل تھا کہ نو فرات کا پانی لہو ہوا

اِس موقع پر شاید تمھارے ذہن میں یہ خیال آئے کہ ہیمرؔ اِلہس کی رزمیہ میں گو الفاظ کی شکوہ و شان کی کچھ انتہا نہیں، لیکن اصلیت اور واقعیت سے یہ مراحل دور ہے۔ کربلا کا واقعہ نتائج کے لحاظ سے بے شبہ ایک اہم واقعہ ہے لیکن معرکہ آرائی کے لحاظ سے اُس کی صرف یہ حیثیت ہے کہ ایک طرف سو سوا سو آدمی تشنہ لب اور بے سرو سامان تھے، دوسری طرف تین چار ہزار کا مجمع تھا، جو دفعۃً ٹوٹ پڑا اور تین گھنٹے میں لڑائی کا فیصلہ ہو گیا، ایسے واقعہ کے متعلق یہ کہنا کہ زمین تھرا گئی، آسمان کانپنے لگے، پہاڑ جگہ سے ہٹ گئے، دریا اُبل پڑے، فرشتے آسمانوں میں چھپتے پھرتے تھے وغیرہ وغیرہ واقعیت سے کس قدر دور ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں اصلیت اور واقعیت کا لحاظ تاریخی حیثیت سے نہیں کیا جاتا، بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ شاعر کو اُن واقعات کا یقین ہے یا نہیں؟ اگر وہ اُن باتوں پر یقین رکھتا ہے، اُن کے اثر سے لبریز ہے اور جس قدر اُس کے دل پر اثر ہے اُسی جوش کے ساتھ اُن کا اظہار بھی کرتا ہے تو اُسکی شاعری بالکل اصلی ہے، فرض کرو کہ شاہنامہ کے تمام واقعات غلط ثابت ہو جائیں تو اُس سے فردوسی کے کمال شاعری میں کیا فرق آئے گا؟

شاعر کو قطعی یقین ہے کہ امام حسین علیہ السلام تمام عالم کے کاروبار کے مالک ہیں، جن و انس، شجر حجر، سب اُن کے محکوم ہیں، اُن کا غیظ میں آنا، کردگار عالم کا غیظ میں آنا ہے، اس صورت میں اگر اُن کی

حملہ آوری سے زمین و آسمان دہل جائیں اور دنیا متزلزل ہو جائے تو استعجاب کی کیا بات ہے، یہ ضرور ہے کہ اس حالت میں بھی وہی واقعات بیان کرنے چاہئیں، جن سے طبیعت پر واقعی اثر ہو، صرف موہوم خیال بندی اور لفاظی نہ ہو، جیسا مرزا دبیر صاحب کا انداز ہے:

یہ بات بھی بظاہر کھٹکتی ہے کہ رزم کے بیان میں عشقیہ الفاظ استعمال کرنا، بلاغت کے خلاف ہے، اور میر انیس اکثر تلوار کی تعریف میں اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، مثلاً ؎

کس تکلف سے وہ لیلائے ظفر راہ چلی　　گہ بڑھی، گاہ رکی، گاہ تھمی، گاہ چلی،

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ رو جدا　　جیسے کنار شوق سے ہو خوبرو جدا

سج اسکی ہے پسند جہاں گو سجی نہ ہو　　معشوق کیا نہیں کہ جو اتنی کجی نہ ہو

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض کی بات نہیں، بلکہ میر انیس کے محاسن شاعری میں داخل ہے، علامہ ثعلبی نے یتیمۃ الدہر میں جہاں متنبی کے محاسن گنائے ہیں وہاں لکھتے ہیں ؎

منها استعمال الفاظ الغزل والنسيب فی اوصاف الحرب وهو ايضاً مما لم يسبق اليه و تفرد به و اظهر فيه الحذق

متنبی کے محاسن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ لڑائی کے بیان میں غزل کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور یہ بھی اسکی اُن خصوصیات میں ہے جن کی پہلی کوئی نظیر نہیں ملتی اور جن میں وہ منفرد ہے،

اس کے بعد متبنی کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں جن میں
سے ایک یہ ہے ؎

قد صبغت خدھا الدماء کما — زمین کے چہرہ کو خون نے اس طرح رنگین
یصبغ خد الخریدۃ الخجل — کر دیا ہے، جس طرح شرم کی حالت میں،
معشوق کے چہرہ پر سرخی آجاتی ہے،

لیکن یہ بہت نازک موقع ہے، رزم میں عشقیہ الفاظ اور تشبیہات کا
استعمال وہیں تک جائز ہے، جہاں تک کلام کا اثر نہ جانے پائے اور کلام
میں ابتذال نہ آجائے، مرزا دبیر صاحب نے بھی میر انیس کی تقلید
کرنی چاہی لیکن کلام کا یہ رنگ ہو گیا ؎

تلوار کی تعریف

جب خوں میں بھری فوج کے انبوہ سے نکلی — غل یہ تھا کہ وہ لال پری کوہ سے نکلی
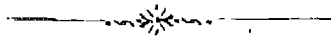
سلام

اُردو شاعری کی اصلی بنیاد غزل کی زمین پر قائم ہوئی اور اقسامِ سخن میں سے اِسی کو سب سے زیادہ فروغ ہوا، عام مرثیہ گویوں نے اپنے مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے مسدس کا طریقہ اختیار کیا، لیکن غزل کی لَے اس قدر کانوں میں رچ چکی تھی کہ ان لوگوں کو بھی اس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا تھا، اس بنا پر اُنھوں نے غزل کی طرز پر سلام ایجاد کیا، سلام کی بحریں وہی غزل کی ہوتی ہیں، غزل کی طرح، مضمون کے لحاظ سے ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے، سلام کی خوبی یہ ہے کہ طرح شگفتہ اور نئی بندش سادہ اور صاف، مضمون درد انگیز اور پُر تاثیر ہو، میر انیس کے سلاموں میں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں، نمونہ ملاحظہ ہو ؎

صبر کرتے تھے سلامی! شہ والا کیا کیا — اہلِ کیں دیتے تھے مظلوم کو ایذا کیا کیا
شاہ فرماتے تھے پانی نہیں ملتا لیکن — سامنے آنکھوں کے لہراتا ہے دریا کیا کیا
سرِ شبیرؑ سے کہتے تھے یہ رو رو سجادؑ — رنج دیتے ہیں مجھے راہ میں اعدا کیا کیا
طوق و زنجیر سنبھالوں کہ مہار اونٹوں کی — ق کام اتنے ہیں کروں میں تن تنہا کیا کیا
رو رو کہتی تھی یہ صغراؑ کہ کہے جا قاصد — تو نے کیا کیا کہا اور شاہ نے پوچھا کیا کیا
دیکھ کر فوجِ حسینی کو عدو کہتے تھے — ساتھ لائے ہیں جواں سید والا کیا کیا

خط لیے لاشۂ اکبرؑ پہ یہ کہتے تھے امام　　دیکھو بیٹا! تمھیں صغراؑ نے ہے لکھا کیا کیا

ایضاً

کچھ اور جز زبان نہیں اہلِ سخن کے پاس　　مجرائی کیا زباں کے سوا ہو؟ دہن کے پاس
سمجھے یہ سب کہ عونؑ و محمدؑ ہوئے شہید　　روتے ہوئے حسینؑ جو آئے بہن کے پاس
چلّائی بانوؑ دیکھ کے اصغرؑ کو قبر میں　　مجھکو بھی گاڑ دے کوئی اس گلبدن کے پاس
صدمہ سے کانپنے لگے عابدؑ کے ہاتھ پانوں　　جس وقت ہڈیاں نظر آئیں رسن کے پاس

ایضاً

سلامی! آنکھ سے رہ رہ کے خونِ دل ٹپکتا ہے　　غمِ سجادؑ بیکس دل میں کانٹا سا کھٹکتا ہے
دمِ تحریر گلریزی ہے یا سطریں ہیں کاغذ پہ　　صریرِ کلک ہے یا باغ میں بلبل چہکتا ہے
پھرے تھے کربلا کی راہ سے کچھ سوچ کر حضرتؑ　　وگرنہ رہبرِ عالم کہیں رستہ بھٹکتا ہے
حرم روئے کہا جب آسماں کو دیکھ کر شہؑ نے　　علی اکبرؑ اذاں دو صبح کا تارا چمکتا ہے
زمینِ کربلا پر فاطمہؑ کے پھول بکھرے ہیں　　شہیدوں کی یہ خوشبو ہے کہ سب جنگل مہکتا ہے
تنِ رنجور پر ہاتھ اپنا زینبؑ رکھ نہیں سکتی　　تپِ غم سے بدن سجادؑ کا ایسا دہکتا ہے
کہا بانوؑ نے شہ سے تیر چلتے ہیں کلیجہ پر　　مرا ننھا جب یہ بچہ نرگسی آنکھوں سے تکتا ہے
یہ ننھے ننھے دونوں ہاتھ بل کھاتے ہیں سینہ پر　　ق　　مسوڑے ہوگئے ہیں نیلگوں تالو لپکتا ہے

ایضاً

مجرائی! جب کہ عیاں ماہِ عزا ہوتا ہے　　چرخ پر ماتمِ شاہِ شہداؑ ہوتا ہے
پھیر دیں آنکھیں جو اصغرؑ نے پکاری بانوؑ　　دوڑو اے بی بیو! دیکھو تو یہ کیا ہوتا ہے
ویر بیٹوں کو لگی رن میں تو زینبؑ نے کہا　　لاشیں آتی ہیں اگر فضلِ خدا ہوتا ہے

کہتی تھی خلقِ خدا دیکھ کے عابد کو اسیر　　کہیں بیمار بھی رسّی سے بندھا ہوتا ہے

ایضاً

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو　　ہم آسمان سے لائے ہیں اِن زمینوں کو
یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے　　چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو
لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار　　خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
بھلا تردّدِ بیجا سے اس میں کیا حاصل　　اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو
خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم　　انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

رباعیات

صوفیانہ اور اخلاقی مضامین کے اظہار کے لئے سب سے زیادہ موزوں چیز رباعی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جن شعرا مثلاً خیام، سحابی، سلطان ابوسعید ابوالخیر نے اِن مضامین کو اپنا موضوع شاعری قرار دیا تھا، انھوں نے رباعی کے سوا، تمام عمر میں اور کچھ نہ لکھا۔

اُردو شاعری میں چونکہ یہ مضامین بہت کم ادا کئے گئے، اس لئے رباعیاں بہت کم پائی جاتی ہیں، سودا نے البتہ نہایت کثرت سے رباعیاں لکھیں، لیکن اکثر عشقیہ یا خیال آفرینی کی غرض سے لکھی ہیں۔

میر انیس کی رباعیوں کا ایک بڑا دفتر ہے، اور ہر رباعی میں کوئی نہ کوئی اخلاقی مضمون ادا کیا گیا ہے، بعض ایسی بھی ہیں جن میں صرف

مضمون بندی، یا کوئی صنعت ہے، چنانچہ ہر قسم کے نمونے ذیل میں درج ہیں :-

رباعی

اب خواب سے چونک، وقت بیداری ہے
بے زادِ سفر، کوچ کی طیاری ہے
مر مر کے پہنچتے ہیں، مسافر واں تک
یہ قبر کی منزل بھی عجب بھاری ہے

ایضاً

ہموار ہے اگر، تو تجھکو کچھ باک نہیں
سرکش ہو اگر، تو عقل و ادراک نہیں
پاتا نہیں تندخو، کدورت کے سوا
دامن میں ہوا کے کچھ بجز خاک نہیں

رباعی

راہی طرفِ عالمِ بالا ہوں میں
دنیا سے عدم کو جانے والا ہوں میں
یارب ترا نام پاک جپنے کے لئے
گویا اک ہڈیوں کا مالا ہوں میں

ایضاً

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رُخ سب سے پھرا کے مُنہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر
ہم نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

ایضاً

کٹ جاتے ہیں خود رنگ بدلنے والے
کب تھمتے ہیں اشک جو ہیں ڈھلنے والے
اللہ رے سخن کی تیرے تاثیر انیس
رو دیتے ہیں مثلِ شمع، جلنے والے

ایضاً

ہشیار کہ وقت ساز و برگ آیا ہے
ہنگام یخ و برف و تگرگ آیا ہے

محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا   چلئے اب چوبدار مرگ آیا ہے

ایضاً

نافہم سے کب داد سخن لیتا ہوں   دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتا ہوں
چھپتی نہیں بوئے دوستاں یک رنگ   کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

ایضاً

رتبہ جسے دیتا ہے خدا دیتا ہے   وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز، ثنا آپ اپنی   جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

ایضاً

کیا قدر زمیں کی آسماں کے آگے   جھکتے ہیں قوی بھی ناتواں کے آگے
نرمی سے مطیع سنگدل ہوتے ہیں   دنداں صف بستہ ہیں زباں کے آگے

ایضاً

جس شخص کو عقبےٰ کی طلبگاری ہے   دنیا سے ہمیشہ اُسے بیزاری ہے
ایک آنکھ میں کس طرح سمائیں دونوں   غافل! یہ خواب ہے وہ بیداری ہے

ایضاً

کس دن فرس خامہ تگ و دو میں نہیں   مجھ سا بھی سیہ بخت کوئی سو میں نہیں
ہر چند کہ ہوں خسرو اقلیم سخن   پر غیر دوات کچھ قلمرو میں نہیں

ایضاً

جس جا ذکر حسینؑ ہو جاتا ہے   رونے سے دلوں کو چین ہو جاتا ہے
اگر بزم عزائے شہ میں رونا   ہر شخص پہ فرض عین ہو جاتا ہے

ایضاً

جو روضہ میں باریاب ہو جاتا ہے　　ہر کام میں کامیاب ہو جاتا ہے
جلتا ہے جو شب کو قبرِ حیدر پہ چراغ　　وہ صبح کو آفتاب ہو جاتا ہے

اعتراضات

میر انیس کے کمال کا اگرچہ جس قدر مجھکو اعتراف ہے، شاید ہی کسی اور کو ہوگا، تاہم میرا یہ دعویٰ نہیں کہ اُن کا کلام فروگذاشتوں اور غلطیوں سے پاک ہے۔

ہمارے زمانہ میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں، اُن میں باوجود دعویٰ آزادی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا، اور اس کا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رُخ اُس کو دکھائے جائیں، لیکن عذر کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی کر رہے ہیں، جس چیز نے اُن کو اظہارِ حق سے روکا ہے وہ ایشیائی شخص پرستی ہے جس کا اثر رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور عذر کرنے والوں کو خود اس کا احساس نہیں ہوتا، اس نالائقانہ شخص پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ آن اکابر کی تقلید کرتے ہیں اُن میں ہزاروں ایسے ہوتے ہیں، جن کو خود نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی، اس لئے وہ اچھی باتوں کے ساتھ، اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرنے لگتے ہیں، اور سلسلہ در سلسلہ تمام قوم میں اس کا اثر پھیل جاتا ہے۔

بہر حال ہماری رائے ہے کہ جس وسعت اور تفصیل کے ساتھ میر انیس کی خوبیاں ظاہر کی گئی ہیں، اسی طرح نہایت آزادی اور بیباکی کے ساتھ اُن کی ہر قسم کی فروگذاشتیں اور غلطیاں بھی ظاہر کی جائیں۔

ایک زمانہ ہوا عبدالغفور خاں نساخ نے میر انیس کی بہت سی غلطیاں ایک رسالہ میں ظاہر کی تھیں، چنانچہ شروع کتاب میں اس کا ذکر گذر چکا ہے۔ پہلے ہم اِن اعتراضات کو اجمالاً مع جواب کے نقل کرتے ہیں۔

۱۔ میر صاحب نے جابجا سینہ۔ مدینہ۔ کینہ۔ قرینہ۔ کو دانا اور بینا کا قافیہ باندھا ہے۔ مثلاً ؎

حق نما ہے تو جہاں میں ہے یہی آئینہ
اس کا عاشق ہو تو ہوں کور کی آنکھیں بینا

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ قدما کا طریقہ تھا، اور میر انیس کا ابتدائی کلام، قدما کے استعمال کے موافق ہے، اس جواب پر اس قدر اور اضافہ کرنا چاہیئے کہ گو متاخرین نے اس کو ترک کر دیا لیکن کلام کی وسعت کے لئے یہ سختیاں اُٹھا دینی چاہئیں، شاعری سے وصل اور ہجر کے سوا، اور بھی کام لیتے ہیں اور وہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ قافیہ میں وسعت پیدا کی جائے، اور نہ شاید یورپ کی طرح، سرے سے قافیہ سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

۲۔ جن الفاظ میں نون کا اعلان ضرور ہے میر صاحب اکثر جگہ اعلان نہیں کرتے مثلاً ؎

عباسؑ سے یہ کہنے لگے شاہِ دوجہان
تم جا کے اس عرب کو بلالاؤ بھائی جان

اس اعتراض کا بھی یہی جواب ہے۔

۳۔ جہاں نون کا اعلان جائز نہیں، وہاں اعلان کرتے ہیں، مثلاً ؎

لپٹوں گلے سے ہیں پدر ناتوان کے
سینے سے تو سرک تو مرے بابا جان کے

اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ شعر میر صاحب کا ہے ہی نہیں، الحاقی ہے، لیکن میر صاحب کے ہاں کثرت سے اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں، اس لئے یا تو میر صاحب کی غلطی تسلیم کرنی چاہیئے یا یہ کہنا چاہیئے کہ یہ بھی میر صاحب کی توسیعات شعری میں داخل ہے، ؎

۴۔ گویا کہ تھا شبیہ الم سربسر نشان
ڈوبا تھا خوں سے پنجۂ پرنور اور نشان

اس شعر میں سربسر کا قافیہ اور ہے، اور یہ بالکل غلط ہے۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مصرعۂ ثانی اصل میں یوں ہے "ڈوبا تھا خوں میں پنجۂ پرنور زر فشاں"۔

۵۔ اکثر جگہ شایگان قافیے ہیں، چنانچہ نساخ نے بہت سے اس قسم کے شعر نقل کئے ہیں، مجیب نے ان تمام شعروں سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ یوں نہیں بلکہ یوں ہیں، مثلاً اس بند میں ؎

ناگاہ بڑھی فوج، ہوا جنگ کا ساماں   اور گھٹنے لگی طاقتِ جسمِ شہِ مرداں
شہزادے پہ جب پڑنے لگا تیروں کا باراں   تلوار علم کر کے کہا یا شہِ مرداں

شہ مرداں مکرر آیا ہے، مجیب صاحب کہتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں شہ مرداں کے بجائے شہ ذی شاں تھا۔ غلط نویسوں نے ذی شاں کا شہ مرداں بنا دیا، لیکن اس کی تاویلات پر اعتبار کرنا مشکل ہے، اور اگر اس کو وسعت دی جائے تو جہاں جس لفظ پر اعتراض ہو نہایت آسانی سے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یوں نہیں یوں تھا۔ اس شعر میں تو سرے سے اعتراض ہی غلط ہے، کیونکہ شہ مرداں سے ایک جگہ امام حسینؑ اور دوسری جگہ حضرت علیؑ مراد ہیں، اس لیے قافیہ مکرر نہیں، لیکن جہاں واقعی قافیہ شایگان ہے، وہاں بھی تاویل کی ضرورت نہیں۔ جو اساتذہ کثیر الکلام ہیں اور جن کو سیکڑوں قسم کے مضامین ادا کرنے پڑتے ہیں، وہ اس قسم کی قیدوں کی پابندی نہیں کرتے۔

۴۔ اکثر جگہ حروف تقطیع میں گر جاتے ہیں۔ مثلاً

ع   رانڈ ہوتی ہے اک رات کی بیاہی ہوئی دختر،

ع   یہ کہہ کے بس عورات نے عریاں کیے سر،

ع   بانہیں جو گلے میں تھیں تو سینہ و پارۂ خونبار،

ان اعتراضات کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ سب کاتبوں کی غلطی ہے، پہلا مصرع یوں ہے۔

ع   بیوہ ہوئی اک رات کی بیاہی ہوئی دختر،

اسی طرح اور مصرعوں کو بدلا ہے۔

حرفوں کا تقطیع میں گرانا، اگرچہ واقعی ناگوار معلوم ہوتا ہے، لیکن اساتذہ کے ہاں کثرت سے اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں ؎

عزت شیرازی

مرا چند خردمنداں بحال خود نمی آرد　　بایں افسانہا مجنونِ عشق عاقل نمیگردد

عاقل　　ناتوانی تختہ، بندِ یک مقام عاقل مباش

علی　اے رگِ جاں بہار ایں ہمہ سرخی چیست　　خاک از مقدم تو خوں شدن عادت دارد

غنی　　تن گل عارض گل، بدن گل، چہرہ گل، رخسار گل،

بدہ ساقی آں آب یاقوت را　　کہ سازم علاج عقل فرتوت را

اِن کے سوا اور بہت سی مثالیں ہیں، جن کو تطویل کے لحاظ سے قلم انداز کیا گیا۔

۷۔ ع ناگاہ بجا فوج عدو میں طبل جنگ،

ہو مغفرت خلیق کی یا ربِ ذوالکرام،

طبل متحرک الاوسط صحیح نہیں، اور ذوالکرام مہمل لفظ ہے۔ مجیب صاحب کہتے ہیں کہ اصل میں طبل کے بجائے دہل، اور ذوالکرام کے بجائے یا خالق الانام ہے۔

۸۔ ع تھا زیر زرہ گاؤ سر اس طرح کا بکتر،

اعتراض۔ بکتر گاؤ سر نہیں ہوتا۔

جواب۔ اصل میں یوں تھا ع۔ پہنے ہوئے زیر زرہ اس طرح کا بکتر،

٩ ۔ آترا یہ سخن کہہ کے وہ کونین کا عالی ۔ "کونین کا عالی" غلط ہے۔
جواب ۔ اصل میں عالی کے بجائے والی ہے
١٠ ۔ رنگ رُخ کفار رعب ہو گیا فق سے ۔ رنگ فق سے ہو گیا محاورہ نہیں،

اس کا جواب یہ دیا ہے کہ میر انیس جو کچھ کہہ دیں وہی محاورہ ہے ۔
١١ ۔ شتر مندرہ زمانہ سے گئے وایل و سحبان ۔ وائل کوئی فصیح نہیں گذرا
جواب ۔ اصل یوں ہے ۔ وعیل و سحبان ۔
اِن اعتراضات کے علاوہ، نساخ نے اور بھی بہت سے اعتراض کئے ہیں ۔ لیکن چونکہ وہ صحیح نہ تھے، قلم انداز کئے گئے، نساخ نے بہت سے صحیح اعتراضات چھوڑ بھی دیے، اُن کی تفصیل ذیل میں ہے ۔

بُت توڑ کے کعبہ کو صفا کر دیا کس نے	"صاف کر دیا" چاہیے ۔
برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی،	پروانگی غلط ہے ۔
جو حرف قرآں کا ہے وہ ہے لائق تعظیم	قرآن بروزن فعلان ہے ۔
ایسا بھی کوئی بیکس و بے آس رہوگا،	بے آس کا عطف بیکس پر جائز نہیں،
گرتے تھے طیوراں ہوا کھوئے ہوئے	طیور ۔ خود جمع ہے، اسکی جمع الجمع نہ صحیح ہے نہ مستعمل ۔
جو خوبیاں کہ چاہئیں وہ سب حصول ہیں،	حصول کے بجائے حاصل چاہیے ۔

کشتی نہیں پانی کی سلامت رہیں عباس	کشتی انفار اور اراذل کی زبان ہے۔
واللہ اُس سے زورِ عیاں لاتعد ہوا	قتل اس کے ہاتھ سے عمرِ عبدود ہوا
عبدود، لاتعد کا قافیہ نہیں ہوسکتا،	
کرّار ہے وہ شخص نہ غیر فرار ہے،	فرار بہ تشدید را چاہیے۔
عالم کی تغیری پہ بحالی کی ہے آمد،	تغیری صحیح نہیں۔
مت روکنا ہے خاطر مہمان واجبات،	واجبات سے، یا واجب چاہیے۔
اس مژدہ کو سنتے ہی خوشی ہوگئی غیریں،	خوش چاہیے۔

اس قسم کی اور بہت سی غلطیاں ہیں، اور غلط نویسی کا عذر ہر جگہ کام نہیں آسکتا حقیقت یہ ہے کہ میر انیس کے کلام میں اس قسم کی غلطیاں ضرور موجود ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جس قدر قادر الکلام اور پرگو شعرا گذرے ہیں سب کی یہی حالت ہے، فردوسی سے بڑھ کر کون قادر الکلام ہوگا، متاخرین میں قاآنی کا جواب نہیں، ان دونوں کے کلام میں اس قسم کی بے اعتدالیاں کثرت سے موجود ہیں، لوگ، اُن شعرا کو نمونہ بناتے ہیں جنکی شاعری کا دائرہ چند عشقیہ خیالات تک محدود ہے۔ لیکن جو شخص سیکڑوں قسم کے مختلف واقعات کو شعر میں ادا کرنا چاہتا ہے، اُن مسامحات سے کیونکر بچ سکتا ہے، اس لئے قادر الکلام شعرا کو اس جرم سے بری رکھنا

چاہیئے۔

لفظی غلطیوں کے سوا معنوی حیثیت سے بھی بہت سی باتیں قابل اعتراض ہیں، جنکی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) اکثر جگہ مصرعوں میں باہم ربط نہیں ہوتا، اور صاف نظر آتا ہے کہ دوسرا مصرعہ برجستہ نکل آیا تھا، اس کے لئے زبردستی قافیہ اور ردیف کی رعایت سے اوپر کا مصرع پیوند کیا ہے، مثلاً ؎

سر پر کہیں ہوئے ہیں سنجی سے ونی کہیں ۔۔۔ بوڑی کہیں تھی ٹوانا کہیں تھی، انی کہیں

سمجھو نہ دور آنکھ ملانے کی دیر ہے ۔۔۔ پتلی ہے چشم میں کہ ترائی میں شیر ہے

بے مثل تھی شرف میں اصالت میں نیک تھی ۔۔۔ ملجاتیں دو ز بانیں جو اسکو تو ایک تھی

خواہاں تھے زیب گلشن زہرا جو آپ کے ۔۔۔ شبنم نے بھر دئے تھے کٹورے گلاب کے

ہالے تھے دو ملے ہوئے گھوڑوں کی گشت سے ۔۔۔ خاک آسماں پہ جاتی تھی اڑ اڑ کے دشت سے

ہر بات میں شکست ظفر نیک بات میں ۔۔۔ بات آڑ کے جا پڑا کئی ہات ایک ہات میں

اس قسم کے سیکڑوں اشعار ہیں ۔

(۲) اکثر جگہ لفظی رعایت کی پابندی کی وجہ سے کلام ، اچھا اور بے اثر ہو جاتا ہے ۔ مثلاً حضرت امام حسین علیہ السّلام کا تمہیدی فقرہ سن کر تمام لشکر میں جب سنّاٹا چھا گیا ہے تو اس موقع پر لکھتے ہیں ؎

یہ صدا سنتے ہی خود رک گیا قرنا کا خروش تھم گیا طبل وغا کی بھی وہ آواز کا جوش
ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش کیا بجاتے کہ بجا تھے نہ کسی شخص کے ہوش
چھیڑنا ان کو سرودوں کا بھی ناساز ہوا
رعب فرزند نبیؐ سرمۂ آواز ہوا

پہلے تین مصرعوں میں رعب اور ہیبت کا جو اثر پیدا ہوا ، "بجانا" "سرود" "ناساز" کی ضلع جگت نے اس کو بالکل زائل کر دیا ،

یا مثلاً اس دعا میں ؎

اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری
بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گزاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرت باری
پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری

نخل ، برومند ، باری ، پھل ، ریاضت ، کا التزام یہ اثر پیدا کرتا ہے کہ دعا مانگنے والے کا دل ، خضوع ، خشوع سے زیادہ لفظی رعایتوں میں لگا ہوا ہے ۔

یا مثلاً ان اشعار میں نہایت مبتذل طریقہ سے لفظی رعایت کو صرف

کیا ہے۔

ع بولے نہنگ، خوب نہیں یہ اگر مگر

ع سایہ کنوئیں میں اُترا تھا پانی کی چاہ سے،

ع اب ہات دستیاب نہ تجھے منہ چھپانے کو،

ع آری جو ہوگئی تھیں وہ سب ذوالفقار سے،

کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے

شجرِ قامتِ سرور پہ جو ڈالے گا نظر سر چڑھیگا ترا برچھی پہ یہ ہے اُسکا ثمر
اُلفتِ زلف سے بھی پیچ میں پڑ جائے گا
خالِ رخ دیکھا تو تو خاک سے لگ جائیگا
بدرِ پیشانیٔ سرور کا جو ہے سر میں خیال تو اسی راہ میں نقصاں ترا ہوئیگا کمال
سب میں ہوجائیگا انگشت نما شکلِ ہلال تیر و شمشیر ہے ابرو کی محبت کا وبال
عشقِ رخسار میں رتبہ ترا گھٹ جائے گا
منہ پہ کہتا ہوں کہ چہرہ ترا کٹ جائیگا
پانوں پہ وہ ہیں کہ ان پانوں کو جو ہات لگائے تو سرِ دست سرافرازی کو نیں کو پائے

ابن سعد مرحوم کا ہے

اِس قسم کی تکلف کی ہزاروں مثالیں ہیں۔

ان تکلفات کی وجہ سے اکثر جگہ بلاغت کا سر رشتہ بالکل ہاتھ سے جاتا رہتا ہے، مثلاً صغریٰ کو جب حضرت امام حسین علیہ السّلام، سفر میں ساتھ نہیں لیجانا چاہتے، اور اُن کی بیماری کا عذر کرتے ہیں تو وہ کہتی ہیں،

کہ کیا گھر پر تمہارے رہنے اور رونے پیٹنے سے میں اچھی ہو جاؤں گی، اس موقعہ پر لکھتے ہیں۔

ع غم کھانے سے آجائیگی قوت مرے تن میں ہ

ان تمام اعتراضات کا صرف یہ جواب ہے کہ لفظی رعایت کی پابندی کے سوا جو لکھنؤ کا خمیر بن گیا تھا، باقی عیوب لازمۂ انسانی ہیں، اور کسی بشر کا کلام ان سے پاک نہیں ہو سکتا۔

سرقات

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ میر انیس اور (مرزا دبیر) کے بہت سے اشعار پر سرقہ کا گمان ہو سکتا ہے، کیونکہ وہی مضامین بعینہ یا بخفیف تغیر اساتذہ کے ہاں پائے جاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سب پر سرقہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اساتذہ کا قاعدہ ہے، جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایک مضمون کسی متقدم شاعر نے باندھا، لیکن اچھی طرح نہیں بندھ سکا یا اس پر ترقی ممکن ہے تو وہ دانستہ اسی مضمون کو لے کر اس طرح ادا کرتے ہیں کہ جو کسر تھی نکل جاتی ہے، اور شعر بلند رتبہ ہو جاتا ہے، فردوسی نے خیمہ کی تعریف لکھی تھی ؎

یکے خیمۂ داشت افراسیاب ز مشرق بہ مغرب کشیدہ طناب

نظامی نے دیکھا کہ مبالغہ اچھا ہے لیکن کوئی ثبوت نہیں، انھوں

نے ایک تشبیہ پیدا کر کے ثبوت دے دیا ؎

یکے خیمہ داشت چوں آفتاب   زمشرق بہ مغرب کشیدہ طناب

آفتاب کی تشبیہ نے مشرق سے مغرب تک طنابوں کا کھنچا ہونا ثابت کر دیا کیونکہ آفتاب خیمہ سے اور اس کی کرنیں طناب سے مشابہ ہیں۔

سعدی کا شعر تھا ؎

ترا ہر آئینہ باید بہ شہر دیگر رفت

کہ دل نماند دریں شہر تا ربائی باز

شہر کے شہر کا دل چھین لینا معشوق کا کمال ہے، لیکن معشوق کو یہ صلاح دینی کہ وہ کسی اور شہر کو چلا جائے لغویات ہے، اس لئے امیر خسرو نے اس کا چارۂ کار یہ بتایا ؎

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی   مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

سلمان ساوجی کا شعر تھا ؎

شاہد آں نیست کہ دارد خطِ سبز و لبِ لعل

شاہد آں است کہ ایں دارد و آنے دارد

خواجہ حافظ نے اس کو مطلع کر کے بلند کر دیا ؎

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد

بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

سلمان کے شعر میں ایں و آں کا جو لطف تھا وہ اچھی طرح ادا نہ ہو سکا

تھا، کیونکہ آن میں نون باعلان ہے، اس لئے آں (جو ایں کا مقابل ہے) کا ایہام نہیں ہوتا۔ خواجہ حافظ نے اس نقص کو یوں پورا کیا ؎

ایں کہ می گویند آں بہتر ز حسن　　یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

صاف نظر آتا ہے کہ ان لوگوں نے دیکھا کہ ایک عمدہ بات پیدا ہوئی تھی لیکن ناقص رہ گئی، ایک چیز کو ناقص چھوڑ دینا اچھا نہ تھا اس کو پورا کر دیا، اگر اس کا نام سرقہ ہے اور یہ معیوب ہے تو دنیا میں ہر قسم کی صنعتیں جو ایجاد ہوئیں وہ اسی پہلی حالت پر قائم رہنی چاہیئے تھیں چھکڑے کے بجائے فٹن اور بروم طیار کرنا بھی سرقہ قرار پاتا۔

میر انیس صاحب کے ہاں جو سرقے پائے جاتے ہیں اکثر اسی قسم کے ہیں۔

مثلاً حضرت امام حسین علیہ السّلام نے جب یزید کی فوج کے سامنے اتمام حجّت کے طور پر جناب رسالتؐ پناہ سے اپنا تعلق ثابت کیا ہے تو یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس وقت میرے بدن پر جو اسلحہ اور ملبوسات ہیں وہ آنحضرتؐ کے ملبوسات ہیں۔ اس مضمون کو میر ضمیر نے اس طرح ادا کیا تھا ؎

پہچانتے ہو کس کی مرے سر پہ ہے دستار　　دیکھو تو عبا کس کی ہے کاندھے پہ نمودار
یہ کس کی زرہ کس کی سپر کس کی ہے تلوار　　میں جس پہ سوار آیا ہوں کس کا ہے یہ رہوار
باندھا ہے کمر میں جسے یہ کس کی ردا ہے
کیا فاطمۂ زہرا نے نہیں اس کو سیا ہے؟

یہ واقعہ مرثیہ کا ایک ضروری جزو تھا، اس لئے میر انیس صاحب اس کو بالکل چھوڑ نہیں سکتے تھے، لیکن دیکھو، اسی بات کو کیونکر ادا کیا ہے

یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار　　یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جو ہیں سینہ فگار
بر میں کس کا ہے یہ چار آئینہ جوہر دار　　کس کا رہوار ہے یہ آج ہیں جس پر ہوں سوار
کس کا یہ خود ہے یہ تیغ دو سر کس کی ہے
کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کی ہے

میر ضمیر

چھلک کہ ذوالفقار نے کاٹے نہ تین پر　　ہرگز نہ دم لیا پر روح الامین پر

میر انیس

خیبر میں کیا گذر گئی روح الامین پر　　کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر

میر ضمیر

اس نیزۂ سیاہ سے تھا سب کو بیم جاں　　تھا اژدہائے موسی عمراں کی وہ زباں

میر انیس

ع　　گویا زباں نکالے ہوئے اژدہا چلا

میر ضمیر

اک نیزہ ہوا پار دو سو سو کے جگر سے　　رشتہ کا گذر ہوتا ہے جوں سلک گہر سے

میر انیس

ہوتا تھا پار آ کے وہ ہنگام دار و گیر　　سو دل سے مثل رشتۂ تسبیح ایک تیر

میر ضمیر

کونین میں پکار ہوئی الاماں کی   انساں تو کیا جنوں کو پڑی اپنی جان کی

میر انیس

ع   چلاتی تھیں پریاں کہ خدا جان بچائے

لیکن بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جن میں کسی قسم کی ترقی نہیں ہے بلکہ کسی فارسی شعر کو بعینہ لے لیا ہے، اس قسم کے مضامین کو حسن ظن ہو تو توارد ورنہ سرقہ کہنا چاہیئے، چند مثالیں نمونہ کے طور پر ذیل میں لکھی جاتی ہیں ؎

میر انیس

پیچھے کبھی قافلہ سے رہنا نہ انیس   اے عمر دراز تیری کوتاہی ہے

لا ادری

کوتاہ ہے کہ بود ز عمر دراز بود

میر انیس

عقدے سب حل ہوئے مگر آہ انیس   یہ بند اجل کسی سے کھولا نہ گیا

بو علی سینا

کردم ہمہ مشکلات عالم راحل   ہر بند کشودہ شد مگر بند اجل

میر انیس

نافہ کی طرح عمر خطا میں گذری

بالوں پہ سفیدی ہے سیاہی دل میں

کاتبی

بودیم ہمچو نافہ ہمہ عمر در خطا   موے سفید ہین و درون (دل) سیاہ ما

میرانیس

ہر سمت تھی سناں پہ سناں مثل خارزار   ہر صف میں تھی سپر پہ سپر مثل لالہ زار

نظامی

سناں بر سناں رستہ چوں نوک خار   سپر بر سپر بستہ چوں لالہ زار

میرانیس

خود پیام زندگی لائی قضا میرے لئے   شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

لاحد

چو نفی نفی اثبات است از مردان نمی ترسم   بقای من چو شمع کشتہ باشد در فنای من

میرانیس اور مرزا دبیر کا موازنہ

اُردو علم ادب کی جو تاریخ لکھی جائے گی، اس کا سب سے عجیب تر واقعہ یہ ہوگا کہ مرزا دبیر کو ملک نے میرانیس کا مقابل بنایا اور اس کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ اِن دونوں حریفوں میں ترجیح کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے۔

شاعری کس چیز کا نام ہے؟ کسی چیز کا، کسی واقعہ کا، کسی حالت کا، کسی کیفیت کا اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔

دریا کی روانی، جنگل کی ویرانی، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، پھولوں کی مہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی سختی، گرمی کی تپش، جاڑوں کی ٹھنڈ، صبح کی شگفتگی، شام کی دلاویزی، یا رنج و غم، غیظ و غضب، جوش و محبت، افسوس و حسرت، عیش و طرب، استعجاب و حیرت، ان کا اس طرح بیان کرنا کہ وہی کیفیت دلوں پر چھا جائے، اسی کا نام شاعری ہے۔

اس کے ساتھ الفاظ میں فصاحت، سلاست، روانی، بندش میں چستی اور چستی کے ساتھ بے تکلفی، دلاویزی اور برجستگی، لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارات، اصول بلاغت کے مراعات، ان تمام اوصاف میں سے کون سی چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے۔ فصاحت ان کے کلام کو چھو کبھی نہیں گئی، بندش میں تعقید اور اغلاق، تشبیہات اور استعارات اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں، خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکتے۔

ہماری یہ غرض نہیں کہ ان کے کلام میں سرے سے یہ باتیں پائی ہی نہیں جاتیں۔ وہ نہایت پرگو تھے، ان کے اشعار کا شمار ہزاروں کیا لاکھوں تک ہے، اخیر اخیر میں وہ میر انیس کی تقلید بھی کرنے لگے تھے، اس بنا پر ان کے کلام میں جا بجا شاعری کے لوازم اور محاسن پائے جاتے ہیں، لیکن گفتگو قلت اور کثرت میں ہے۔

میر انیس کے بہت سے اشعار میں فصاحت و بلاغت کا حصہ بہت کم ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دونوں میں سے نسبتاً کس کا کلام شاعری کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ میر انیس کا عیب و ہنر تم دیکھ چکے، اب مرزا صاحب کے متعلق ہم ایک ایک چیز بہ تفصیل لکھتے ہیں۔

فصاحت۔ یہ امر بدیہی ہے کہ مرزا دبیر کے کلام میں وہ فصاحت اور شستگی نہیں جو میر انیس کے کلام میں ہے، اور اس کے مختلف اسباب ہیں۔

(۱) مرزا صاحب اکثر ثقیل اور غریب الفاظ استعمال کرتے ہیں مثلاً

ع مستدعیِ شق القمر آکر ہوئے گمراہ

ہر کوہ کی آواز انا الطور انا الطور

المنتشر کا ہنگامہ ہے اس وقت حشر میں

لبیک و سعدیک تھا وردِ ملک و حور

المنتہیٰ پہ ربط پہ ضبط اس وغا ہیں تھے

خاص الخلاصۂ بنی آدم، کمال ہیں

یارو! سنتا مدائحِ نوشاہ کا بیان

رُخ بتینۂ صدقِ کراماتِ پیمبر

مجمع جمیع فضائل، مالکِ سپہر

مستغرقِ روح اس نے کیا تب غسل و تنسیر

ع لیکر رطب دلو وو م کہنے لگے شاہ
میدانی ونقیب وعصا دار و جو بار
عرشی فلکی پڑھ کے نقیبا نہ پکارے

اس قسم کے سیکڑوں الفاظ ہیں، ہم نے صرف دو تین مرثیوں سے سرسری انتخاب کیا ہے، ورنہ سیکڑوں ہزاروں تک نوبت پہونچتی، یہ الفاظ اگرچہ صحیح ہیں، عربی اور فارسی میں مستعمل ہیں، لیکن اردو نظم کی سلاست اور روانی ان کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

(۳) بعض الفاظ بجائے خود ایسے ثقیل اور گراں نہیں، لیکن مرزا صاحب جن ترکیبوں کے ساتھ ان کو استعمال کرتے ہیں، ان سے نہایت ثقل اور بھدا پن پیدا ہو جاتا ہے، یہ امر ان مثالوں میں صاف واضح ہو جاتا ہے، جہاں ایک ہی لفظ یا الفاظ کو میر و میرزا دونوں نے استعمال کیا ہے۔ ھل اتیٰ، لا فتیٰ، انما، قل کفیٰ، یہ چاروں لفظ حضرت علیؑ کے فضائل کی تلمیحات (الیوژن) ہیں، ان تلمیحات کو ایک ایک بند میں دونوں نے باندھا ہے، مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

اہل عطا میں تاج سر ہل اتیٰ ہیں یہ
اغیار لاف زن ہیں شہ لافتا ہیں یہ
خورشید انور فلک انما ہیں یہ
کافی ہے یہ شرف کہ شہ قل کفیٰ ہیں یہ
ممتاز گو خلیلؑ رسولانِ دیں میں ہیں
کاشف ہے لو کشف یہ زیادہ یقیں میں ہیں

میر انیس کہتے ہیں ؎

حق نے کیا عطا یہ عطا اہل اتقا کسے
حاصل ہوا ہے مرتبہ لا فتا کسے
کونین میں ملا شرف انما کسے
کہتی ہے خلق بادشہ قل کفا کسے

دنیا میں کون منتظم کائنات ہے
کس کو کہا خدا نے کہ یہ میرا ہاتھ ہے

مرزا صاحب کے کلام میں اس قسم کی ناموزونی نہایت کثرت سے ہے، ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں ؎

ع اک شخص کمر خستہ کی لگا باندھنے خورسند

ع اک دلو بھر دو پانی سے اور ایک رطب لو

ع نوبت زن نہ بام عروج فلک پیر

ع ملبوس قلمکار نہ دول ہے نہ پرانا

؎ سر کو عوض پارۂ مدحت میں دھروں گا
شرع کہن ناطقہ منسوخ کروں گا

ع یہ صورت پیغمبر قوسین مکاں ہے ؎

ہے طلعت جلد و نقش سینہ پہ محسوس
وہ برق شفق میں لو یہ پروانہ پہ فانوس

ناگاہ کھلا دشت میں بازار زد و کشت
تیغیں کھچیں یکدست تلے گزر بھی یک مشت

ع نہ چشم جراحت نہ رہ قوت کو دیکھا

ع کہتے ہیں جسے عاشق و شیدا ملک و ناس

خیاط عہد طفلی شاہ انام تھی

اس کی ثنا مشقت مالا یطاق ہے

تا نانے تو قلم کئے جبریل کے سہ پر

ہ کفار پڑھے طیش سے ہونٹوں کو دبا کے

دانتوں کے تلے بال محاسن کے دبا کے

ع آمد ہے امام سوم ہر دو سرا کی

ہ اس سر پہ دھرے ہات بہ قسمیہ اجل ہے

بس ہدیۂ اللہ کے قابل یہی پھل ہے

بندش کی سستی اور ناہمواری۔ میر انیس اور مرزا دبیر میں اصلی جو چیز مابہ الامتیاز ہے، وہ الفاظ کی ترکیب، نشست اور بندش کا فرق ہے، میر انیس کا کلام تم پڑھ چکے ہو، ان کا اصلی جوہر بندش کی چستی، ترکیب کی دلاویزی، الفاظ کا تناسب، اور برجستگی و سلاست ہے، یہ چیزیں مرزا صاحب کے ہاں بہت کم ہیں، ایک ہی مصرعہ میں ایک لفظ نہایت بلند اور شاندار ہے، دوسرا مبتذل اور پست ہے، بند کا ایک شعر اس زور شور کا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل گرجتا آرہا ہے، دوسرا بالکل پھسپھسا اور کم وزن ہے، دو تین بند صاف اور سلیس نکل جاتے ہیں پھر تعقید اور بے ربطی شروع ہوتی ہے، اکثر جگہ الفاظ بڑے دھوم دھام کے ہیں لیکن حاصل کچھ نہیں، یہ باتیں اگرچہ عام طور پر ان کے تمام مرثیوں

ہیں پائی جاتی ہیں لیکن نمونہ کے طور پر ہم چند بند اُن مرثیوں کے نقل کرتے ہیں جو بڑے زور کے مرثیے خیال کئے جاتے ہیں اور جن میں بعض میر انیس کے جواب میں لکھے گئے ہیں ؎

اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے — اے طنطنۂ طبع جزو کل کو ملا دے
اے معجزۂ فکر فصاحت کو جلا دے — اے زمزمۂ نطق بلاغت کو صلہ دے
اے بائے بیاں معنیٔ تسخیر کو حل کر
اے سین سخن قاف سے تا قاف عمل کر

یہ مرثیہ میر انیس کے جواب میں ہے، کس زور شور کی اٹھان ہے، کیسے پُر رعب الفاظ ہیں، لیکن معانی میں بہت کم ربط ہے، طنطنہ کو جزو کل کے ملا دینے سے کیا نسبت ہے؟ زمزمۂ نطق سے بلاغت کا صلہ مانگنے کے کیا معنی؟ بیان کی بے کو تسخیر سے کیا خاص تعلق ہے؟ اسی طرح سخن کے سین کو قاف سے قاف تک عمل کرنے کے لئے کیا خصوصیت ہے، ؎

بولا علم خامہ فلک پر میں گڑوں گا — سکّے نے ندا دی زر انجم پہ پڑوں گا
معنی نے کہا بیت میں آئینہ جڑوں گا — مضمون پکارا میں کسی سے نہ لڑوں گا
بندش یہ کھلی دم میں فصاحت کا بھروں گی
چلائی طبیعت کہ میں اصلاح کروں گی

پہلے دو مصرعے کس قدر دھوم دھام کے ہیں، تیسرے میں تنزل شروع ہوا جو چوتھا بالکل گر گیا، کیونکہ اوپر کے مصرعوں کی مناسبت

کے لحاظ سے موقع یہ تھا کہ اس میں بھی کوئی ایجابی دعویٰ کیا جاتا۔ مضمون کا نہ لڑنا اگرچہ معنیٔ تعریف کی بات ہے، لیکن یہاں لڑائی سے گریز کرنے کا موقع نہیں، اخیر کا شعر اور خصوصاً اس کا دوسرا مصرع کس قدر پھس پھسا اور مبتذل ہے، طبیعت کے چلانے کا یہ کیا موقع ہے اور طبیعت کے لیے چلانا کتنا ناموزوں لفظ ہے ؎

میں کون ہوں صاحب علم کلک جہانگیر نوبت زن نہ بام عروج فلک پیر
تاج سرِ لفظ و سخن و معنی و تحریر خاک قدم محتشم و مقبل شبیر

سن کر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے
انصاف تو کہتا ہے خداوند یوں ہی ہے

پہلے تین مصرعوں کا جو انداز ہے، چوتھا مصرع اس سے کس قدر بیگانہ ہے؟ ؎

مضموں میں نئی کرتا ہوں ایجاد ہمیشہ کہتا ہے سخن حضرت استاد ہمیشہ
کہنے میں ہے تاثیر خداداد ہمیشہ بھولے سے بتا دوں تو رہے یاد ہمیشہ

بے لطف خدا یہ ہمہ دانی نہیں آتی
پر شمع صفت چرب زبانی نہیں آتی

جو چیز خداداد ہے اس کے لئے ہمیشہ کی قید حشو محض ہے، چوتھا مصرع تیسرے مصرع سے بالکل بے تعلق ہے، استادی کا ذکر دوسرے مصرع میں ہے، اور اس کے ساتھ اس مصرع کو ربط ہو سکتا ہے، ٹیپ کے دو مصرع بھی باہم بالکل بے تعلق ہیں۔

تین چار بند کے بعد فرماتے ہیں ؎

مضمون تر و تازہ ہے جتنی ہیں یگانا   ملبوس قلمکار، نہ دون ہے نہ پُرانا
اس دھیان کے آنے سے کرم شاہ کا جانا   خدّام ولا بولے کہ ہاں ہات بڑھانا

لے ہاریۂ تاسید قدیر ازلی ہے
لے خلعت تحسین حسینؑ ابن علیؑ ہے

پہلے اور دوسرے شعر کی ترکیب اور انداز میں باہم کس قدر تفاوت ہے، دوسرا شعر پہلے شعر سے بالکل الگ ہو گیا ہے، دوسرے شعر کی بندش ایسی ہے کہ مطلب کبھی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا، اس دھیان کا مشارٌالیہ کون ہے ؎

حامی جو سلیمانِ دو عالم نظر آئے   مضمون جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کر آئے
طاؤسِ تصور کی طرح دل میں در آئے   شیشہ میں پری زاد معانی اُتر آئے

یاقوت بدخشاں سے دُر آتے ہیں عدن سے
لعل اُگلوں گا میں طائر سدرہ کے دہن سے

حضرت سلیمان کو عنقا سے کیا تعلق ہے، تصوّر کی تشبیہ طاؤس سے کس بنا پر ہے، اور پھر اس کے کیا معنی کہ عنقائے مضمون دل میں اس طرح اُتر آئے جس طرح طاؤسِ تصوّر دل میں اُتر آتا ہے، طاؤس دل میں نہیں اُترتا، اور اگر تصوّر کے طاؤس ہونے کی بنا پر ہے، تو مضمون کا عنقا خود دل میں اُتر سکتا ہے، طاؤس کی مشابہت کی کیا ضرورت ہے، ٹیپ میں عجب بے ربطی ہے، شاعر لعل اُگلے گا لیکن طائر

سدرہ کے دہن سے اُگلے گا، اس کے کیا معنی؟ شاید اُگلنے کو اُگلوانے
کے معنی میں لیا ہے، یا اپنے آپ کو طائر سدرہ قرار دیا ہے ؎

کب شعلۂ حسن نور کی قندیل کو پہونچے ۔۔۔ اڑ کر نہ مگس طنطنۂ فیل کو پہونچے
پشہ کا نہ غل صور سرافیل کو پہونچے ۔۔۔ بلبل نہ لب و لہجۂ جبریل کو پہونچے

ارباب سخن پر جو سخن ور ہے ہمارا
القاب سخن سنج سخن ور ہے ہمارا

کس قدر بھدے الفاظ اور بھدّی ترکیبیں ہیں۔ اس کے علاوہ
بے ربطی کو دیکھو، شعلہ کا مقابلہ قندیل سے نہیں بلکہ قندیل کی روشنی
سے ہو سکتا ہے، پرواز کو طنطنہ سے کیا نسبت ہے؟ بلبل کو جبریل
سے کیا مناسبت ہے، لقب کے بجائے القاب باندھا ہے ؎

سرکار ہے ہر مجلس شبیر ہماری ۔۔۔ مضموں کی طرح بیت ہے جاگیر ہماری
آئینہ سکندر پہ ہے تسخیر ہماری ۔۔۔ ہے مہر سلیمان کی تحریر ہماری

تنہا مہ و ماہی پہ نہیں سکہ پڑا ہے
سورج کا نگینہ بھی انگوٹھی پہ جڑا ہے

بیت کا درجہ مضمون سے کم ہے، کیونکہ بیت کی جو خوبی ہے مضمون
ہی کی وجہ سے ہے، اس بنا پر یہ تشبیہ کہ مضمون کی طرح بیت ہماری جاگیر
ہے بے معنی ہے۔ جب مضمون جاگیر ہو چکا تو بیت خود ہی جاگیر
ہو گئی۔ ٹیپ کا آخر مصرع بالکل بے معنی ہے، پہلے انگوٹھی سے
کسی چیز کا استعارہ کرتا تھا پھر سورج کا نگینہ جڑتا تھا، ورنہ ظاہر

ہے کہ ہاتھ میں پہننے کی انگوٹھی پر سورج کا نگینہ جڑنا کس قدر لغویات ہے۔ سہ

قابل ہیں سخن کے ہوں سخن ہو مرے قابل   لیکن سخن شہرہ فگن ہے مرے قابل
رضوان کو جنت یہ چمن ہے مرے قابل   موتی کو صدف اور یہ عدن ہو مرے قابل

شہرہ ہے یہ تا بید رشہ جن و ملک سے
مضمون مرا گھر پوچھتے آتے ہیں فلک سے

سخن شہرہ فگن نئی ترکیب ہے،

ع   رضوان کو جنت یہ چمن ہے مرے قابل،

ناموزوں ترکیب ہے، یا تو یوں ہونا چاہئے تھا کہ رضوان کو جنت چاہیئے اور مجھ کو یہ چمن، یا یوں کہنا تھا کہ رضواں کے قابل جنت ہے، اور میرے قابل یہ چمن، چوتھے مصرع کی ترکیب کا بھی یہی حال ہے، ٹیپ کے دونوں مصرع قریبًا باہم متناقض ہیں، شہرہ بھی انتہا کا ہے، اور مضمون کو گھر پوچھنے کی بھی ضرورت ہے، شاید یہ مراد ہو کہ صرف نام مشہور ہو چکا ہے لیکن چونکہ مضامین کو کبھی مرزا صاحب سے روشناسی نہیں ہوئی اور آستانۂ مبارک تک پہونچنے کی نوبت نہیں آئی، اسلئے گھر کا پتہ پوچھنا پڑا۔ سہ

ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی   ہاں قلزم شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی
ہر بحر میں ہے بحر طبیعت کی روانی   ہے زور سخن شور یہ موجوں کی زبانی

قطرہ سے مگر بحث میں ہیں حرف نہیں ہوں

دریا ہوں سخن کا بہ تنک ظرف نہیں ہوں

تیسرے مصرع کا مطلب مشکل سے سمجھ میں آسکتا ہے، مقصد یہ ہے کہ زور سخن شور پر ہے، لیکن اس بات کو یوں نہیں کہتا بلکہ سوچ کی زبان کہتی ہے، بخشتہ یں مرف ہونا کون سا محاورہ ہے، ٹیپ کے دوسرے مصرع میں "میں" کا لفظ محض فضول ہے، پہلے مصرع میں "میں" کا لفظ آچکا ہے ؎

خاصہ ہے فروتنی مرا افراد ادب ہے
جھک کر نہ سر انا اور بچا ملتے ہیں سب سے
نخوت کے معانی ہیں الگ لفظ تکلف سے
جس طرح سے ید اصل جدا نیک نسب سے

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو
مانند غبار اٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو

پہلے مصرع میں خاکساری اور انکساری کے بجائے ادب کہا ہے، حالانکہ دونوں میں بہت فرق ہے، تیسرے مصرع کی ترکیب اور لفظ کے لب کا استعارہ سابق ولاحق کی سادگی و صفائی سے نہایت بیگانہ ہے ؎

شیریں سخنی کا ہنر اکسیر سے لیا ہے
اس قوزہ میں سب جوہر حیلنی کی فمیا ہے
بہری افلاک سے گو خاک بسر ہوں
ہاں عیب بڑا یہ ہے کہ میں اہل ہنر ہوں

گو خاک بسر ہوں کا جواب، ہاں عیب بڑا یہ ہے کس قدر بے جوڑ ہے، "میں" کا لفظ بالکل حشو ہے۔

مرزا صاحب کا ایک اور نہایت مشہور مرثیہ ہے ؎

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے　　رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا جگر زیرِ کفن کانپ رہا ہے　　خود عرش خداوندِ زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو
جبریلؑ لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

ہیبت سے ہیں نہ قلعۂ افلاک کے در بند　　جلاد فلک بھی نظر آتا ہے نظر بند
وا ہے کمرِ چرخ سے جوزا کا کمر بند　　سیارے ہیں غلطاں صفتِ طائرِ پربند
انگشتِ عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے
خورشید کے پنجے سے علم چھوٹ پڑا ہے

یہ دونوں بند اپنے انداز میں پورے ہیں، اب تیسرا بند ملاحظہ ہو ؎

خود فتنہ و شر پڑھ رہے ہیں فاتحۂ خیر　　کہتے ہیں انا العبد لرز کر صنم و دیر
جاں غیر، بدن غیر، مکیں غیر، مکاں غیر　　نے چرخ کا ہے چرخ نہ سیارہ کی ہے سیر
سکتے میں فلک خوف سے مانندِ زمیں ہے
جز بختِ یزید اب کوئی گردش میں نہیں ہے

انا العبد کس قدر سلاست کے خلاف ہے، یہ مصرع

ع　جاں غیر، بدن غیر، مکیں غیر، مکاں غیر

اس بند میں کس قدر بیگانہ واقع ہوا ہے، ؎

بیہوش ہے بجلی پہ سمندراں کا ہے ہشیار　　خوابیدہ ہیں سب طالعِ عباسؑ ہے بیدار

پوشیدہ ہے خورشید علم ان کا نمودار — بے نور ہے منہ چاند کا رخ انکا ضیا بار
سب جزو ہیں، کل رتبہ میں کہلاتے ہیں عباسؑ
کو ہیں پیادہ ہے سوار آتے ہیں عباسؑ

یہ بند اوپر کے بند سے دفعتاً اس قدر بے تعلق ہو گیا ہے کہ مطلب سمجھنا مشکل ہے، "ان" کا مشارٌ الیہ حضرت عباسؑ ہیں، لیکن چونکہ حضرت عباسؑ کا ذکر صرف پہلے بندوں میں آیا تھا جس سے تین بندوں کا فاصلہ ہے، اس لئے ذہن اس طرف جلدی منتقل نہیں ہوتا، مضمون کی بے ربطی کی یہ کیفیت ہے کہ ایک طرف تو ہل چل کی وجہ سے بجلی کو بیہوش قرار دیا ہے، دوسری طرف فرماتے ہیں کہ سب خود پیادہ ہیں! ٹیپ کی بندش کی سستی خود ظاہر ہے ؎

چمکا کے مہ و خور زر و نقرہ کے عصا کو — سر کاٹتے ہیں پیر فلک پشت دوتا کو
عدل آگے بڑھا، حکم یہ دیتا ہے قضا کو — ہاں باندھ لے ظلم و ستم و جور و جفا کو
گھر لوٹ لے بغض و حسد و کذب و ریا کا
سر کاٹ لے حرص و طمع و مکر و دغا کا

ان استعارات میں جو لطافت ہے وہ ظاہر ہے،

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ایک مشہور اور معرکہ کے مرثیہ کے متعدد بند اس موقع پر نقل کر دیں جس سے مرزا صاحب کی طرز بندش کے تمام محاسن و معائب کا پورا اندازہ ہو سکے۔ یہ مرثیہ وہ ہے جس کو مرزا صاحب کے نامور معتقدین اکثر مجالس میں بڑے فخر کے ساتھ پڑھتے

ہیں سہ

پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی　　پانی ہے کس پھریرے سے ہمت سحاب کی
یہ شان ہے نشانِ رسالت مآبؐ کی　　چوبِ علم کلید ہے جنت کے باب کی
نقشہ علم کے پنجہ میں اللہ کا ملا
بندوں کو اس نشاں سے نشانِ خدا ملا

صبحِ جہادِ شاہِ ثریا جناب ہے　　فوجِ حسینؑ بن کے ظفر ہمرکاب ہے
مشرق سے واں علم یہ علم آفتاب ہے　　ہاں نور کا نشانِ علم بوترابؑ ہے
روشن علم سے آئینۂ مشرقین ہے
مشرق میں شمس، عکس نشانِ حسینؑ ہے

طوبیٰ کی شاخ تیشۂ قدرت نے کی قلم　　اور نورِ نخل طور بھرا اس میں یک قلم
کی صادقوں کی راستیِ قول اس میں ضم　　بے پردہ ہو کے عضوِ نبیؐ پوششِ علم
جب بادلہ کہ پھریرے کو سیاہ علم کیا
صانع نے پردہ میں ید طولیٰ علم کیا

دامن ہے کبریا کا سرا پردۂ جلال　　ماہی مراتب اس سے ہے شاہوں کا پائمال
پنجہ اٹھا ہے شیر پھریرے کا بے جدال　　شیر فلک کو دیکھ کے ہوتا ہے لال لال
تسخیر غرب و شرق اسے کیا محال ہے
پنجہ سے آفتاب تو ناخن ہلال ہے

نورِ خدا سے قالبِ خیر الامم بنا　　سایہ نبیؐ کا ہو کے مجسّم علم بنا
واں ابرِ چتر فرقِ نبیؐ پہ قدم بنا　　ہاں پوششِ علم وہ سحابِ کرم بنا

سب کام بند ہوں، جو بچھڑ پیرانہ وا رہے
سچ ہے خدا کے فیض کا چشمہ کھلا رہے

اب رایت زبان سے مضمون علم کروں اور معنی بلند کا لشکر بہم کروں
مجلس میں ذکر شقّۂ حالِ علم کروں رایت میں سلک نظم کے پرچم کو ضم کروں
مشتاقوں کو زیارتِ رایت ضرور ہے
اس رایتِ نبیؐ کی درایت ضرور ہے

جب شاہ انبیا کو ہوئی خواہشِ علم آئی ندا فلک سے ابھی بھیجتے ہیں ہم
جاری ہوا یہ حکم خداوندِ محترم ہاں قدسیو! علم کی درستی کرو بہم
تیار میرے دوست کی خاطر نشاں کرو
یعنی علم کی تکمہ سے خاطر نشاں کرو

تعقید | مرزا صاحب کے کلام کی ایک خصوصیت تعقید بھی ہے، وہ جہاں معنی آفرینی اور دقّت پسندی پر زیادہ توجہ کرتے ہیں کلام میں پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے، وہ نہایت دقیق اور بلند مضامین پیدا کرتے ہیں، لیکن مناسب الفاظ ہات نہیں آتے اس لئے مضمون ایک گورکھ دھندا ہو کر رہ جاتا ہے۔

تلوار کی تعریف

بدنگہ چشم نیام اوج پر آیا، اور صاف ہر اک فردِ بشر کو نظر آیا
خط کھینچ کو کلک دواتِ ظفر آیا یا دوڑ کے ظلمت کی گلی سے خضر آیا
واں شور تھا پیدا مہ نو سے مہ نو ہے

یاں غل تھا جدا شمع سے یہ شمع کی لو ہے

آمد کی دھوم

خود ابرِ فلک گردِ سواری میں گھرے ہیں — دریا میں عدو ڈوب کے دوزخ میں ترے ہیں
یوں کانپ کے سردار و نکے منہ رنگ پھرے ہیں — بت حرص کے طاقِ دلِ اعدا سے گرے ہیں

رعشہ ہے فقط، ہات نہیں پاؤں نہیں ہے
دہشت کے سبب دھوپ نہیں چھاؤں نہیں ہے

سراپا

معراج پیمبر کی تو روشن ہے حقیقت — یاں دیکھو تو عرش جبیں چشم کی زینت
اترا ہے نبیؐ کے لیے یہ کاسۂ نعمت — ہم صحبت وہم کاسہ ہیں معبود سے حضرت

اس کاسہ میں رتبہ ہے یہ پلکوں کی ثنا کا
اک ہات نبیؐ کا ہے اور اک ہات خدا کا

اب مومنوں کو عالمِ بالا کی خبر دوں — حل عقدۂ طرح سرِ اقدس کو بھی کر دوں
گردوں کو میں نسبت سرِ پُرنور سے گر دوں — یہ عرش ہو اور عرش بنے رشک سے گردوں

اک قامتِ احمدؐ ہے، اسی فوق جہاں پر
خورشید سے اک نیزہ سوا ہوگا سناں پر

گو غنچہ ہے گوشِ پسرِ سید خوش خو — قربِ ختنِ زلف سے پر نافے کی ہے بو
اور حلقۂ گیسو کہ ہے اک نافۂ آہو — ہے کان کی نکہت سے رگِ غنچہ ہر اک مو

نافہ کا شرف غنچہ کو کاکل نے دیا ہے
اور گوش کے نافہ کو یہاں غنچہ کیا ہے

خطِ حسن کی خاطر ہے خزاں کا خطِ فرماں ۔ یاں حلقۂ خطِ حسن کو ہے چشم نگہباں
صرصر سے ہے ایمن یہ چراغِ رُخِ تاباں ۔ عارض کو کیا خط نے چراغِ تہِ داماں
گلشن سے ہے غلط اور غلط ابرِ بہاری
رُخ باغِ بہاری ہے یہ خط ابرِ بہاری

ایک اور مرثیہ میں فرماتے ہیں ؂

نامِ جبیں ہے مشرقِ خورشیدِ پُر اُمید ۔ یاں پھول سرو کو ملیں پھل ہو نصیب بید
ہے صبحِ صادق اُسکی گواہی سے روسپید ۔ مہرِ قبول کے اثرِ سجدہ سے نو پدید
اکبر نشانِ سجدہ جبیں پر دکھاتے ہیں
یا سرنوشتِ نیّرِ اکبر دکھاتے ہیں

کیا شاہ بیتِ ابروئے اکبر کی ہو ثنا ۔ یکتا مطالعہ میں ہے ہر مطلعِ رسا
بیت القصیدۂ رُخِ ابروئے مصطفےٰ ۔ کیا بیت بحثی ان سے کرے ماہِ نو بھلا
پیشِ نگہ یہ بیت ہے اٹھارہ سال سے
آئی ہے بوئے شیرِ ویلان ہلال سے

تشبیہات و استعارات

مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات اور استعارات ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی قوّتِ آفرینی سے ایسے عجیب اور نادر تشبیہات اور استعارات پیدا کرتے ہیں جن کی طرف کبھی کسی کا خیال

منتقل نہیں ہوا ہوگا، لیکن اس زور میں وہ اکثر اس قدر بلند اڑتے ہیں کہ بالکل غائب ہو جاتے ہیں مثلاً ؎

شمشیر نے جل تھل جو بھرے قاف سے تا قاف — پریاں ہوئیں مرغابیاں گرداب بنا قاف
چھپنے کیلئے خوف سے اس درجہ گھٹا قاف — جو بیچ میں سیمرغ کی منقار کے تھا قاف

کیا جانے کدھر کے خزانہ وہ بہا تھا
قارون کو عذابِ ابدی ڈھونڈ رہا تھا

تیغ عباس جو دامانِ زرہ میں تھی نہاں — یا شبستاں میں وہ خوابیدہ تھا مارِ دوزباں
چمکا وہ ہلال ابروئے یوسف کا کنوئیں سے — یا برق جدا ہو گئی بادل کے دھوئیں سے
تا نگہ چشم سیام اوج پر آیا — اوصاف ہر اک فردِ بشر کو نظر آیا
خط کھینچنے کو کلک دوات نظر آیا — یا دوڑ کے ظلمت کی گلی سے ظفر آیا
گرمی پہ شرر تیغ شرر دم کے جو آئے — جوہر نے کنوئیں قعرِ جہنم کے جھکائے
تھی مرغ نگہ پردوں میں پر اس نے جلائے — عنقائے تصور کے کباب اس نے لگائے
ظلمات میں یوں تیغ پہ قبضہ سے لئے پھری — یونس کو جیسے بطن میں مچھلی لئے پھری
چہرہ سے بلٹی صفِ لشکر کبھی دور کی — جبت خانہ سے شباہت کبھی دور کی
کافِ شگاف بن کے رہِ دل جگر گئی — مانند نسیم مرگ میان کمر گئی
لفظِ شکم میں دینے کو زیر و زبر گئی — مانند ہش ہر جوڑ کل سے گذر گئی
رن کی صفوں کا خوف سے شیرازہ ہو گیا — پانی ہوئے یہ زہر سے کہ چھڑکاؤ ہو گیا
بلنی جبین و لب سے حسینؑ و خلیل ہے — سر میں ہے [illegible] زیر قائم سلسبیل ہے

نبضیں چھٹیں شرر کی سقر کانپنے لگے　　شعلے زباں نکال کے خود ہانپنے لگے
نہیبِ تیغ سے خالی سبھوں کے قالب تھے　　پیالہ ہائے فلک روحوں سے لبالب تھے
گیا جو فوق سے تحت الثریٰ کو آبِ حسام　　بنا خزانۂ قاروں خزا بہ حمام
فلک نے تختۂ یوناں رکھا زمین کا نام　　ہوا رطوبتِ اطراف سے زمیں کو زکام
دماغ خاک پہ نزلہ بصد وفور گرا
کیا جو عطسہ تو قاروں نکل کے دور گرا

جوہر ہیں طرفہ ہیبتِ تیغ دلیر ہے　　مچھلی کے جال میں یہ مگر کوئی شیر ہے
بادل کی طرح جوہرِ شمشیر جو چھائے　　سائے نے تڑپ کر دہل رعد بجائے
چار آئینہ نے اور ہی صورت دکھائی ہے　　پر آئینہ نہیں ہے سند ہم نے پائی ہے
زائل زرہ کی آنکھوں سے جو روشنائی ہے　　آنکھوں نے چار چشمے کی عینک لگائی ہے
ڈر ڈر کے آبِ تیغ سے سب کوچ کر گئے　　غصہ سے ہو کے چیں بجبیں کچھ ٹھہر گئے
پل بن گئے وہ چیں جبیں سر اتر گئے　　اک وار میں فرات کے پار آن کے مر گئے
پر ذو الجناح صاف دھوئیں سے نکل گیا　　باروت تھا کہ اڑ کے کنوئیں سے نکل گیا
تنہا طوطی خطِ پشت لب لعل پہ گویا　　دیکھو کہ دھواں آتش یاقوت سے نکلا
تھا چاہِ ذقن میں چہ نخشب کا تجلّا　　اس چاہ کی کشتی نے تو پانی بھی نہ مانگا
جلوے لب و دنداں کے عجب پیشِ نظر تھے
دروازے پہ یاقوت تھے اور گھر میں گہر تھے

حاشا نہیں تجلّی ماہ آسمان پر — مچھلی اچھالتی ہے کلاہ آسمان پر
چشم ضیا فشاں سے نمودِ چراغ ہے — پلکیں نہ سمجھو ہالۂ دودِ چراغ ہے
پیدا کمر سے کنہ جنابِ الٰہ ہے — یہ بال چشم ناف کا تارِ نگاہ ہے
پتلی ہے کوہ طورِ تجلّی کبریا — سنتے تھے تل کی اوٹ پہاڑ اب نظر پڑا
جنبش پہ پلکیں دستِ نگہ میں نہ وہیں عصا — موسیٰ کی بھی نگہ نہ ہوا اس چشم تک رسا
اک جلوہ دے یہ چشم جسے اپنے نور کا
وہ خاک کے بھی مول نہ لے سرمہ طور کا

سجنے لگا سلاحِ وغا پھر وہ پُر دغا — کی خود لے خود نمائی سے زیبِ سرِ جفا
یا ماہ آفتاب کو گویا گہن لگا — یا دار قد پہ کفر کا بختِ سیہ چڑا
اسلام میں جو ڈالے ہیں رخنے یزید نے
اُن رخنوں کو کیا زرہ تن پلید نے
پاؤں میں پہنے موزۂ گمراہیِ جہاں — کج فہمیِ معاویہ کی اُس نے لی کماں
اور تیغ ہند، ہندِ جگر خوارہ کی زباں — فردِ سیہ تھی نامۂ اعمالِ شامیاں
چار آئینہ وہ زنگ بھرا اُس پلید کا
دل شمر و شبث و ابن زیاد و یزید کا

مضمون بندی و خیال آفرینی

میر انیس اور مرزا دبیر میں اصلی ما بہ الامتیاز جو چیز ہے وہ خیال بندی اور دقّت پسندی ہے، اور یہی چیز

مرزا صاحب کے تاج کمال کا طرّہ ہے، اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مرزا صاحب کی قوت متخیلہ نہایت زبردست ہے، وہ اس قدر دور کے استعارات اور تشبیہات ڈھونڈھ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک اُن کے حریفوں کا طائر وہم پرواز نہیں کر سکتا۔ راست نما اور دلفریب (لیکن غلط) استدلال جو شاعری کا ایک جزو اعظم ہے، اُن کے ہاں نہایت کثرت سے پایا جاتا ہے۔ وہ قوت متخیلہ کے زور سے نئے نئے اور عجیب دعوے کرتے ہیں، اور خیالی استدلال سے ثابت کرتے ہیں۔ مبالغہ کے مضامین جو پہلے شعرا باندھ چکے تھے اور بہ ظاہر نظر آتا تھا کہ اب اس کی حد ہو چکی، اُن کو وہ اس قدر ترقی دیتے ہیں کہ پہلے مبالغے ان کے مقابلہ میں ہیچ ہو جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال، شدت مبالغہ میں اُن کا جواب نہیں لیکن اس زور کو وہ سنبھال نہیں سکتے، اس وجہ سے کہیں خامی پیدا ہو جاتی ہے، کہیں تعقید اور اغلاق ہو جاتا ہے۔ تشبیہات کہیں پہیلیاں بن جاتی ہیں اور کہیں محض فرضی خیال رہ جاتی ہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں اُن کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر بھی پورا اُتر جاتا ہے، نہایت بلند مرتبہ ہو جاتا ہے۔ اِس موقع پر ہم اُن کی ہر قسم کی عمدہ مضمون آفرینی کی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں ؎

۳۴، جب[لہ] سرنگوں ہوا علمِ کہکشانِ شب — خورشید کے نشاں نے مٹایا نشانِ شب
تیرِ شہاب سے ہوئی خالی کمانِ شب — باقی نہ پھر شعاعِ قمر نے سنانِ شب
آئی جو صبح زیورِ جنگی سنوار کے
شب نے زرہ ستاروں کی رکھ دی اتار کے

شمشیرِ مشرقی جو چڑھی چرخ پر شتاب — پھر تیغِ مغربی نے دکھائی نہ آب و تاب
تھا بسکہ گرم خنجرِ بیضائے آفتاب — باقی رہا نہ چشمۂ نیلوفری میں آب
محتاج ماہتاب ہوا آب و تاب کا
باغِ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

تھی جوشِ خوں کے عارضہ میں مبتلا شفق — فصّادِ صبح آیا لیے نشتر و طبق
کھولی شفق کی صبح تو رنگِ افق تھا فق — گلرنگ تھا صحیفۂ گردوں ورق ورق
خونِ شفق میں سرخ قضا نے قلم کیا
اور خط و خالِ روزِ شہادت رقم کیا

ایضاً

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی — پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطعِ زلفِ لیلیِ زہرہ لقب ہوئی — مجنوں صفت قبائے سحر چاک شب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخِ ہنرمند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لیے

لہ ۔ اس کے مقابلہ میں میر انیس کی صبح دیکھو۔

یوسف غریق چاہ سیہ ناگہاں ہوا　　یعنی غروب ماہ تجلّی نشاں ہوا
یونس وہانِ ماہیِ شب سے عیاں ہوا　　یعنی طلوع نیّرِ مشرق ستاں ہوا
فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور ید بیضا تھا آفتاب

تھی صبح یا کہ چرخ کا جیبِ دریدہ تھا　　یا چہرۂ مسیح کا رنگِ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ عرش کا اشکِ چکیدہ تھا　　یا فاطمہؑ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا
کیسے نہ مہر صبح کے سینہ پہ داغ تھا
اُمیدِ اہلِ بیت کا گھر بے چراغ تھا

نکلا اُفق سے عابدِ روشن ضمیرِ صبح　　محرابِ آسماں ہوئی جلوہ پذیرِ صبح
کھولا سپیدی نے جو مصلّے پیرِ صبح　　ہر سجدہ گاہ بن گیا مہرِ منیرِ صبح
کرتی تھی شب غروب کا سجدہ وداع کو
سیارے ہفت عضو بنے تھے سجود کو

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہو گیا　　پھر مشکِ شب جہان سے کافور ہو گیا
گویا کہ زنگ آئینہ سے دور ہو گیا　　باطل رسالۂ شب دیجور ہو گیا
کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامہ میں
مضمون تھا آفتاب کا ذرّوں کے نامہ میں

ایضاً

گلگونۂ شفق جو ملا حورِ صبح نے　　اسپندِ مشکِ شب کو کیا نورِ صبح نے
گرمی دکھائی روشنیِ طورِ صبح نے　　ٹھنڈے چراغ کر دیے کافورِ صبح نے

لیلائے شب کی رات کو دولت جو لٹ گئی
افشاں جبیں سے مہر درخشاں کی چھٹ گئی
پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشان صبح		سلطان صبح نے کیا قصد اذان صبح
باندھا عمامہ نور کا پہنا کتان صبح		چرخ چہارمین پہ گیا خطبہ خوان صبح
منہ سب کے سوے قبلۂ امید ہو گئے
سرگرم سجدہ عیسی و خورشید ہو گئے
آیا جو تیغ روز لئے شاہ نیم روز		ماہی شکار شیر سوار و جہاں فروز
باندھے کمر میں خنجر بیضائے کینہ سوز		پھر دیو ہفت سر ہوا صید عقاب روز
مہتاب لشکر شہ خاور میں گھر گیا
آرہ شعاع کا سر انجم پہ پھر گیا
بڑھ کر نقیب نور پکارا سحر سحر		ذروں میں نور مہر در آیا قمر قمر
فرمان نور بدر کو پہونچا بدر بدر		لوٹا سحر نے معدن شبنم گہر گہر
برقع جو اٹھ گیا تھا رخ آفتاب کا
پردہ تھا فاش صبح ملمع نقاب کا
شاخ نیام سے ہوا اس طرح پھل جدا		پیروں کے قد سے جیسے جوانی کا بل جدا
ہستی جدا زمین پہ تڑپی اجل جدا		خنجر جدا فلک پہ گرا اور زحل جدا
غل تھا کہ اب مصالحۂ جسم و جاں نہیں
لو تیغ برق دم کا قدم درمیاں نہیں
ڈوبی سپر میں گر کے نئی چال ڈھال سے		پا گھر کے بیچ میں یہ گری سیدھی چال سے

اُٹھ کر زرہ میں آئی شکوہ و جلال سے   اک چال میں تڑپ کے گئی ایک جال سے
گذری جو چار آئینہ سے منہ کو موڑ کے
غل تھا پری نکل گئی شیشہ کو توڑ کے

کاٹا پلک میں آنکھ کو پتلی میں نور کو   پالوں میں کجروی کو سروں میں غرور کو
سینہ میں بغض و کینہ کو دل میں فتور کو   نیت میں معصیت کو طبیعت میں زور کو
ذات اک طرف مٹا دیا بالکل صفات کو
کیسی زباں زباں میں یہ کاٹ آئی بات کو

سب کے گلوں سے ملتی تھی لیکن رکی ہوئی   جوہر پہ تھا کہ بوجھ سے خود تھی جھکی ہوئی

ولہ

ظرف تنگ میں تھی نہ جگہ اُس کی آب کی   بندھتی تھی اور کھلتی تھی مٹھی حباب کی
دریائے خوں تھا تیغ شبک رو کی ناؤ پر   پھر یوں رواں تھی جیسے کہ کشتی بہاؤ پر

ولہ

اللہ ری شناوری شمشیر آب دار   دکھلا دیئے صفائی کے سب ہات ایک بار
تیرا وہ جوئے زخم میں گہ وار گاہ پار   جوہر کا ایک بال بھی ڈوبا نہ زینہار
اک وجد حُر کو بھی یہ صفا دیکھ کر ہوا
ہات اک طرف نہ تیغ کا ناخن بھی تر ہوا

جس مورچہ میں لیلیِ تیغ دو سر گئی   چنگے بھلوں کو سایہ سے دیوانہ کر گئی
ہر صف نے خاک اڑائی ادھر آئے ادھر گئی   پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی
عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا

جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

آگے کبھی بڑھی کبھی پیچھے کو پھر پڑی سر پہ جو لڑکھڑائی تو شانے پہ گر پڑی

ولہ

اُٹھی۔گری۔بلند ہوئی۔پست ہوگئی پی پی کے میکشوں کا لہو مست ہوگئی

ولہ

نیزے تنے تو آسنے کہا دیکھیے بھالے ہیں بچتی نہ خنجروں سے کہ گودی کے پالے ہیں
ہرسے جو تیر سمجھی کمانوں کے نالے ہیں چھکے جو گرز بولی یہ منہ کے نوالے ہیں

تنگ اپنا جان کر نہ کسی سے بگڑتی تھی
ہر پھر کے آپ اپنی طبیعت سے لڑتی تھی

بے جرم معرکہ میں وہ خار اشگاف تھی لشکر کا خوں کیا تھا مگر پاک و صاف تھی

ولہ

قبضہ تو رہا دست جناب شہ دیں میں پھل جا کے لگا شاخ سر گاوِ زمیں میں

ولہ

اس قہرِ مجسم پہ اجل نے جو نظر کی مجرا تو فقط کر لیا اور پیچھے کو سرکی
غصہ سے چڑھی بھوں جو ادھر تیغ دو سر کی پھرنے لگی پتلی سپر فوج عمر کی

باقی تھا نہ دم خوف سے تیغیں یہ گھٹی تھیں
تیغیں نہ کہو انھیں نیاموں کی چھٹی تھیں

ولہ

خود رفتہ تھا ہر تیر یہ رفتار نئی تھی انگڑائی کا لینا بھی کماں بھول گئی تھی

تھی راست گو وہ تیغ یہ روشن جہاں پہ تھا ولہ جتنا لہو پیا تھا وہ جاری زباں پہ تھا

ولہ

کٹتے تھے سر نہ تیغ امام عراق سے بٹ کر رہے تھے خاک پہ کعبہ کے طاق سے

ولہ

سر کو نہ وصل تیغ سے اصلا دریغ تھا کیا سب کی سرنوشت میں مصراع تیغ تھا

ولہ

رک رک کے قدم رکھتی تھی ہر سر پہ ادب سے جھک جھک کے مثالِ شرفا ملتی تھی سب سے

ولہ

جوہر کے نگہبانوں کو بیمار جو پایا زخموں نے بھی اس تیغ کا پانی نہ چرایا

ولہ

ہوتی تھیں صفیں آب دم تیغ سے بیدم پانی جو کھڑے ہو کے پیو ہوتا ہے سن کم
حل کرتی تھی ہر مسئلہ تیغ شہ عالم ہے خون نجس اس میں یہ آلودہ تھی ہر دم
پر اس پہ نجاست کا گماں ہو نہیں سکتا
یعنی کہ نجس آب رواں ہو نہیں سکتا

اللہ رے دماغ اسکا کسی سر پہ نہ بیٹھی سر ایک طرف گنبد مغفر پہ نہ بیٹھی
بالائے سپر پھولوں کے بستر پہ نہ بیٹھی
یہ بیٹھنا کب تھا ادھر آئی ادھر آئی
جس سر پہ رکھا پانوں زمیں پہ اتر آئی

اسی طرح گھوڑے کی سرعت، فوج کی ہل چل، آمد کی دھوم،

وغیرہ وغیرہ مضامین میں سیکڑوں ہزاروں نئی تشبیہیں، استعارات اور باریکیاں پیدا کی ہیں، ہم نے اس خیال سے صرف نمونہ پر اکتفا کیا کہ جو شخص ایک تلوار کے متعلق اس قدر بے شمار مضامین کا مینھ برسا سکتا ہے اُس کی قوت متخیلہ کی کیا حد ہو سکتی ہے۔

بلاغت

یہ وہ چیز ہے جہاں انیس و دبیر کی شاعری کی سرحدیں بالکل الگ ہو جاتی ہیں، مرزا صاحب کی شاعری میں بالفرض گو اور تمام اوصاف پائے جاتے ہوں، لیکن بلاغت کا تو شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

تم اوپر پڑھ آئے ہو کہ ہر چیز کی بلاغت الگ ہے۔ مضمون کی الگ، قصہ کی الگ، قصیدہ کی الگ، نثر کی الگ، لیکن مرزا صاحب کے کسی قسم کے کلام میں یہ وصف پایا نہیں جاتا۔ وہ اگر کسی واقعہ کا خاکہ تیار کرتے ہیں تو اس قسم کی باتیں بیان کرتے ہیں جو خود شہادت دیتی ہیں کہ واقعہ وجود میں نہیں آسکتا تھا۔ نوحہ و غم، فخر و ادعا، طنز و تشنیع، ہجو و بدگوئی، سوال و جواب، گلہ و شکایت، غرض کسی مضمون کو وہ مقتضائے حال کے موافق نہیں لکھ سکتے۔

ہم چند مثالیں نمونہ کے طور پر لکھتے ہیں۔

مثال ۱۔ ایک مرثیہ میں حضرت امام حسین علیہ السّلام کی شہادت

۱۲۔ حضرت شہربانوؑ کا جو نوحہ لکھا ہے اُس میں لکھتے ہیں ؎

تم جا نو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ
اکبرؑ سے ہیں گذری مرے والی کو لے آؤ

"تم جا نو جہاں سے" اس محاورہ کے ابتذال سے قطع نظر کر کے یہ امر کس قدر خلاف مقتضائے حال کے ہے کہ کوئی شریف عورت یہ کہے کہ میں اپنے بیٹے سے در گذری، میرے شوہر کو جہاں سے ممکن ہو پیدا کرو۔

مثال ۲۔

ناگہاں بالی سکینہؑ نے مچل کر یہ کہا میرے کرتے کا گریباں بھی کرو چاک چچا
خوب ملبوس یہ ہے پہنیں گے ہم بھی ایسا رُوٹھ جاؤنگی نہ مانوگے جو میرا کہنا
آپ جب خیمہ میں آئیں گے تو چھپ جاؤں گی
پھر مجھے گود میں لوگے تو نہ میں آؤں گی

روئے نادان کی تقریر پہ عباسؑ کمال اور کہا دل سے کہ اسکا بھی کرو ورنہ سوال
بے پدر ہوگی کوئی آن میں یہ نیک خصال چاک اِسکا بھی گریباں کیا با حزن و ملال
پیار جو آگیا بنت شہ دیں کے اوپر
بوسے دے دے کے ملی خاک جبیں کے اوپر

واقعہ یہ باندھا ہے کہ حضرت عباسؑ جب میدان میں جانے لگے تو اپنے بیٹے کا گریبان چاک کر دیا کہ یتیمی کی علامت ہے، یہ دیکھ کر سکینہؑ (حضرت امام حسین علیہ السّلام کی صاحبزادی) نے کہا کہ میرے کرتہ کا گریباں

بھی چاک کر دو۔ مجھ کو بھی یہ وضع اچھی معلوم ہوتی ہے، حضرت عباسؑ نے اس خیال سے کہ آخر حضرت امام حسینؑ بھی کچھ دیر میں شہید ہوں گے اور حضرت سکینہؓ بھی یتیم ہو جائیں گی، اس لئے اُن کا گریبان بھی چاک کر دیا۔
حضرت عباسؑ کو امام علیہ السّلام سے جو عشقیہ محبت تھی اور جس کا اظہار ہر جگہ مرزا صاحب نے بھی کیا ہے، اس کے لحاظ سے یہ امر نہایت خلاف عقل اور خلاف عادت ہے کہ وہ حضرت امام حسینؑ کو قبل از وقت شہید فرض کرلیں، اور اس بنا پر اُن کے بچّہ کو یتیم فرض کرکے اس کا گریبان چاک کر دیں۔

مثال ۳۵

یہ کہتی تھی کہ آئی فضہ بنت مرتضےٰؑ
تسلیم کرکے بانوؑ نے سر کو جھکا لیا
زینبؑ پکاری بیٹھو ادب میرا ہو چکا
جس کی نہ بات پوچھیے تعظیم اس کی کیا
سب جانتے ہیں بنتِ جنابِ امیرؑ ہوں
گھر میں تمھارے رہتی ہوں اس سے حقیر ہوں

حضرت زینبؑ کو اس بات کی شکایت ہے کہ علی اکبرؑ کو شہر بانوؑ نے میری بغیر اطلاع کے لڑائی میں جانے کی کیوں اجازت دی۔ اس بنا پر وہ حضرت شہر بانوؑ سے کہتی ہیں کہ جب میری بات نہیں پوچھی جاتی تو تعظیم سے کیا فائدہ۔
لیکن اس مقصد کے اظہار کے لئے مرزا صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ کس قدر سفیہانہ اور عامیانہ ہے، یہ خیال کہ چونکہ میں اپنا گھر چھوڑ کر

تمھارے گھر میں رہتی ہوں اس لئے تم لوگ مجھ کو حقیر سمجھتے ہو، نہایت پست اور تبذل خیال ہے، جو ہرگز حضرت زینبؑ کی متانت اور وقار کے شایاں نہیں۔

مثال ۴۔۵

محبوب ہوں خدائے ذوی الاحترام کا
نانا ہوں میں حسین علیہ السلام کا

یہ شعر جناب رسولؐ خدا کی زبان سے ادا کیا ہے، لیکن مرزا صاحب کو یہ خیال نہیں رہا کہ کیا آں حضرتؐ بھی امام حسین علیہ السلام کا نام علیہ السلام کہہ کر لیتے تھے،

مثال ۵۔۵

یہ بات سن کے نبیؐ نے گھونگھٹ الٹ لیا — عباسؑ کو حسینؑ کو اکبرؑ کو دی صدا
صدقہ میں تم یہاں سے سرک جاؤ اک ذرا — تم سب کے آگے روتے ہوئے آئیگی حیا

ماتم کا ہے ہجوم دل پاش پاش پر
جی بھر کے رولے یہ بنے قاسمؑ کی لاش پر

سرکے وہاں سے اکبرؑ عباسؑ و شاہ دیں — لاشہ کے گرد پھرنے لگی وہ دلھن حزیں
زینبؑ سے پوچھنے یہ لگی پھر وہ مہ جبیں — اب اختیار دل پہ مرے مطلقاً نہیں

نوشاہ ایک رات کے جو قتل ہوتے ہیں
بتلاؤ اے پھوپھی انھیں کیا کہہ کے روتے ہیں

یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ مرزا صاحب اور دیگر تمام مرثیہ گویوں نے اہل حرم

کی عادات اور مراسم ہندوستان کے شرفا کی مستورات کے مطابق فرض کئے ہیں، چنانچہ عروسی، شادی، اور میت کے متعلق جس قسم کے مراسم و عادات یہاں ہیں وہی تمام مرثیوں میں مذکور ہیں۔ اس بنا پر حضرت کبریٰ کا اپنے باپ، چچا، اور بھائی سے یہ کہنا کہ تم لوگ یہاں سے سرک جاؤ میں اپنے شوہر پر نوحہ کرنا چاہتی ہوں، کس قدر بے حجابی اور بے شرمی ہے طرّہ یہ کہ یہ بھی کہتی ہیں کہ تم سب کے آگے روتے ہوئے شرم آئے گی لیکن یہ کہتے ہوئے شرم نہ آئی۔ مرزا صاحب نے اسی واقعہ کو ایک اور مرثیہ میں لکھا ہے اور وہاں تو حد کر دی ہے، فرماتے ہیں ؎

ناگاہ شہ نے لاش اٹھائی بصد بُکا ــــ کبریٰ نے ہات باندھ کے تب شاہ سے کہا
ہم کچھ کہیں جو مانیئے اے شاہِ کربلا ــــ احسان ہوگا لاش کو رکھ دیجئے ذرا

بالیں پہ بیٹھیں سر پہ ذرا خاک ڈال لیں
ہم بھی کچھ اپنے دل کی تمنّا نکال لیں

میر انیس نے اسی واقعہ کو کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

روکر بہن سے کہنے لگے شاہِ بحر و بر ــــ اس بے نصیب رانڈ کو لے آؤ لاش پر
بیٹی لٹے گی یوں، ہمیں اس کی نہ تھی خبر ــــ اب شرم کیا ہے دیکھ لے دولہ کو اک نظر

زخمی بھی ہے شہید بھی ہے بے پدر بھی ہے
دولہ ہے نام کو بھی، چچا کا پسر بھی ہے

اس بلاغت کو دیکھو کہ چونکہ حضرت امام حسینؑ کا بھی یہ کہنا کہ اب شرم کیا ہے، دولہ کو دیکھ لے، ایک گونہ رسمی حیا کے خلاف تھا اس لئے

آن کی زبان سے یہ الفاظ ادا کیے کہ وہ برائے نام دولہا ہے، ورنہ چچا کا بیٹا اور بھائی ہے ؎

حضرت یہ کہہ کے ہٹ گئے باچشم اشکبار — بیٹھی یہ سن کے غش ہوئی بانوئے دلفگار
چادر سکینہ اڑھا کے دلہن کو بحال زار — گودی میں لائی زینب غمگین و سوگوار
چلائی ماں یہ گر کے تن پاش پاش پر
قاسم بنے اٹھو۔ دلہن آئی ہے لاش پر

ہے ہے بنے قاسم کا ہوا شور جو در پر — بانو نے کہا لٹ گئی لوگو میری دختر
فرزند کے لاشہ سے لپٹنے لگی مادر — سر پیٹتی دوڑی شہ مظلوم کی خواہر
پھر کون رہے بنت علی جب نکل آئے
خیمہ میں وہ دلہن رہ گئی اور سب نکل آئے

مثال ۱۴۔

کہا سجاد سے کبریٰ نے یہ اس دم رو رو — بھائی صاحب مرے دولہا کو بھی اب دفن کرو
تا بیاور ہیں پھولوں کے اپنے سر کو — کہا کبریٰ سے یہ سجاد حزیں نے کہ چلو
ٹکڑے لاشوں کے ہم با دل غمناک کریں
قاسم ابن حسن کو بھی تہ خاک کریں

ایک رات کی بیاہی ہوئی عورت کا، اپنے بھائی سے یہ کہنا کہ میرے دولہا کو بھی دفن کرو، کس قدر خلاف عادت ہے۔

مثال ۱۵۔ حضرت سکینہ کو قید خانہ میں غش آ گیا ہے، انکی ماں حضرت رباب کو خیال ہوا کہ مر گئیں، انھوں نے نوحہ شروع کیا۔

حضرت زینبؑ ان کو سمجھاتی ہیں۔ اس واقعہ کو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

زینبؑ نے رو کے، بانوؑ سے مغموم سے کہا　　بے آس ہو نہ بھابھی یہ غش ہیں یہ مدلقا
اور مر گئی تو خیر جو اللہ کی رضا　　اب اسکے رفع غش کی یہ اسوقت ہو دوا

ہے عاشق حسینؑ یہ پیاری حسینؑ کی
اب غل کرو کہ آئی سواری حسینؑ کی

تسکین اور تسلی دینے میں یہ کہنا کہ "خیر مر گئی تو کیا کرو گی، جو اللہ کی رضا" کس قدر ناموزوں ہے اور خلاف آدمیت ہے۔

یہاں ہم نے اجمالاً صرف چند مثالیں لکھ دیں۔ اس کے بعد متحد المضمون مرثیوں کا جو عنوان ہے اُس سے تفصیلاً معلوم ہو گا کہ مرزا صاحب بلاغت کی راہوں سے کس قدر نا آشنا ہیں۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیے

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ کا صحیح تر اور آسان طریقہ یہ ہے کہ دونوں صاحبوں کے ہم مضمون مرثیوں کا مقابلہ کیا جائے، چونکہ مرثیہ کا موضوع صرف چند معین واقعات ہیں اس لئے اگرچہ دونوں صاحبوں کا انداز شاعری بالکل الگ الگ ہے، تاہم واقعات اور مضامین میں ہر جگہ اشتراک پیدا ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی نظر آتا ہے کہ دونوں حریفوں نے اکثر مرثیے اور بند، اور متفرق اشعار، ایک دوسرے کے مقابلہ میں لکھے ہیں، یہاں تک کہ بعض بعض بندوں میں مضمون، ردیف، اور قافیے تک مشترک ہیں، افسوس ہے کہ ان موقعوں پر یہ پتہ نہ چل سکا کہ ابتدا کس نے کی اور جواب کس نے لکھا، تاہم بعض بعض قرائن سے (جیسا کہ ہم دیباچہ میں لکھ آئے ہیں) ثابت ہوتا ہے کہ مرزا دبیر صاحب زیادہ تر مقابلہ کا قصد کرتے تھے، مثلاً ایک مرثیہ میں میر انیس نے فخریہ کے ساتھ زمانہ کی ناقدری کی شکایت کی تھی، اس کے ایک بند کی ٹیپ یہ ہے ؎

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

اسی بحر میں مرزا دبیر صاحب کا بھی مرثیہ ہے، اس میں بھی فخریہ ہے اور ایک بند کی ٹیپ یہ ہے ؎

دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے
انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے

دونوں شعروں کو دیکھ کر، ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس نے کس کا جواب لکھا ہے۔

میر انیس اکثر شعروں میں مرزا دبیر پر سرقہ اور خوشہ چینی کی چوٹ کرتے ہیں مثلاً ؎

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

ع پیاسو! پیو سبیل ہے نذرِ حسینؑ کی، ؎

ممکن نہیں دزدانِ معانی سے نجات
سچ ہے کہ کس سے کب شکر بچتی ہے

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

نو اسنجیوں نے تری اے انیس
ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

ع مضمون انیس کا نہ چرا کر اترا

لیکن مرزا دبیر نے میر انیس پر کہیں سرقہ کی تعریض نہیں کی ہے، بلکہ صرف اپنی برأت ظاہر کی ہے مثلاً ؎

واللہ بری ہوں سرقۂ مضمونِ غیر سے
ہے استفادہ مجھکو احادیث و سیر سے

شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں — ہر مرثیہ میں موجدِ طرزِ جدید ہوں

بہر حال کم سے کم ہمکو یہ فرض کر کے کہ دونوں میں سے کوئی سرقہ کا مجرم نہیں، صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس مضمون کو کس نے خوبی سے ادا کیا ہے، چنانچہ ہم دونوں کے متحد المضمون مرثیئے اور اشعار ذیل میں درج کرتے ہیں۔

پردہ کا اہتمام

انیس

بیت الشرفِ خاص سے نکلے شہِ ابرار — روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترتِ اطہار
فراشوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار — پردہ کی قناتوں سے خبردار خبردار
باہر حرم آتے ہیں رسولؐ دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکوں سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اتر جائے — آتا ہو ادھر جو وہ اسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقہ پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے — دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے
مریمؑ سے سوا حق نے شرف ان کو دیئے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کئے ہیں

دبیر

دربان عصا اٹھا کے بڑھے جانبِ بسیار — دہنی طرف نقیب گئے باندھ کر قطار
آ آکے در پہ لونڈیاں چلائیں بار بار — آئے ادھر نہ اب نہ کوئی جائے ہوشیار
آوازِ غیر سن کے وہ اندیشہ کرتی ہے

آہستہ بولو دخترِ زہراؑ آتی ہے

عفّت کے جتنے مرتبے خیر النساءؑ نے پائے وہ ماں کے بعد دخترِ مشکل کشاؑ نے پائے
ہاں ہاں مسافرو نہ کوئی غل مچانے پائے ناقہ پہ بیٹھ کر نہ ادھر کوئی آنے پائے

حُسنِ ادب یہی ہے کہ حق کو پسند ہو
وہ بیٹھ جائے جس کا کہ قامت بلند ہو

دونوں بزرگوں نے عورتوں کے پردہ کے اہتمام کا سماں باندھا ہے، لیکن میر صاحب نے اس مضمون کو اس فصاحت و بلاغت سے ادا کیا ہے اور اس طرح واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے کہ اس کے سامنے مرزا صاحب کے اشعار کا پیش کرنا بھی، میر صاحب کی ناقدردانی ہے، روانی، شستگی، خوبیِ محاورہ، چستیِ بندش کے علاوہ بلاغت کے نکتوں پر لحاظ کرو، میر صاحب نے پردہ کے اہتمام اور لوگوں کے ہٹانے اور روکنے کو حضرت عباسؑ کی طرف منسوب کیا ہے جس سے حضرت زینبؑ کی عظمت و شان کے اظہار کے علاوہ اصلی واقعہ کی مطابقت ہوتی ہے، کیونکہ تمام معزز خاندانوں میں پردہ کا اہتمام خود خاندان کے ممبر کیا کرتے ہیں، بخلاف اس کے مرزا صاحب نے یہ کام بالکل دربانوں، نقیبوں اور لونڈیوں کے سپرد کر دیا ہے، جس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ یا تو گھر میں کوئی مرد تھا ہی نہیں، یا تھا تو اس کو عورتوں کی چنداں پروا نہ تھی، پردہ کے اہتمام میں نقیبوں کا کیا کام ہے، لونڈیوں کے غل مچانے سے ثابت ہوتا ہے کہ ادب اور شائستگی نہیں

پائی جاتی ۔

ذیل کے یہ دونوں مصرعے بالکل ہم مضمون ہیں لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ؎

انیس ناقہ پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے،

دبیر ناقہ پہ بیٹھکر نہ اِدھر کوئی آنے پائے،

صغریٰ کی آزردگی

دبیر

صغریٰ نے کہا صاحبو کیا کرتے ہو گفتار — اک بات پکڑلی کہ یہ بیمار ہے بیمار

شاید کہ سفر ہی میں شفا دے مجھے غفار — یاں کون خبر لے گا مری یہ درو دیوار

اِتنی بھی تو طاقت نہیں جو اٹھ کے کھڑی ہوں

اے لوگو! میں کیا آپ سے بیمار پڑی ہوں

واقعہ یہ ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السّلام تمام اہلِ حرم کو ساتھ لئے جاتے ہیں، لیکن حضرت صغرا کو بیمار ہونے کی وجہ سے چھوڑے جاتے ہیں، اس پر وہ گریہ وزاری کرتی ہیں، حضرت امام حسینؑ اور گھر کی عورتیں سمجھاتی ہیں کہ تم بیمار ہو، سفر کے مصائب برداشت نہیں کرسکتی ہو۔ صغرا جواب دیتی ہیں ۔ اِسی مضمون کو میرانیس صاحب ادا کرتے ہیں ؎

کیا خلق میں لوگو! کوئی ہوتا نہیں بیمار — ہے کونسی تقصیر کہ سب ہوگئے بیزار

زندہ ہوں پہ مردہ کی طرح ہوگئی دشوار — کیوں جاگئے ہیں سب مجھے ہے کونسا آزار

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اسکا

وہ آنکھ چرا لیتا ہے منہ تکتی ہوں جس کا

مرزا صاحب نے بھی عمدگی سے اس واقعہ کو ادا کیا ہے، لیکن میر صاحب کے طرزِ بیان میں جو حسرت، رنج اور بیکسی ہے، وہ مرزا صاحب کے ہاں نہیں "اک بات پکڑ لی" عامیانہ اور سوقیانہ طرزِ گفتگو ہے، ٹیپ کے دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں، اور یہ کہنا کہ مجھکو اُٹھنے کی بھی طاقت نہیں صغرا کی خواہش پر ناکامی کا اثر پیدا کرتا ہے، کیونکہ جب اُٹھنے کی طاقت نہیں تو وہ سفر کیونکر کر سکتی ہیں۔

اسی بنا پر میر انیس نے جہاں یہ واقعہ باندھا ہے، صغرا کی زبان سے یہ کہا ہے ؎

قربان گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت ۔۔۔ تپ کی بھی ہر نسبت میں کئی روز سے خفت
بستر سے میں خود اُٹھ کے ٹہلتی بھی ہوں حضرت ۔۔۔ پانی کی بھی خواہش ہے غذا کی بھی ہے رغبت
حضرت کی دعا سے مجھے صحت کا یقیں ہے
اب تو مرے منہ کا بھی مزا تلخ نہیں ہے

دیکھو حضرت صغرا کس کس طرح سے بیماری کی تخفیف اور قریب الصحۃ ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔

اصغرؑ سے خطاب

دبیر

پردہ کو اٹھا کر یہ کہا بانو نے رو رو ۔۔۔ صدقے گئی فال ایسی تو منہ سے نہ نکالو
سب جیتے ہیں بیکس نہ ابھی آپ کو سمجھو ۔۔۔ شبیر ہو، دنیا ہو، ترا کنبہ ہو، تو ہو

کب میں نے کہا یہ نہیں اصغرؑ ہے تمہارا
او شوق سے دیکھو، یہ برادر ہے تمھارا

پھر ہاتھوں پہ اصغرؑ کو رکھا کر کے بہ زاری — لٹکا دئے ہات اُس نے ہمک کر کئی باری
ماں نے کہا لو گود میں یہ آگئے ہیں واری — اصغرؑ کی طرف ہات اُٹھا کر وہ پکاری

پھر جیتی ملوں یا یہ ملوں تجھ سے بلا لوں
آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں

صغرا کا رخصت کے وقت علی اصغرؑ کو حسرت اور پیار سے دیکھنا نہایت درد انگیز سماں ہے، اور اکثر مرثیوں میں یہ سماں نہایت مؤثر طریقہ سے دکھایا جاتا ہے، لیکن مرزا صاحب ایسے درد انگیز واقعہ کو بھی تاثیر کا رنگ نہ دے سکے۔ دیکھو میر صاحب اسی بات کو کس لہجہ سے ادا کرتے ہیں ؎

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغراؑ ترے قرباں — گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جاں
بیکس مری بچی ترا اللہ نگہباں — صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آں

کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا
کنبہ کے لئے جان کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ و زاری — اصغرؑ مرا روتا ہے صدا سن کے تمھاری
وہ کانپتی ہاتوں کو اٹھا کر یہ پکاری — آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری

چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغرؑ مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی　　تپ ہے تمھیں چھاتی سے بھی لپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی　　رکھ لوں تمھیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی

بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمھیں طاقت گفتار نہیں ہے

اس واقعہ کا نہایت درد انگیز پہلو، صغرا کا خود اصغر سے مخاطب ہونا، اور جوش محبت میں چھ مہینے کے بچّہ سے اپنا درد دل کہنا تھا، مرزا صاحب صرف یہ کہہ کر رہ گئے،

ع　آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں '

میر صاحب نے پورا درد دل کہا اور کس مؤثر طریقہ سے کہا، مرزا صاحب کا یہ

مصرع　اصغر کی طرف ہاتھ اٹھا کر وہ پکاری '

میر صاحب کے اس مصرع کے جواب میں ہے۔

ع　وہ کانپتی ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری '

لیکن دونوں میں کوئی نسبت نہیں میر صاحب کے ہاں ہاتھ کے ساتھ کانپتے کی قید نے کس قدر بلاغت پیدا کر دی ہے۔ ذیل کے ان دونوں مصرعوں میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔

ع　آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری '
ع　آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں '

"چھوٹا مسافر" مرزا صاحب کا ایجاد ہے۔

اعلیٰ و ادنیٰ کا مقابلہ

کچھ خارِ مغیلاں گُل تر ہو نہیں جاتا　　قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا
ہر قطرۂ ناچیز گُہر ہو نہیں جاتا　　مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا
جس پاس عصا ہو اُسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہات کو عاقل یدِ بیضا نہیں کہتے

میر انیس کا یہ مشہور بند ہے، مرزا صاحب نے اس کے جواب میں بڑی کوشش کی، مختلف بحریں اختیار کیں، بہت سی نئی نئی تشبیہیں ڈھونڈھیں، لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی، مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

احکام پیمبر اور ہیں اور اپنے امور اور　　باطل کی نمود اور ہے اور حق کا ظہور اور
نمرود کی آگ اور ہے اور آتش طور اور　　زنبور کا غل اور ہے، الحان زبور اور
سمجھو تو سہی تم کہ بشر کیا ہے ملک کیا
بُت کیا ہے خدا کیا ہے، زمیں کیا ہے، فلک کیا

ساماں سے کوئی صاحب ایماں نہیں ہوتا　　ہر اہلِ عصا موسیِٔ عمران نہیں ہوتا
پہنے جو انگوٹھی وہ سلیماں نہیں ہوتا　　آئینہ گر، اسکندر دوراں نہیں ہوتا
لاکھ اوج ہو پشہ کا ہما ہو نہیں جاتا
بُت سجدۂ کافر سے خُدا ہو نہیں جاتا

یہ تشبیہات کافی نہ ہوئیں تو ایک اور مرثیہ میں بہت سی تشبیہیں جمع کیں ؎

ہر سبز پوش خضر نہیں عز و جاہ میں　　سر سبز حیدریؑ ہیں جناب الٰہ میں
یوسفؑ نہ ہوگا لاکھ گرے کوئی چاہ میں　　دن رات کا ہے فرق سفید و سیاہ میں
کوئی یتیم فاطمہؑ سا خوش گہر نہیں
ہر ایک یتیم دُرِ یتیم اسے عمر نہیں

چاہے زرہ بنا کے جو داؤدؑ کا وقار　　واللہ جعل ساز ہے کیا اُس کا اعتبار
ہر بخیہ گر نہ ہو کبھی ادریسؑ نامدار　　ہر ناخدا کو نوحؑ کہے گا نہ ہوشیار
کیا جاہلوں کے عیش کا سامان ہو گیا
بیٹھا جو تخت پر وہ سلیمانؑ ہو گیا

حُر کا واقعہ

حُر پہلے یزید کی طرف تھا، لیکن خدا نے ہدایت دی، اور معرکۂ جنگ شروع ہونے سے پہلے، وہ حضرت امام حسین علیہ السّلام کی فوج میں چلا آیا، اُس کا آنا، معافی کا خواستگار ہونا، لڑنے کی اجازت طلب کرنا، زخمی ہو کر گرنا، امام علیہ السّلام کا اُس کے پاس جانا، اُس کا انتقال کرنا، یہ واقعات اکثر مرثیوں میں دونوں نے لکھے ہیں، لیکن ایک مرثیہ میں بحر اور اکثر قافیے تک مشترک ہیں، ان دونوں مرثیوں کے مقابلہ کرنے سے، دونوں حریفوں کے مدارج کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے ؎

مرزا دبیر

کہکے یہ گھوڑوں پہ نمازی ہوئے دونوں اسوار　　پہونچے نزدیک شہ دیں تو پکارا جرّار
اور چلے شاہ کی جانب کو بڑھا کر رہوار　　بخش دے جُرم شہنشاہِ نجفؑ کے دلدار

روے الطاف کو ہم سے نہ پھرانا آقا
نہیں اس در کے سوا کوئی ٹھکانا آقا

میر انیس

ذکر یہ تھا کہ صدا دور سے آئی اک بار — مجرم ایسا ہوں کہ عصیاں کے نہیں جسکے شمار
الغیاث اے جگر و جان رسولؐ مختار — عفو کر عفو کر اے چشمۂ فیضِ غفار
پار دریائے خطا سے مری کشتی ہو جائے
دوزخی بھی ترے صدقے میں بہشتی ہو جائے

مرزا دبیر

واسطہ احمدؐ و زہراؑ و حسنؑ کا اے شاہ — بخش دو عفو کرو بندۂ عاصی کا گناہ
نذر سر لایا ہوں مقبول ہو اے عرش پناہ — اور بتاؤ مرے بیٹے کو بھی فردوس کی راہ
حُر عوض آپ کے مقتولِ جفا ہوئے گا
اور اکبرؑ پہ مرا لال فدا ہوئے گا

میر انیس

کئی روزوں سے تلاطم میں ہوں اے شاہنشاہ — مدد اے نوحِ غریباں مرا بیڑا ہے تباہ
دست و پا گم ہیں کچھ ایسے کہ نہیں سوجھتی راہ — شور کرتا ہوں کہ بتلائے کوئی جائے پناہ
"ابرِ رحمت کی طرف جا" یہ صدا دیتے ہیں
سب ترے دامنِ دولت کا پتہ دیتے ہیں

مرزا دبیر

پیشوائی کو چلے حُر کے شہنشاہِ زمن — ہاتھ کھولے پسرِ عقدہ کشا نے فوراً

کانپ کر پائے مبارک پہ جھکا سر افگن　　سر اٹھا کر کیا سرور نے یہ بھائی سے سخن
گو سرِ حُر پہ ہے خالق کے کرم کا سایہ
آن کر تم بھی کرو اِس پہ علم کا سایہ

انیس

استغاثہ یہ کیا حُر نے جو با دیدۂ نم　　جوش میں آگیا اللہ کا دریائے کرم
خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلا کے شہنشاہِ اُمم　　حُر کو یہ ہاتفِ غیبی نے صدا دی اُس دم
شکر کر سبطِ رسول الثقلین آتے ہیں
اے برادر تیرے لینے کو حسینؑ آتے ہیں

حُر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیرؑ　　دوڑ کر چوم لئے پائے شہِ عرش سریر
شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا اے باتوقیر　　میں نے بخشی مرے اللہ نے بخشی تقصیر
ہیں رضا مند ہوں کس واسطے مضطر ہے تو
مجھ کو عباسؑ دلاور کے برابر ہے تو

دبیر

حُر نے فرزندِ پیمبرؐ سے یہ اُس وقت کہا　　سایۂ دامنِ رایت تو ہے ظلِ طوبیٰ
آپ کی بندہ نوازی پہ فدا اے آقا　　رُخ کیا جب سے ادھر کانپ کہ الطافِ خدا
مرحبا فاطمۂ زہرؑا مجھے فرماتی ہیں
سایۂ چادر کا مرے سر پہ کیے آتی ہیں

انیس

حُر پکارا "بابی انت و امی" یا شاہ　　قابلِ عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ

مجھ سے گمراہ کو اک آن میں مل جائے پہ راہ   سب ہے صدقہ انھیں قدموں کا خدا ہو آگاہ
مہر ذرّہ پہ جو ہو، نیّرِ تاباں ہو جائے
آپ جس مور کو چاہیں وہ سلیماں ہو جائے

دبیر

عرض کی پھر شہِ والا سے بجوشِ رقّت   کرتے ہیں دشمنِ دیں جنگ پہ اس دم سبقت
عفوِ تقصیر ہوئی اب ہو عنایت رخصت   دیکھنے کی نہیں حیدر سے میں ذرا اب طاقت
گر رضا پائے تو سر اپنا کٹائے فدوی
زخمِ شمشیر و سناں سینہ پہ کھائے فدوی

انیس

لائے اس عزت و حرمت سے جو مہماں کو امامؑ   بولے عباسؑ کمر کھول اب اے نیک انجام
شہ نے فرمایا مناسب ہے کوئی دم آرام   عرض کی حُر نے کمر خلد میں کھولیگا غلام
فاتحہ پڑھ کے یہ شمشیر و سپر باندھی ہے
آج اس عزم پہ خادم نے کمر باندھی ہے
ہے بہت شمر و عمر سے مجھے لڑنے کی امنگ   ایک ہی وار میں دونوں کو کروںگا چورنگ
لشکرِ شام سے پیہم چلے آتے ہیں خدنگ   شاہزادوں کی سپر ہوں کہ عبادت ہو یہ جنگ
کہیں ایسا نہ ہو بچّہ کوئی بے جان ہو جائے
پہلے یہ تازہ غلام آپ پہ قربان ہو جائے

دبیر

پسرِ حُر کے معرّف علی اکبرؑ تھے کہ واہ   حُر کو دیتے تھے صدا انشاء اللہ سبحان اللہ

دونوں تسلیم کناں صرف وفا تھے دو بجاہ　　مژدۂ گلشن جنت انھیں پہونچا ناگاہ

دونوں ایک مرتبہ بیزار ہوئے جینے سے

نیزۂ ظلم و ستم پار ہوئے سینے سے

انیس

بڑھ کے فرماتے تھے عباسؑ ہے عزت جاہ　　بارک اللہ کی دیتا تھا صدا دلبر شاہ

کہتے تھے ابن حسن واہ غمخوار غازی واہ　　شاہ ہر ضرب پہ فرماتے تھے سبحان اللہ

اپنی جاں بازی کا غازی جو صلہ پاتا تھا

مسکراتا ہوا تسلیم کو جھک جاتا تھا

دبیر

اس گھڑی فاطمہؑ کے لال سے حر نے یہ کہا　　آپ کے صدقے سے یہ رتبہ ہوا خادم کا

شیر حق میرے سرہانے ہیں کھڑے اے مولا　　جام کوثر لئے کہتے ہیں بصد لطف و عطا

لے اسے پی کہ بہت تشنہ دہن ہے اے حر

جلد آ دیکھ یہ جنت کا چمن ہے اے حر

اُن سے میں عرض یہ کرتا ہوں کہ اے شاہ زماں　　پسر فاطمہؑ پیاسا ہے مجھے پیاس کہاں

صبح سے جھولے میں بیہوش ہے اصغرؑ ناداں　　تشنہ لب ہے کئی دن سے علی اکبرؑ سا جواں

پیاسا ہوں اس پہ بھی پانی نہ پیونگا مولا

جام کوثر نہ بن آقا کے پیوں گا مولا

انیس

نیم وا چشم سے حر نے رخ مولا دیکھا　　زیر سر زانوئے شبیرؑ کا تکیا دیکھا

مسکرا کر طرفِ عالمِ بالا دیکھا — شہ نے فرمایا کہ اے حُرِ جری کیا دیکھا
عرش کی حسنِ رُخ حور نظر آتا ہے
فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے
مجھکو لینے چلے آتے ہیں فرشتے یا شاہ — ملک الموت بھی کرتا ہے محبت کی نگاہ
خلد سے شیرِ خدا نکلے ہیں اللہ اللہ — لو برآمد ہوئے شبّر بھی پدر کے ہمراہ
ننگے سر احمدِ مختار کی پیاری آئی ہے
دیکھئے آپ کے نانا کی سواری آئی ہے

دبیر

مڑ کے عباسؑ دلاور کو پکارے سرور — روک لو تم کہ سکینہ چلی آتی ہے ادھر
گئے عباس ادھر یاں ہوا برپا محشر — حُر بھی فرزند بھی حُر کا ہوا گویا رو کر
غش پہ غش تشنہ دہانی کے سبب آتے ہیں
الفراق اب چمنِ خلد کو ہم جاتے ہیں

انیس

قبلہ رو کیجئے لاشہ مرا اے قبلۂ دیں — پڑھیے یٰسین کہ اب ہے یہ دمِ بازپسیں
کوچ نزدیک ہے اے بادشہِ عرش نشیں — لیجئے تن سے نکلتی ہے مری جانِ حزیں
بات بھی اب تو زباں سے نہیں کی جاتی ہے
کچھ اڑھا دیجئے مولا مجھے نیند آتی ہے
کہہ کے یہ گود میں شبیر کے لی انگڑائی — آیا ماتھے پہ عرق چہرہ پہ زردی چھائی
شہ نے فرمایا ہمیں چھوڑ چلے کیوں بھائی — چل بسے حُرِ جری پھر نہ کچھ آواز آئی

طائرِ رُوح نے پرواز کی طوبیٰ کی طرف
پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہِ والا کی طرف

میر انیس کے اشعار میں بلاغت کی جو باریکیاں اور دقائق ہیں اُن سے ہم اس موقع پر بحث نہیں کرتے۔ یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ حُسنِ بندش سے کلام میں کس قدر صفائی۔ برجستگی اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔

قیدخانہ کے واقعات | قیدخانہ کا حال، اور ہند کے آنے کا واقعہ دونوں نے لکھا ہے، اور ایک بحر میں لکھا ہے، میر انیس کا مطلع ہے،

مصرع جب قیدیوں کو خانۂ زنداں میں شب ہوئی

اور مرزا صاحب کا مطلع ہے۔

مصرع جب قیدیوں کو راہ میں ماہِ صفر ہوا۔

میر انیس نے تفصیلی حالات نہایت مؤثر پیرایہ میں لکھے ہیں، مرزا صاحب کے ہاں صرف ۳۶ بند ہیں۔ لیکن بعض مضامین مشترک ہیں۔ وہ ملاحظہ ہوں ؎

دبیر

راوی نے حالِ خانۂ زنداں ہے یوں لکھا | وحشت میں مثلِ قبر اور آفت میں کربلا
آئی جو شب اسیروں کو صدمہ بڑا ہوا | نہ فرش تھا نہ سایہ تھا۔ نہ پانی نہ غذا
شمعوں کی روشنی نہ چراغوں کی روشنی
بس ماتمِ حسینؑ کے داغوں کی روشنی

انیس

کیجے شکستگی خرابہ کا کیا بیان ثابت نہ جس میں سقف نہ در اور نہ سائباں
وحشت کا گھر ہراس کی جا خوف کا مکاں وہ شب کہ الحذر وہ اندھیرا کہ الاماں
ظلمت سرائے گور تھی۔ زنداں کا گھر نہ تھا
حجرے یہ تنگ تھے کہ ہوا کا گذر نہ تھا

دبیر

ناگاہ مشعلوں کی ہوئی روشنی نمود اور غل ہوا کہ ہند کا زنداں میں ہے ورود
زینبؑ کے دل پہ صدمہ سمجھو کہ ہوا فزود غربت سے کانپنے لگی وہ خاصۂ ودود
سر زانوؤں کے بیچ میں شرما کے دھر لیا
اور بیڑیوں کو خاک میں پوشیدہ کر لیا
بچوں سے پھر یہ بولی وہ آفت کی مبتلا اب نام لیجیو نہ مرا تم پہ میں فدا
ناگاہ آئی قیدیوں میں ہند با وفا زنجیر پہنے دیکھ کے عابدؑ کو دی ندا
بیداد اہل ظلم سے یارب دہائی ہے
اس ناتواں کو آہ یہ بیڑی پنھائی ہے

انیس

نکلی محل سرا سے یہ کہکر وہ خوش سیر تھیں ساتھ ساتھ چند خواصیں بھی نوحہ گر
پہونچی جناب حضرت زینبؑ کو یہ خبر رنگ اڑ گیا یہ کہنے لگی سر کو پیٹ کر
اپنا نہیں خیال، بزرگوں کا پاس ہے
ہے ہے، کہاں چھپوں، وہ مری روشناس ہے

ہے شرم کی جگہ کہ میں ہوں خواہرِ امامؑ غمگین و سوگوار و پریشان و تشنہ کام
ہم ہیں فقیر ہم ہیں امیروں کا کیا ہے کام لوگو بتا نہ دیجو کہیں اس کو میرا نام
پوچھے جو وہ کسی سے کہ زینبؑ کدھر گئی
کہہ دیجیو کہ بھائی کے ہمراہ مر گئی

دبیر

زینبؑ کو بھی سکوت کا یارا نہ پھر رہا بولے نہ ان سے پوچھ یہ زینبؑ کا ماجرا
کیا جانیے کہ بعد حسینؑ اس پہ کیا ہوا قدموں پہ ہند گر پڑی پہچان کر صدا
رو کر کہا قسم مجھے ربِّ قدیر کی
زینبؑ تمھیں ہو بیٹی جناب امیرؑ کی

انیس

یہ سن کے ہند رونے لگی تب بہ اشک و آہ پھر مڑ کے روئے حضرت زینبؑ پہ کی نگاہ
منہ سے ہٹائے بال تو حالت ہوئی تباہ بیساختہ کہا کہ زہے قدرتِ الٰہ
ہرگز غلط نہیں جو مجھے اشتباہ ہے
زینبؑ تمھیں ہو خالق اکبرؑ گواہ ہے

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ میں عموماً میر انیس کی ترجیح ثابت ہوگی، لیکن ہر کلیہ میں مستثنیٰ ہوتا ہے، بعض موقعوں پر مرزا دبیر صاحب نے جس بلاغت سے مضمون کو ادا کیا ہے میر انیس سے نہیں ہو سکا، چنانچہ ذیل کی مثال سے اِس کی تصدیق ہوگی۔

حضرت علی اصغرؑ کے لیے پانی مانگنا | واقعاتِ کربلا میں یہ واقعہ نہایت

دردانگیز ہے کہ تمام اعزہ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسین علیہ السّلام اپنے شش ماہہ بچّے (علی اصغرؑ) کو دشمنوں کے سامنے لے جاکر اس بات کے ملتجی ہوئے کہ یہ بچّہ پیاس سے مرتا ہے، اس کے گلے میں پانی کی ایک بوند ٹپکا دو، اس واقعہ کو میر ضمیر سے لے کر آج تک نئے نئے موثر پیرایوں میں ادا کیا جاتا ہے۔ مرزا دبیر صاحب نے مختلف مرثیوں میں یہ واقعہ لکھا ہے، اور ہر جگہ نیا پہلو اختیار کیا ہے۔ ایک مرثیہ میں جو سب سے بہتر ہے فرماتے ہیں ؎

بولے دکھا کے بچّے کو شاہِ فلک سریر ۔۔۔ مرتا ہے پیاس سے یہ مرا کودکِ صغیر
پانی ملا ہے کل سے نہ ممکن ہوا ہے شیر ۔۔۔ اللہ اس غریب پہ کر رحم اے امیر

مہماں ہے کوئی آن کا ہونٹوں پہ جان ہے
اس کا قصور کیا ہے کہ یہ بے زبان ہے

برپا ہے اہلِ بیتِ محمدؐ میں شور و شین ۔۔۔ در پر پھوپھی بلکتی ہے ماں کر رہی ہے بین
آنکھیں پھرائے دیتا ہے اب تو یہ نورِ عین ۔۔۔ لایا ہے اس عطش میں ترے پاس اب حسینؑ

تجھکو قسم ہے روحِ رسالت مآبؐ کی
ٹپکا دے اس کے حلق میں اک بوند آب کی

لیکن میر انیس صاحب نے اس واقعہ کے بیان میں جو بلاغت صرف کی ہے اور جو دردانگیز سماں دکھایا ہے کسی سے آج تک نہ ہو سکا، فرماتے ہیں ؎

انیس

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفیٰؐ　　لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہوں گا کیا
نا مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو نہ التجا　　منت بھی گر کروں گا تو کیا دیں گے وہ بے حیا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہونچے قریبِ فوج تو گھبرا کے رہ گئے　　چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے　　چادر پسر کے چہرہ سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغرؑ تمھارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

گر میں بقولِ عمر و شمر ہوں گناہگار　　یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصوروار
ششماہہ بے زباں نبی زادہ شیر خوار　　ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بیقرار
سن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

یہ کون بے زباں ہے تمھیں کچھ خیال ہے　　دُرِّ نجف ہے بانوئے بیکس کا لال ہے
لو مان لو تمھیں قسمِ ذوالجلال ہے　　یثرب کے شاہزادے کا پہلا سوال ہے
پوتا علیؑ کا تم سے طلبگارِ آب ہے
دیدو کہ اس میں ناموری ہے ثواب ہے

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر　　رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر　　سوکھی زباں تم بھی دکھا دو نکال کر

پھیری زباں لبوں پہ جو اس نورِ عین نے ؎
ٹھہرا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

اسلوبِ بیان کی بلاغت کو دیکھو، امام علیہ السّلام اصغرؑ کو لے کر پانی مانگنے کو نکلے تو سہی لیکن غیرت کے اقتضا سے ہر قدم پر ٹھہر جاتے ہیں کہ سوال کیونکر کروں، اور کروں بھی تو نتیجہ کیا ہوگا، پھر فوج کے قریب پہونچ کر سوال کرتے ہوئے شرمانا، ٹھہرا کے رہ جانا، اور سب سے بڑھ کر بچّے کے چہرہ سے چادر سرکا کے رہ جانا، کس قدر قیامت انگیز سماں ہے، پھر سوال بھی کرتے ہیں تو علی اصغرؑ پر رکھ کر۔

ع اصغرؑ تمھارے پاس غرض لے کے آئے ہیں،

واجب الرحم ہونے کی وجہیں کس قدر لاجواب ہیں، اور سب ایک ہی مصرع میں ادا ہوگئی ہیں، یعنی شش ماہہ ہے، بے زبان ہے، نبی زادہ ہے، شیر خوار ہے، ان سب پر قیامت یہ کہ جب سب کچھ کہہ چکے تو بچّہ کی زبانِ حال سے بھی کہلوایا اور بچّہ نے کہہ بھی دیا، کیونکہ بچّہ پیاس کی شدّت سے لبوں پہ زبان پھیرا کرتا تھا، اب بھی اس نے ایسا ہی کیا تو یہ زبانِ حال سے کہنا تھا۔

متحد المضمون اشعار | اس قسم کے اشعار بعض تو بالکل ہم مضمون ہیں بعض اس قسم کے ہیں کہ ایک نہ ایک خیال کو ادا کیا تھا، دوسرے نے اس کو ترقی دینا چاہا۔ بعض ایسے ہیں کہ صرف اصلی واقعہ مشترک ہے اور دونوں کی طرزِ ادا الگ ہے، چنانچہ ہم ہر قسم کی متعدد مثالیں نقل کرتے

ہیں ؎

دبیر

شل تنورِ گرم تھا پانی میں ہر حباب — ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب

انیس

پانی تھا آگ گرمیٔ روزِ حساب تھی — ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

یہ مضمون دونوں کے ہاں مشترک ہے کہ گرمی کی شدت یہ تھی کہ موج سیخ بن گئی تھی اور جب کوئی جانور اس کے پاس جاتا تھا تو جل کر کباب ہو جاتا تھا، بندش اور الفاظ کی نشست میں جو فرق ہے وہ خود ظاہر ہے، لیکن معنوی حیثیت سے بھی میر انیس کا شعر بڑھا ہوا ہے۔

میر انیس صاحب کے ہاں گرمی کا مبالغہ جو شعر کی جان ہے زیادہ پایا جاتا ہے، یعنی یہ کہ مچھلی سیخ موج تک آنے کے ساتھ فوراً کباب ہو جاتی تھی، مرزا صاحب کے ہاں یہ بات نہیں پائی جاتی، وہ کہتے ہیں کہ موج کی سیخ پر مرغابیوں کا کباب لگایا جاتا تھا، اس سے فوراً کباب ہو جانے کا خیال نہیں پیدا ہوتا ؎

دبیر

چاہوں تو بیٹھے بیٹھے اک انگلی سے زمیں پہ — گردوں کی ڈھال چیر کے رکھ دوں زمین پہ

انیس

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی — رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

مرزا صاحب کے شعر کا پہلا مصرع نہایت بدترکیب ہے، اس کے

علاوہ ایک انگلی سے چیرنا نہیں ہوتا بلکہ کھونچا دینا ہوتا ہے۔ ڈھال کی تشبیہ آفتاب سے بہ نسبت آسمان کے زیادہ موزوں ہے ؎

دبیر

دہشت سے جواں بھاگ گئے تھے تبر کی مانند۔ تھا پیروں کو رعشہ قدم پیر کی مانند

انیس۔ چلنے میں نیزے کانپتے تھے مثل پائے پیر۔

میر صاحب کا مصرع زیادہ فصیح اور صاف ہے۔ ان الفاظ سے کانپتے تھے'' جو تصویر خیال میں کھنچ جاتی ہے وہ رعشہ کے لفظ سے پیدا نہیں ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک چلنے کی قید نہ مذکور ہو، پوری تشبیہ نہیں ہوتی کیونکہ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی کی حالت میں کانپتے ہیں، اس کے ساتھ چونکہ چلنے کا اطلاق پاؤں اور نیزہ دونوں پر ہوتا ہے اس لئے یہ لفظ اس موقع پر نہایت موزوں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نیزہ چلانے کی حالت میں نیزہ کو لچک ہوتی ہے اس لئے اس کو کانپنے سے تعبیر کر سکتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کہنا کہ نیزہ چلنے کی حالت میں خوف سے کانپتا تھا نہایت لطیف حسن التعلیل ہے، بخلاف اس کے مرزا صاحب نے چونکہ نیزہ کی جنبش اور حرکت کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے رعشہ کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔

دبیر۔ ع چلائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں۔

انیس۔ ع ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش۔

جلاجل کے دونوں حصے جو بجانے میں مل جاتے ہیں، اس کی تعبیر دونوں

بزرگوں نے دو طرح پر کی ہے، مرزا صاحب کہتے ہیں کہ جلاجل چلّا کر الامان کہتا تھا اور ہاتھ ملتا تھا لیکن چلانے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے گو تشبیہ صحیح ہے لیکن ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی میر صاحب کہتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کا رعب اس قدر غالب ہوا کہ جلاجل ہات جوڑ کے چپ ہو گیا، رعب اور خوف کی حالت میں ہاتھ جوڑنا اکثر ہوتا ہے اور چونکہ جلاجل کے دونوں حصّے مل جاتے ہیں تو پھر جب تک جدا نہ ہوں آواز نہیں دے سکتے، اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ وہ ہاتھ جوڑ کر چپ ہو گیا ہے ۵

دبیر

یوں جسم رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں   جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحبِ مکاں

انیس

یوں روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے   جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

اصل مضمون یہ ہے کہ روحیں جسم سے اس طرح بھاگ گئیں جس طرح بھونچال میں کوئی گھر چھوڑ کے بھاگ جاتا ہے، لیکن بندش کی صفائی اور برجستگی نے میر انیس صاحب کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے، اس کے علاوہ، صاحب مکان کی تخصیص بالکل بیکار ہے، زلزلہ جب آتا ہے تو صاحب مکان کی کوئی تخصیص نہیں، ہر شخص مکان چھوڑ کے بھاگ جاتا ہے، جسم رعشہ دار کی ترکیب نامانوس ہے اور اس قید سے یہ مفہوم ہوتا ہے، کہ صرف اُن لوگوں کی روحیں نکلیں جن کے جسم رعشہ دار

تھے۔ میر صاحب کا پہلا مصرع بھی کچھ اچھا نہیں، سر کا لفظ بالکل حشو
بلکہ موقع کے لحاظ سے غلط ہے، روح سر میں نہیں رہتی اور نہ سر سے اسکو
کوئی خصوصیت ہے ؎

دبیر

وہ رخش پہ یا دیو تھا اسوار پری پر — غل رن میں اٹھا کوہ چڑھا کبک دری پر

کس قدر بیہودہ تشبیہ ہے، دشمن کو کوہ اور گھوڑے کو کبک دری کہنا
مضائقہ نہیں لیکن کوہ کا کبک دری پر چڑھنا کس قدر مہمل ہے، میر انیس
صاحب نے بھی یہی مضمون یعنی دشمن کا گھوڑے پر سوار ہونا متعدد
موقعوں پر باندھا ہے اور کس خوبی سے باندھا ہے۔

ع گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا
ع گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا۔

دبیر

رن میں جو گھرا ابر غلیظ اہل سقر کا — بجلی سا کڑکنے لگا کڑکیت عمر کا

ایضاً

گرد عباسؑ کے کثرت تھی ستمگاروں کی — مینھ تو تیروں کا تھا اور برق تھی تلواروں کی

پہلے شعر کا یہ مطلب ہے کہ دشمن جو اہل سقر تھے ان کے صفوں
کا دل ابر غلیظ تھا، اور اس ابر میں کڑکیت کا کڑکنا بجلی کا کام دیتا تھا،
دوسرے شعر کا مطلب ظاہر ہے، اسی مضمون کو میر انیس صاحب
نے باندھا ہے ؎

اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے ستمگاروں کی   برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی

مرزا صاحب کا پہلا شعر تو بالکل بھدا اور بد ترکیب ہے، دوسرا ذرا صاف ہے، لیکن میر انیس صاحب کے شعر سے اس کو بھی کچھ نسبت نہیں ہے۔ صفائی اور برجستگی کے علاوہ "چمکنے لگی" کے جملہ فعلیہ نے جو حالت پیدا کی وہ "برق" تھی سے کہاں پیدا ہو سکتی ہے سے

انیس

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے   اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

دبیر

دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے   انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے

انصاف سے دیکھو مرزا صاحب نے میر صاحب ہی کے لفظوں کو الٹ پلٹ کیا ہے، لیکن کس بری طرح سے کہ محض لفظی گورکھ دھندا رہ گیا ہے۔

دبیر   کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں

انیس   سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں

دونوں مصرعوں کی شستگی، برجستگی اور صفائی میں جو فرق ہے، وہ ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے سے

دبیر

کس آب و تاب سے یہ سر فوج پڑ گئی   پانی کا گھونٹ بن کے گلے سے اتر گئی

انیس

سب نشۂ غرور جوانی اتر گیا   تلوار تھی کہ حلق سے پانی اتر گیا

اِن دونوں شعروں کا فرق بھی ظاہر ہے۔

دبیر

یوں متصل رسن سے بندھے تھے وہ دلفگار   رشتہ میں جیسے دانۂ تسبیح آب دار

اہلِ حرم جو ایک ہی رسّی میں قید کئے گئے ان کو تسبیح کے دانہ اور رشتۂ تسبیح سے تشبیہ دی ہے اور یہ تشبیہ بجائے خود بری نہیں۔ لیکن میر صاحب کی تشبیہ دیکھو ؎

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن   جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گلہائے چمن

تشبیہ کی لطافت اور نزاکت کے علاوہ، اصل تشبیہ میں کس قدر فرق ہے تسبیح کے دانے رشتہ میں بندھے نہیں ہوتے بلکہ پروئے ہوتے ہیں، بخلاف اس کے گلدستہ میں پھول رشتہ سے بندھے ہوتے ہیں، بندش کی صفائی کا جو فرق ہے وہ ظاہر ہے، اس کے علاوہ مرزا صاحب کے ہاں آبدار کا لفظ محض فضول اور بیکار ہے ؎

دبیر

بیجرم معرکہ میں وہ خارا شگاف تھی   لشکر کا خوں کیا تھا مگر پاک صاف تھی

مرزا صاحب نے اس مضمون کو نہایت خوبی اور صفائی سے ادا کیا ہے میر انیس صاحب نے اس مضمون کو کئی کئی طرح سے پلٹا، لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ بات نصیب نہ ہوئی، میر صاحب کہتے ہیں ع

انیس   اب سب کے بعد بیٹے کو جو دیکھا تو صاف تھا،

ایضاً   جو چاہے دیکھ لے مرا دامن پاک صاف ہے ؎

انیس

دم میں نہ وہ غرور نہ وہ خود سری رہی — مجرم وہی رہا یہ خطا سے بری رہی

مرزا دبیر

رو کش خدا کی فوج سے چھوٹے بڑے ہوئے — سجّادہ سے امام زمن اٹھ کھڑے ہوئے

میر انیس

طیار جان دینے پہ چھوٹے بڑے ہوئے — تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے

دبیر

روشن پدر کا زور ہے دنیا و دین پر — ششدر تھے جبرئیل کٹے جب کہ تین پر

انیس

خیبر میں کیا گزر گئی روح الامین پر — کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر

دبیر ع بندھتی تھی اور کھلتی تھی مٹھی حباب کی

انیس ع کھلتی تھیں اور جھپکتی تھیں آنکھیں حباب کی

تمام شد

UNIVERSITY LIBRARY
MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH